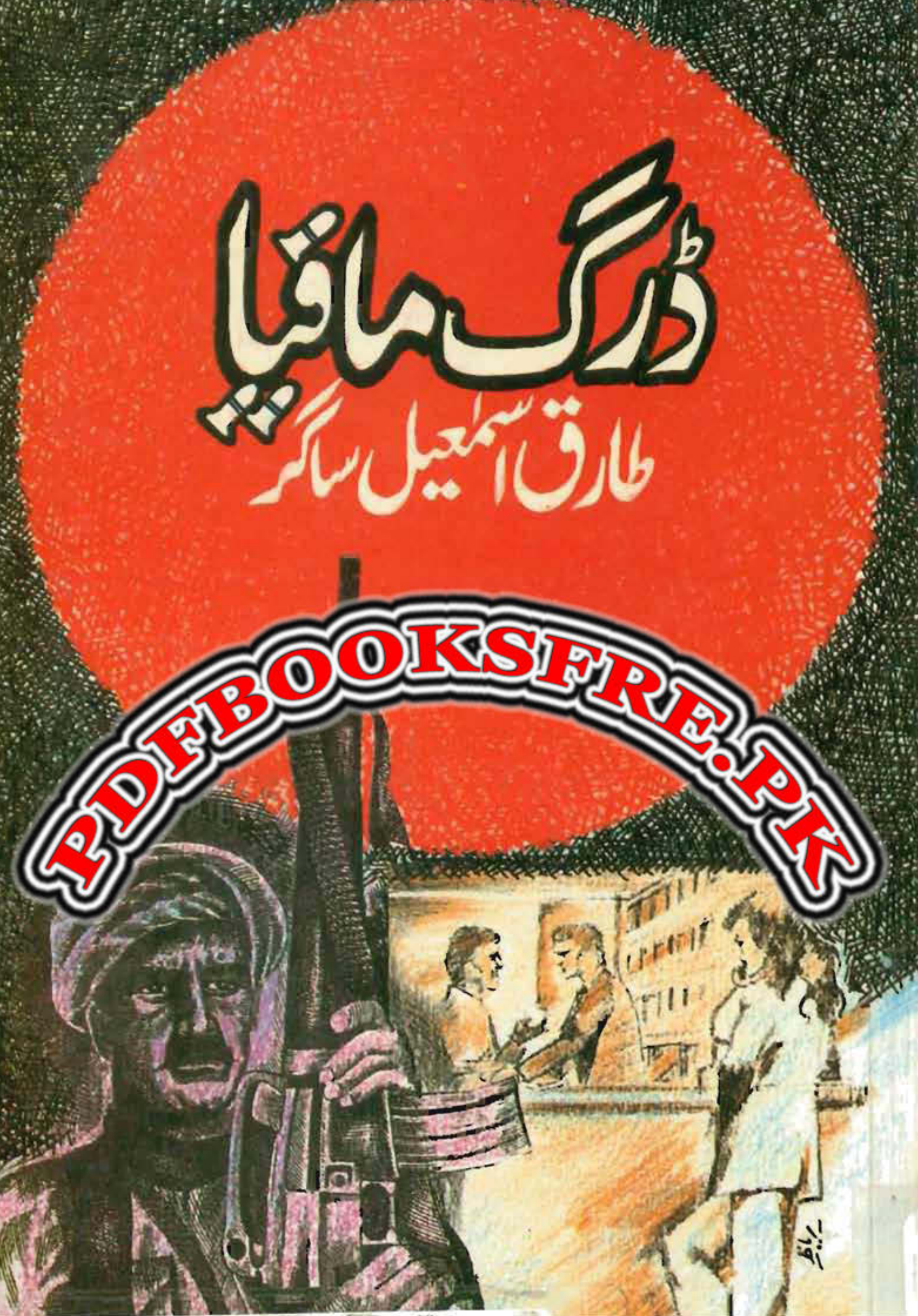
ڈرگ مافیا
طارق اسمٰعیل ساگر
PDFBOOKSFRE.PK

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈرگ مافیا

طارق اسمٰعیل ساگر

جہانگیر بک ڈپو اردو بازار لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تبادلہ

اچانک اے ایس پی کی موجودگی نے ان سب کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ تاکہ انہوں نے معمول کے مطابق ہی لگایا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہُوا تھا کہ کوئی سینئر آفیسر رات کے اس پہر میں اُن کے سرہانے آن کھڑا ہو۔ وہ تو خیریت گزری کہ حوالدار محمد دین نے دُور ہی سے اے ایس پی صاحب کی جیپ پہچان لی اور اپنی جیپ کی اگلی سیٹ پر ٹانگیں پسار کر خراٹے لیتے انسپکٹر عنایت شاہ کو قریباً جھنجھوڑ کر گہری نیند سے بیدار کر دیا۔

"کیا ہُوا ــــ کیا بات ہے ــــ"

انسپکٹر عنایت شاہ نے نیند اور غصے سے بھری آنکھوں سے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"سر اے ایس پی صاحب ــــ"

حوالدار کے اوسان بحال تھے۔

اس کے منہ سے اے ایس پی کے الفاظ بجلی کے کرنٹ کی طرح انسپکٹر عنایت شاہ کے جسم میں سرایت کر گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھٹکے سے اپنی جیپ سے باہر کھڑا تھا۔

ابھی بمشکل اس کے قدم زمین پر جمے اور اوسان بحال ہوئے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب اچانک بلائے ناگہانی کی طرح اس کے نزدیک جیپ رُکنے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے نوجوان اے ایس پی اس کے سرہانے موجود تھا۔

عنایت شاہ نے اپنا کئی من بوجھل پاؤں زمین سے ذرا اونچا کیا اور کھٹاک سے سلیوٹ مارا۔ اس کا پاؤں زمین پر اتنی زور سے لگا تھا کہ پاؤں کی دھمک نے اُس کی کھوپڑی کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

"تمہاری ٹوپی کہاں ہے؟"

اے ایس پی نے اس کی طرف دیکھ کر بظاہر مُسکراتے ہوئے کہا۔

"سر! سر!....."

عنایت شاہ کا ہاتھ اپنے سر پر گیا تو اُسے احساس ہوا کہ ٹوپی تو جیپ میں ہی کہیں گم گئی ہے۔

"سوری سر!"

اس کے منہ سے بمشکل دو الفاظ نکلے اور اس نے اندھوں کی طرح جیپ کی سیٹیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ خیریت گزری کہ ٹوپی جلد ہی مل گئی۔

"عنایت شاہ! ہوشیاری سے ڈیوٹی کیا کرو ـــــ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ معاملہ بہت سیریس ہے اور تم یہاں سو رہے ہو ـــــ"

اے ایس پی صاحب کی آواز نشتر کی طرح اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔

خدا جانے عنایت شاہ کے بزرگوں سے کون سا ایسا گناہ سرزد ہوا تھا جو یہ اے ایس پی اس پر مسلط ہو گیا تھا۔ اسے یہاں آئے بمشکل دو ماہ ہوئے تھے۔

لیکن ـــــ

ان دو مہینوں میں اُس نے عملاً عنایت شاہ اور اس کے سٹاف کے ناکوں چنے چبا کر رکھ دیئے تھے۔ عنایت شاہ پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہوا تھا اور ترقی کرتا انسپکٹر کے عہدے تک پہنچا تھا۔ اس نے روایتی تھانیداروں کی طرح زندگی گزاری تھی۔

پولیس سروس کا مطلب اس کے نزدیک سوائے رُعب جمانے اور پیسے کمانے کے کبھی کچھ نہیں رہا تھا۔ گزشتہ بیس سال سے وہ اسی تحصیل کے مختلف تھانوں میں فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس دوران اُسے یہاں کے بدمعاشوں رسّہ گیروں، چوروں اور دیگر جرائم پیشہ افراد کے نام و نسب حفظ ہو گئے تھے۔

اس نے ساری زندگی اطمینان سے اپنا حصہ وصول کیا اور ایک تھانے سے جب جی بھر جاتا تو دوسرے تھانے کا رُخ کرتا۔ افسران کو خوش رکھنے کا فن اُسے آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی "اے سی آر" کبھی غلط نہیں ہوئی۔

اس پر متعدد مرتبہ رشوت لینے کے الزام لگائے گئے۔

لیکن ـــــ

کبھی کوئی الزام ثابت نہیں ہوا۔

پولیس لائن میں اگر چند دنوں کے لیے کبھی اس کا تبادلہ ہوا تو بھی سمجھا جاتا تھا کہ شاہ صاحب چند روز آرام کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔

اس کی زندگی میں کئی نوجوان آفیسر آئے اور چند دن اپنی جولانیاں دکھانے کے بعد بالآخر پولیس کے روایتی سانچے میں ڈھل کر چلے گئے۔

لیکن ـــــ

خدا جانے یہ اے ایس پی کس مٹی کا بنا تھا۔

جس روز سے آیا اس نے عنایت شاہ کو کبھی چین کی نیند نہ سونے دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج فلاں جگہ ریڈ کرنی ہے۔

آج فلاں جگہ ناکہ لگانا ہے۔

اچانک آدھی رات کو ملازمین کو نیند سے جگا کر خصوصی چھاپہ مارنے کے لیے اپنے ساتھ لے جانا تو اُس کا معمول تھا۔

عنایت شاہ نے اس علاقے میں ۲۰ سال جھک ماری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں کس نوعیت کے جرائم ہوتے ہیں۔ چوری چکاری، رسہ گیری خصوصاً جانوروں کی چوریاں یا پھر ڈاکے وغیرہ۔ قتل کی وارداتیں تو یہاں کی روایت بنتی جا رہی تھیں۔

لیکن ——

اُس روز جب اچانک اے ایس پی باجوہ نے اُسے اپنے کمرے میں طلب کر کے یہ بتایا کہ اس علاقے میں منشیات کا دھندہ سرِعام ہو رہا ہے۔ اور خصوصاً اُن کے تھانے کی حدود سے بین الاقوامی شہرت کے سمگلر مال لے کر جا رہے ہیں تو عنایت شاہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"سر! میں گزشتہ بیس برس سے ......"

اُس نے حسبِ عادت گفتگو کی تمہید باندھی۔

"عنایت شاہ تم نے گزشتہ بیس برس جھک مار کر گزارے ہیں —— تمہیں کچھ علم نہیں —— اور ہاں یہ مجھے بات بات میں اپنی گزشتہ نوکری کا حوالہ نہ دیا کرو۔ کچھ کر کے بھی دکھاؤ۔"

عنایت شاہ اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا کہ اب اس کا اختیار یہاں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ آج تک کسی معاملے میں بھی وہ اے ایس پی کے سامنے سچا ثابت نہیں ہوا تھا۔

"او۔ کے سر!"

اس نے بددلی سے کہا اور ایڑیاں بجا کر واپس لوٹ گیا۔

حال ہی میں تھانے کو ملنے والی جیپ جس میں وائرلیس سسٹم موجود تھا، میں اپنے چار ماتحتوں کے ساتھ سوار ہو کر وہ خصوصی ناکہ لگانے کے لیے سرِشام ہی وہاں پہنچ گیا تھا جس خاص مقام کی نشاندہی اے ایس پی صاحب نے کی تھی۔

اُسے آج تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کمبخت اے ایس پی کا ذریعہ اطلاعات کیا ہے؟

خدا جانے اُسے کون سا مخبر میسر آگیا تھا جو اسے اتنی اہم اور صحیح معلومات پہنچایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو عنایت شاہ کو بھی شک گزرتا کہ ضرور جرائم پیشہ گروہ میں اس کا "سورس" موجود ہے جو مجرموں کی آڑ میں دراصل "ڈائرکٹ" بنا اس کے لیے کام کر رہا ہے ——!

اے ایس پی صاحب کچھ دیر وہاں ٹھہر کر واپس لوٹ گئے ——!

ان کی روانگی کے بمشکل دس منٹ بعد ہی ایک سفید رنگ کی کار انسپکٹر عنایت شاہ کو اس طرف آتی دکھائی دی۔

اے ایس پی صاحب نے بتایا تھا کہ مشتبہ کار کا رنگ سفید ہے۔ عنایت شاہ کی تو باچھیں کھل گئیں۔

"وہ مارا ——"

اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ مسکراہٹ خود بخود اس کے ہونٹوں سے چھلک گئی۔ اس کے جوانوں نے زمین پر گڑی رسی کو اس کے حکم پر تان کر سیدھا کر دیا تھا اور ایک سپاہی رسی کے بالکل سامنے سڑک کے بیچوں بیچ سرخ رنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی لالٹین لہرانے لگا۔

کار کے بریک بڑے زور سے چرچرائے جیسے ڈرائیور کو اچانک گاڑی روکنا پڑی ہو۔

گاڑی رُکتے رُکتے رسّی سے ٹکرا گئی تھی۔

عنایت شاہ پستول اور اس کے ساتھی بندوقیں تانے کار کی طرف بڑھے جس کی پچھلی سیٹ پر ایک مرد اور عورت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ کار چلانے والا شاید اُن کا ڈرائیور تھا۔

"باہر نکلو ——— سب باہر نکلو ———"

اُس نے کار سواروں کو پستول لہراتے ہوئے حکم دیا۔

"کیا بات ہے ——— کون ہو تم لوگ ———"

کار سے باہر نکلنے والا بڑے غصّے میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کے کپڑے اور حلیہ اس کی امارت کی چغلی کھا رہا تھا۔

"کہیں لے ایس پی صاحب نے مروا تو نہیں دیا۔"

عنایت شاہ نے دل ہی دل میں سوچا پھر مطمئن ہو کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ آج تک لے ایس پی کی کوئی اطلاع غلط ثابت نہیں ہوئی تھی۔

"ابھی تمہیں ساری بات سمجھاتا ہوں ——— دکھائی نہیں دے رہا ہم پولیس والے ہیں ———"

عنایت شاہ نے ابھی تک احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

"مجھے تو تم پولیس کی وردی میں ڈاکو دکھائی دے رہے ہو ——— کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں تم سب کی وردیاں اتروا دوں گا ——— مجھے جانتے نہیں ....."

ہوش کر اوئے باؤ۔ دماغ ٹھنڈا رکھ ورنہ ابھی مار مار کر بھُرکس نکال دوں گا۔ تجھے افسروں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔"

حوالدار شاید اپنے انسپکٹر کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکا تھا یا پھر نمبر بنانے کے چکر میں یہ بات کہہ گیا تھا۔

"دیکھو میں تم میں ——— کسی کے منہ لگنے کو تیار نہیں ہوں۔ فوراً میری بات ایس پی سے کراؤ۔ ابھی اسی وقت۔ ورنہ یاد رکھنا صبح تک تم سب لائن حاضر ہو جاؤ گے" کار سوار کا پارہ مزید چڑھ گیا تھا۔

"تلاشی لو گاڑی کی ———"

عنایت شاہ نے ان تینوں کو پستول کی نوک پر ایک طرف کرتے ہوئے اپنے جوانوں کو حکم دیا۔

پولیس ملازمین نے پانچ منٹ کے اندر ساری گاڑی ادھیڑ کر رکھ دی۔ انہوں نے کار کے انجن سے سیٹوں تک کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی جسے ٹھونک بجا کر نہ دیکھ لیا ہو۔ عنایت شاہ نے جوشِ جذبات میں کار کی تینوں سیٹوں کو چاقو سے پھاڑ ڈالا تھا۔

لیکن ———

وہاں کچھ ہوتا تو برآمد ہوتا۔

"امید ہے تمہارا پاگل پن کا دورہ ختم ہو گیا ہوگا ——— اب مجھے فوراً اپنے ایس پی سے ملاؤ۔ ابھی وائرلیس پر بات کراؤ ورنہ..."

کار سوار کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

اس دوران عورت اور ڈرائیور اطمینان سے دوسری طرف منہ کیے کھڑے رہے۔ عنایت شاہ نے بطورِ خاص یہ بات نوٹ کی تھی کہ اس ساری کاروائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا عورت کی صحت پر ذرہ برابر اثر نہیں ہو رہا تھا جو اُس کے نزدیک بڑی انہونی سی بات کی تھی۔

عموماً پولیس کو رات کے اس پہر دیکھتے ہی شرفا کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جایا کرتے تھے یہ عجیب گھریلو عورت تھی جس پر اس ساری کارروائی کا کچھ اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ضرور دال میں کچھ کالا ہے____"

اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔

یوں بھی زندگی میں پہلی مرتبہ تو اُسے اے ایس پی صاحب کے سامنے "کارکردگی" دکھانے کا موقع ملا تھا۔

اُس نے آخر یہ ساری کارروائی اے ایس پی صاحب کے حکم پر ہی ڈالی تھی۔ اب اس کے نتائج بھی وہی بھگتیں تو بہتر ہے۔ اس نے سوچا۔

عنایت شاہ نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس علاقے میں ہیروئن کے بین الاقوامی سمگلروں کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن____

اے ایس پی صاحب تو بضد تھے____

"لو بیٹا! اب تمہیں آٹا دال کا بھاؤ معلوم پڑے گا۔"

یہ سوچتے ہوئے وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

"آپ لوگ میرے ساتھ تھانے چلیں۔ وہاں افسران سے بات ہو گی مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

عنایت شاہ اس جینٹل مین سے مخاطب ہوا۔

"اور ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں جانے کی۔ اب میں یونہی جاؤں گا بھی نہیں۔

جب تک تم لوگ یہاں سے پولیس لائن نہیں پہنچ جاتے میرے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا____"

"چلو آؤ کہاں جانا ہے"____

اس شخص کا بس نہیں چلتا تھا کہ عنایت شاہ کی بوٹیاں نوچ لے۔

"تم گاڑی تھانے لے آؤ____"

عنایت شاہ نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔

"خبردار۔ خبردار۔ اگر کسی نے اب گاڑی کو ہاتھ لگایا۔ میرا ڈرائیور گاڑی لے کر آئے گا۔ ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

کار سوار نے عنایت شاہ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اچھا____ اچھا ٹھیک ہے۔"

عنایت شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ شخص اس کے ساتھ غصے میں کوئی بدتمیزی کر دے۔

پولیس وین میں ڈرائیور کے ساتھ کار سوار آدمی اور عنایت شاہ بیٹھ گئے۔ جبکہ خاتون اپنے ڈرائیور کے ہمراہ کار میں جا بیٹھی۔

تھوڑی دیر بعد پولیس وین چل دی۔ کار اُس کے تعاقب میں چل رہی تھی۔

تھانہ یہاں سے تین چار میل دور تھا۔ اسی دوران عنایت شاہ نے صرف ایک مرتبہ اس شخص کا نام پوچھنے کی ہمت کی تھی۔

لیکن____

جواب میں پڑنے والی ڈانٹ سے گھبرا کر دم سادھ کر بیٹھ رہا۔

عین اُن لمحات میں جب پولیس کے جوان اپنے انسپکٹر صاحب کے حکم پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بوریا بستر سمیٹ کر پولیس وین میں تھانے کی طرف عازمِ سفر تھے ـــــ سڑک کنارے درختوں کے سلسلے میں پہلے سے موجود ایک نوجوان جس نے اپنی آنکھوں سے اندھیرے میں دیکھنے کی قوت رکھنے والے (نائٹ ویژن) شیشوں کی دوربین لگا رکھی تھی، نے مسکراتے ہوئے دوربین دوبارہ آنکھوں سے ہٹا کر گلے میں لٹکا لی۔

"تھینک گاڈ ـــــ"

اس کے منہ سے نکلا اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی پتلون کی بیک پاکٹ میں اڑسا ہوا چھوٹا سا "سیلولر فون" نکالا اور وہیں بیٹھے بیٹھے ایک نمبر ڈائل کر دیا۔

دوسری طرف سے "ہیلو" کی آواز سنائی دی۔ جسے شاید اس نے فوراً پہچان لیا تھا۔

"پرندے پرواز کر گئے جناب ـــــ"

اس نے صرف ایک جملہ کہا۔

"ہوں ں ں ں ..."

ایک غراہٹ سی فون پر سنائی دی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

یہ ٹیلی فون سڑک کنارے ایک نئی آبادی کے نو تعمیر شدہ مکان میں موجود ایک کار میں سنا گیا تھا۔

اس کار میں صرف دو آدمی سوار تھے۔ ایک وہ جس نے فون سنا تھا اور دوسرا ڈرائیور جو شکل ہی سے کوئی خونخوار درندہ معلوم ہوتا تھا۔

دونوں کے بائیں ہاتھ ایک ایک آٹومیٹک گن رکھی تھی اور ان کے حلیے اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ دونوں چند سیکنڈ کے مارجن پر کشتوں کے پشتے لگا سکتے ہیں۔

"چلو ـــــ"

اس نے فون کا سوئچ آف کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا اور دوسرے ہی لمحے ادھ کھلے دروازے سے سڑک پر آ چکے تھے۔

رات کا آخری پہر تیزی سے اجالے کی سمت اپنے سفر کا آغاز کر چکا تھا جب وہ لوگ مین روڈ پر آئے اور تھوڑی ہی دیر میں ان کی قیمتی کار انتہائی برق رفتاری سے اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہی تھی۔

یہاں سے اپنی منزلِ مقصود تک کا فاصلہ انہوں نے بمشکل ایک گھنٹے میں طے کر لیا تھا۔

اب وہ شہر کی جدید آبادی کے ایک شاندار بنگلے کے سامنے کھڑے تھے۔ جس کی سنگِ مرمر کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر جدید ترین سہولیاتِ زندگی سے آراستہ ایک خوابگاہ میں مقامی ایم این اے صاحب بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔

جیسے ہی دروازے پر موجود چوکیدار نے انہیں انٹرکام پر کسی "خان صاحب" کی آمد کا مژدہ سنایا ان کے تنِ مردہ میں گویا زندگی نے پھر سے انگڑائیاں لینی شروع کر دی تھیں۔

"اوہ ـــــ سالا ایس پی ـــــ"

ایم این اے ہونٹ چباتے ہوئے بڑبڑایا۔

"کیا حکم ہے جناب ـــــ"

دوسری طرف سے گیٹ پر موجود پہریدار نے دریافت کیا۔

"خاص مہمان ہیں ـــــ ان کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھو ـــــ"

اس نے پہریدار کو حکم دیا اور فون کریڈل پر رکھ کر پہلو بدل کر لیٹ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

بہرے دار خاص مہمانوں سے بخوبی آگاہ تھا۔

اُس نے دونوں کو بنگلے کی انیکسی میں جن کمروں میں ٹھہرایا تھا ایسے کمرے شاید دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں ہی کو نصیب ہوا کرتے تھے۔ جہاں ان کے اشارہ ابرو پر ہر شے پہنچ جایا کرتی تھی۔

دونوں مطمئن ہو کر تھوڑی دیر بعد خراٹے لینے لگے۔ وہ طویل سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ اور خاصے تھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

اے ایس پی کو وائرلیس پر اطلاع مل گئی تھی کہ انسپکٹر عنایت شاہ مشتبہ کار اور اُس کے سواروں کا جلوس لے کر تھانے کی طرف آ رہا ہے۔ انہوں نے وائرلیس پر اُسے ڈانٹنا مناسب نہ جانا کیونکہ اُس کا یوں "ناکہ" اُٹھا کر چلے آنا ٹھیک نہیں تھا۔

بہرحال اب وہ ذہنی طور پر خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد عنایت شاہ اپنے ملزموں سمیت اُس کے سامنے موجود تھا۔

"مجھے افسوس ہے آپ لوگوں کو زحمت اُٹھانا پڑی ــــــ"

اُن کی شکلوں پر نظر پڑتے ہی اے ایس پی نے کہا۔

"سلیم صاحب! باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے پولیس کار میں فوراً میری بیگم کو گھر پہنچانے کا بندوبست کیجئے ــــــ میرے خیال سے آپ کو اس بات کا علم تو ہو چکا ہو گا کہ ہم مجرم نہیں شریف شہری ہیں۔"

اے ایس پی کا نام لے کر اُس نے مخاطب کیا تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکے۔ خدا جانے عنایت شاہ نے کیا گل کھلایا تھا۔

"آپ کون صاحب ہیں؟"

اے ایس پی نے پُرسکون لہجے میں اُس کا طنز اور غصہ نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے میز کے کونے پر لگی گھنٹی بجائی۔

"میرا نام امیر کیانی ہے اور میں طالب صاحب کا رشتہ دار ہوں۔ اُمید ہے آپ نے طالب صاحب کا نام سُنا ہو گا۔"

اس کے منہ سے طالب صاحب کا نام سُنتے ہی اے ایس پی صاحب ایک لمحے کے لیے چکرا کر ہی رہ گئے۔ مقامی اُردو اخبار کا جرائم پیشہ سینیئر ایڈیٹر جس کو سرکاری حلقوں میں بے پناہ پذیرائی حاصل تھی اور جو آئے روز کسی نہ کسی بہانے چھوٹے افسران کا ناطقہ بند کیے رکھتا تھا۔ کوئی ایسا آفیسر جو اُس کی حرام کاریوں کے راستے کی دیوار بننے کی کوشش کرتا اس کے لیے لاینحل مسائل کھڑے ہو جاتے تھے۔

"برائے مہربانی مجھے فون کرنے کی اجازت دیجئے ــــــ"

امیر کیانی نے کہا۔

"دیکھئے جناب! میں نے آپ سے پہلے بھی معذرت کی ہے کہ آپ اس بات کو مسئلہ نہ بنائیں۔ ہم نے انتہائی مصدقہ اطلاع پر ناکہ لگایا تھا۔ آپ کو جو نقصان ہوا اس کا ازالہ ہم کر دیں گے۔"

اے ایس پی صاحب نے چاہا کہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے۔ اس دوران ایک سپاہی اندر آ گیا تھا۔

"میری گاڑی لے جاؤ اور بیگم صاحبہ کو احترام سے گھر پہنچا آؤ۔"

انہوں نے اپنے اردلی کو حکم دیا۔

"آپ تشریف لے جائیں محترمہ۔ افسوس آپ کو زحمت اُٹھانا پڑی۔ افسوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارے فرائض ہی ایسے ہیں۔"

اے ایس پی صاحب کی مسلسل کوشش یہی تھی کہ معاملہ دب جائے۔

لیکن ـــــ

یہ سب تو ایک بڑے منصوبے کا حصہ تھا۔

انہیں اس بات کی سمجھ اس وقت نہ آسکی کہ ان کی "فرض شناسی"

کچھ "شرفا" قدرے پریشان دکھائی دے رہے تھے انہوں نے اے ایس پی صاحب تک دو تین مرتبہ اپروچ بھی کی اور انہیں بڑا "خطیر نذرانہ" پیش کرنا چاہا۔

لیکن ـــــ

خدا جانے اے ایس پی کس مٹی کا بنا تھا۔ اس نے نہ صرف ایسی ہر پیشکش کو پائے حقارت سے ٹھکرایا بلکہ ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ "فرض شناسی" کا مظاہرہ کیا جس نے اب ان لوگوں کو تلملا کر رکھ دیا تھا۔

"آپ نے دیکھا ان وحشیوں نے میری گاڑی کا کیا حشر کیا ہے"

امیر کیانی نے اے ایس پی پر باقاعدہ چڑھائی شروع کر دی تھی۔

"کیانی صاحب مجھے افسوس ہے کہ آپ کو...."

"میں آپ کے افسوس کو کیا کروں جی ـــــ آپ نے میری گاڑی کا ستیاناس کر دیا۔ آپ کے عملے نے میرے ساتھ بدتمیزی کی۔ آپ لوگ پولیس کی وردیاں پہن کر سرِ عام غیر قانونی کام کر رہے ہیں۔ اندھیر مچا رکھا ہے۔ اس غنڈہ گردی کا لائسنس آپ کو دیا کس نے ہے؟ میں تو آپ کو سبق سکھا دوں گا۔ یعنی کمال ہے کہ غنڈے اور ڈاکو شہر میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ اور شریفوں کو آپ اسی طرح سڑکوں اور تھانوں میں بے عزت کرتے پھرتے ہیں۔"

اُس نے فوراً اے ایس پی کی بات کاٹ دی تھی۔

"دیکھیے جناب ـــ میں آپ کے جذبات کا احترام کرتا ہوں۔ آپ کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوئی ہے تو میں اس کا ازالہ کروں گا ـــــ لیکن آپ بھی براہِ کرم اس بات کا خیال رکھیے کہ آپ قانون کے محافظ سے بات کر رہے ہیں۔"

اے ایس پی صاحب نے بڑی ہمت سے اپنے جذبات پر قابو پا رکھا تھا۔

"سلیم صاحب قانون کا احترام تو میں آپ کو سکھاؤں گا۔ یہ سب کچھ جو میرے ساتھ ہوا ہے آپ کے حکم اور اشارے پر ہوا ہے۔ ایک انسپکٹر کی یہ مجال کہاں کہ وہ ہم جیسے عزت داروں کو اس طرح سڑکوں پر ذلیل کرتا پھرے۔ میں تو آپ لوگوں کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ آپ کی نسلیں یاد رکھیں گی کہ...."

"دیکھیے مسٹر! اپنی زبان کو لگام دیجیے۔ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ آپ کو زیب نہیں دیتا کہ ایک پولیس آفیسر کے ساتھ ایسی دھمکی آمیز زبان میں گفتگو کریں ـــــ"

اے ایس پی کو بھی غصہ آگیا تھا۔

یہ شخص براہِ راست اس کی عزتِ نفس پر حملے کر رہا تھا اور کمرے میں موجود اس کے ماتحتوں کے سامنے ـــــ!

"اب مجھے تم بولنے کے آداب سکھاؤ گے ـــــ"

امیر کیانی اس کی طرف ایسے بڑھا جیسے اے ایس پی پر حملہ کرنے لگا ہو۔

لیکن ـــــ

اس سے پہلے ہی اُسے دو مستعد پولیس کمانڈوز نے قابو کر لیا۔

"گیٹ آؤٹ ـــــ اس پاگل کو دھکے دے کر نکال دو ـــــ"

اے ایس پی نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماتحتوں نے امیر کیانی کو جس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُمڈ رہا تھا منہ پر ہاتھ رکھ کر کمرے سے باہر گھسیٹا اور اپنے افسر کی توہین برداشت نہ کرتے ہوئے تین چار گھونسے بھی رسید کر دیے۔

امیر کیانی کا ڈرامہ شاید یہیں تک محدود تھا۔

اس کے بعد کا پارٹ کسی اور کو ادا کرنا تھا۔

○

امیر کیانی کو پولیس والے دھکے مارتے ہوئے تھانے کے دروازے تک لائے تھے جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔

صبح ڈھل رہی تھی۔

زندگی کروٹ لے کر بیدار ہوا چاہتی تھی جب تھانے کے مین گیٹ کے باہر موٹر سائیکل رکنے کی آواز سنائی دی۔

گیٹ پر موجود گارڈ نے پہلی ہی نظر میں موٹر سائیکل سواروں کو پہچان لیا۔ یہ دونوں مقامی روزنامے کے کرائم رپورٹر اور فوٹو گرافر تھے۔

"یہ کمبخت صبح صبح کہاں آن مرے"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"دروازہ کھولو جلدی کرو۔ ایس ایس پی صاحب ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔"

کرائم رپورٹر نے اترتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔

بے چارے سنتری بادشاہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ہونے والا ہے اُسے صرف اس بات کا علم تھا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک کو بھی اس نے ناراض کر دیا تو اس کا ٹھکانہ اس دنیا میں جہنم ہوگا۔

اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دروازہ اندر سے کھول دیا۔

یہ بالکل وہ لمحہ تھا جب امیر کیانی کو پولیس اہلکار دھکے مارتے ہوئے گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے۔

فوٹو گرافر نے پلک جھپکنے میں ان مناظر کو جزئیات سمیت کیمرے کی فلم پر منتقل کر لیا۔ اس نے کھٹاک کھٹاک سے آٹھ دس تصویریں اتاری تھیں اور اس سے پہلے کہ پولیس والوں کو ہوش آتے دونوں جس طرح آندھی اور طوفان کی رفتار سے آئے تھے اُسی طرح واپس لوٹ گئے۔

اپنا کام مکمل ہوتے ہی امیر کیانی نے چاہا کہ اطمینان سے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا جائے۔

لیکن ـــــ

ایک احمق اے ایس آئی جسے اس ڈرامے کی سمجھ آ گئی تھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اس نے طیش میں آ کر امیر کیانی اور اس کے ڈرائیور کی اچھی خاصی ٹھکائی کر دی۔ اس کے دیکھا دیکھی باقی پولیس ملازمین بھی دونوں پر پل پڑے۔ انہوں نے شاید ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کا ارادہ باندھ لیا تھا۔ جب دونوں مار کھاتے کھاتے آدھ موئے ہو گئے تو انہوں نے دونوں کو اُن کی کار میں پھینکا اور زخموں سے چور چور ڈرائیور گاڑی بھگا کر لے گیا۔

○

امیر کیانی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر نیم بے ہوش پڑا تھا جبکہ "ڈرائیور" کے اوسان مکمل بحال تھے۔

اس نے گاڑی شہر کی طرف لاتے ہوئے ایک میڈیکل سٹور پر کھڑی کی اور وہاں سے مقامی روزنامے کے سینئر ایڈیٹر کا نمبر ملایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طالب نے اپنے سرہانے دھرے فون کی گھنٹی کی مسلسل آواز پر ادھ کھلی آنکھیں کھولیں گھڑی کی طرف دیکھا اور گالیاں بکتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہاں ں ں ____"

اُس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

دوسری طرف اکبر شاہ اُس سے مخاطب تھا۔

"کیا مصیبت آ گئی ہے اب ____ یار ابھی تمہارے کام سے فارغ ہو کر لیٹا ہی تھا کہ تم نے ____

کیا ہوا فریڈ گروا نہیں پہنچا ____!

اس نے اکبر شاہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا۔

"سرجی! یہ بات نہیں ____"

اکبر شاہ نے کچھ کہنے کے لیے تمہید باندھی۔

"پھر کیا قیامت آ گئی ہے ____ یار آرام تو کرنے دیا کرو"

طالب نے اپنی سستی آواز میں کہا۔

"جناب والا میں نے بڑی ایمرجنسی میں فون کیا ہے۔ دراصل اُدھر ہے میں کچھ زیادہ ہی حقیقت کا رنگ بھر گیا ہے۔ امیر کبانی صاحب زخمی حالت میں گاڑی کی نشست پر پڑے ہیں"

اکبر شاہ نے کہا۔

"زخمی ہیں بھی ____ وہ زخمی ہیں پھر تو بات بن گئی ہے ____ تم فوراً پولیس سرجن کے پاس پہنچو ____ جگہ کا پتہ ہے نا ____ تم سے پہلے باقی بندوبست ہو چکا ہوگا۔ شاباش۔ ہری اپ!"

طالب کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اُسے تو بیٹھے بٹھائے کئی

گنا زیادہ منافع ہو گیا تھا۔ اب تو وہ ایم این اے صاحب کو حقیقی معنوں میں لوٹ رہا تھا۔

اُس کی نیند اُڑ گئی تھی۔

اب وہ شکاری کتے کی طرح چوکنا ہو کر اپنی چارپائی پہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اُس کا شیطانی ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

ہزاروں کی رقم اب لاکھوں میں تبدیل ہونے والی تھی۔

حالات نے بیٹھے بٹھائے اُسے سنہری موقعہ فراہم کر دیا تھا۔

طالب قسمت کا دھنی تھا۔

گاؤں کے معمولی سے کمہار کا بیٹا جس نے کسی طرح رو پیٹ کر میٹرک کیا اور شہر آ گیا۔ جہاں اپنے ہی گاؤں کے ایک لودو لیتے کے گھر اس نے نوکری کر لی اور ایف اے بھی پاس کر لیا۔ شہر کے ماحول نے آہستہ آہستہ مکمل شہری بنا دیا۔

گاؤں کا سیدھا سادا کمہار لڑکا شہر کیا آیا گویا چیونٹی کے پر نکل آئے۔ اپنے گاؤں کے جس "لودو لیتے" کے گھر اس نے نوکری کی تھی۔ اُسے حرام کی کمائی کا کچھ زیادہ ہی چسکا لگ گیا تھا۔ کبھی وہ سمگلروں کا معمولی سا "پانڈی" ہوا کرتا تھا۔ اب خود بہت بڑا سمگلر بن گیا تھا۔

اس کے گھر چونکہ وی آئی پی کا آنا جانا لگا رہتا تھا شاید اسی لیے اس نے اپنا سوشل سٹیٹس مزید اونچا کرنے کے لیے شہر کی ایک ماڈرن طوائف کو اپنی دوسری بیوی کے روپ میں اپنے گھر بٹھا لیا تھا جبکہ اپنی پہلی سیدھی سادی بیوی کو جس سے اُس کے پانچ زندہ اور پانچ مردہ بچوں نے جنم لیا تھا گاؤں میں ہی پکی حویلی بنا کر دے دی تھی۔ پھر رشتہ داروں کی لعن طعن پر اسے بھی شہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے دوسرے کونے میں کوٹھی بنوا دی تھی اور ہفتے میں ایک آدھ دن وہاں بھی اتمام حجت کے لیے گزار لیا کرتا تھا۔

طالب کی پیشانی پر حرام تحریر تھا۔

نودولیتے کی بیوی زمانہ شناس عورت تھی۔ وہ معمولی طوائف کے گھر جنم لینے کے بعد اس مقام تک اپنے جسم کی سیڑھی کے ذریعے پہنچی تھی۔

قدرت نے اُسے بلاشبہ ایک خوبصورت اور انتہائی جنسی انداز کے جسم سے نوازا تھا جس کا استعمال اُسے اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کی بہنیں آج بھی چند سو روپوں کے عوض اپنی راتیں جنسی درندوں کی نذر کر رہی تھیں جبکہ وہ اس بوڑھے نودولیتے سمگلر کی داشتہ سے مجبوراً آدھی بیوی بن کر اس کے گھر کی مالکن بن گئی تھی۔

یہاں اُسے یوں تو تمام سامان عیش و عشرت میسر تھا۔

لیکن ——

اپنی علت پوری کرنے کے لیے وہ پاگل ہوئی جاتی تھی۔ جلد ہی اس نے طالب کمہار کو اپنا گدھا بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس کے لیے یہ کوئی مشکل کام یوں بھی نہیں تھا کہ گاؤں کے کمہار کے گھر جنم لینے کے باوجود طالب کمہار نے ہمیشہ شہری بابو اور لکھ لُٹ بننے کے خواب دیکھے تھے۔ اس نے اب تک بے شمار جاسوسی ناول پڑھ لیے تھے اور اپنے دل میں کئی مرتبہ خود کو ان ناولوں کے ہیرو کا رُوپ دے چکا تھا۔

صغراں بیگم کو اس نے اپنی خوش قسمتی جانا اور اس کی جنسیت کے بھینٹ جنسی خوشی چڑھتا رہا۔ یہاں سے اُسے عیاشی کا ہر سامان میسر تھا۔ صغراں بیگم بڑی ہوشیاری سے دو سال تک نودولیتے کو اُلو بناتی رہی۔ اس درمیان طالب کمہار اس کی جسمانی ضروریات پوری کرتا رہا اور وہ اس کے سامنے دولت کے انبار لگاتی رہی۔

طالب کمہار نے اس دوران بے شمار داؤ پیچ سیکھ لیے تھے۔ اُس نے بی اے کا امتحان چند ہزار روپے کے عوض پاس کر لیا اور ایک روز جب احساس ہوا کہ اب صغراں بیگم کی جنسیت جنون کی حدوں کو چھونے لگی اور عین ممکن ہے کہ اس کی دیوانگی دونوں کے بھیانک تعلقات کا پردہ ہی چاک نہ کر دے جس کے بعد اُس کا زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا کیونکہ نودولیتے کے پاس پیشہ ور قاتلوں کی مکمل فوج موجود تھی۔

طالب کمہار نے جس روز یہ اندازہ لگایا کہ صغراں بی بی سے آدھی عمر کی لڑکیاں حاصل کرنا بھی اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تو وہ چُپ چاپ نودولیتے کا گھر چھوڑ آیا اور اسی گھر میں قائم ہونے والے تعلقات کے حوالے سے اس نے ایک دولت مند کو پھانس لیا۔

یہ "دولت مند" غریب لوگوں کو سہانے خواب دکھا کر اُن کی کمائی سے اپنی تجوریاں بھر رہا تھا اور طالب اس کا منشی بن کر اس سے چمٹا ہوا تھا۔ اس دوران اس نے صحافت میں بھی منہ مارنا شروع کر دیا تھا۔

مقامی اخبارات کے کچھ بے ایمان اور رکھ دار قسم کے ایڈیٹر اور رپورٹروں کے سامنے چارہ ڈال کر وہ ان کے کندھوں پر سوار ہوا اور آہستہ آہستہ اخبارات میں "بالوزہ" ہوتا گیا۔

"دولت مند" ایک روز سرکار کے ہتھے چڑھ گیا۔

اس کی تمام "آف دی ریکارڈ" کمائی طالب کمہار کے پاس موجود تھی جس نے طوطے کی طرح اپنے مالک سے آنکھیں پھیر لیں اور اس کی ساری کمائی خود ہڑپ

کر کے اُسے زندگی بھر جیل میں سڑنے کے لیے پھینک دیا۔

بے چارے دولت مند کو بھی غم لے بیٹھا اور دو تین سال جیل میں ذلیل ہونے کے بعد بالآخر وہ کھانستے کھانستے مر گیا۔

اب طالب کمہار آزاد تھا ——!

کوئی اُسے لگام دینے والا نہیں تھا۔

اُس نے بڑے بڑے شاطروں کو اُلّو بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کا گُر سیکھ لیا تھا ——!!

جرم اس کی عادت بن چکا تھا۔

اُسے کبھی جرم کرتے ہوئے خوف نہیں آیا تھا۔

اس دولت نے اُسے ایم۔ اے کروا دیا اور چند سالوں میں اس جوڑ توڑ، حرام کاری، ریاکاری اور بے غیرتی کے سہارے وہ مقامی روزنامے کا سینئر ایڈیٹر بن گیا۔

ایک جرائم پیشہ شخص ہونے کے ناطے اس نے اپنے اندر موجود خوف کا گلا گھونٹنے کے لیے شہر کے تمام بڑے نام نہاد شرفا سے تعلقات استوار کر رکھے تھے ——!

وہ ان شرفا کی اصلیت جاننے کے بعد ان کی بیساکھی بن جاتا اور ایک وقت وہ بھی آ جاتا جب یہ شرفا اس پر اندھا اعتماد کرنے لگتے۔

ان میں سیاست دان بھی شامل تھے۔ زعمائے حکومت بھی اور مذہبی اور معاشرتی راہنمائی کے دعویدار بھی۔

کسی کو وہ آگاہ کر کے لوٹ رہا تھا۔

اور کسی کی معصومیت کا فائدہ اُٹھا کر اُسے لوٹتا تھا۔

صحافت کا نقاب اوڑھے اس خونخوار بھیڑیے کی اصلیت کا علم کچھ ذمہ دار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرکاری عہدیداروں کو ضرور تھا۔

لیکن ——

وہ بے چارے اپنی مصلحتوں، مجبوریوں اور نام نہاد شرافت کے ہاتھوں اتنے مجبور تھے کہ سوائے اپنی بے بسی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہنے کے اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

○

ایم این اے طالب کمہار کا اس زمانے کا دوست تھا جب وہ "نو دولتیے سمگلر" کے گھر گلچھرے اُڑایا کرتا تھا۔ تب یہ ایم این اے ایک سیاسی جماعت میں منشی کے فرائض انجام دیتا تھا۔

لیکن ——

طالب کمہار کی طرح ایم این اے نے بھی بڑے خواب سجائے اور پھر اپنی حرام کاری کے ذریعے اُسے حقیقت کا روپ دیا تھا۔ شہر کی "موری ممبری" سے ایم این اے تک کا فاصلہ اس نے اتنی برق رفتاری سے طے کیا تھا کہ دیکھنے والے انگشتِ بدنداں تھے۔

حرام کاری میں ان دونوں کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

شاید "ہنر کی خوبی" نے دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا۔

ایم این اے صاحب بڑے مزے کی نیند سے بیدار ہوئے تھے جب انہیں اپنے خاص نمبر پر کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف طالب کمہار اُن سے مخاطب تھا۔

"ہاں جی میاں صاحب مال پھر ٹھیک ٹھاک پہنچ گیا نا ——"

اُس کی مکارانہ آواز سنائی دی۔

"کون سا مال —— یار کیسی باتیں کر رہے ہو۔ بابا کیوں غریبوں کا مذاق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُڑاتے ہو۔ مالی تو اخبار والے کما رہے ہیں ـــــ ہم تو لٹا رہے ہیں۔ اب پھر اسمبلیاں ٹوٹنے کی افواہیں پھیل رہی ہیں پھر خرچہ آن پڑے گا یار میں تو اس سیاست سے تنگ آ گیا ہوں۔ ابھی پہلا خرچہ بمشکل پورا ہوتا ہے جب نئے الیکشن آجاتے ہیں، دوبارہ خرچہ ....."

ایم این اے میاں صاحب کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

"میاں صاحب ہم بے چارے صحافیوں سے سیاست نہ کیا کرو ـــــ ہم تو تمہارے جاں نثار ہیں لیکن یاروں سے دغا نہیں کیا کرتے۔ میاں صاحب وہ کیا کہتے ہیں کہ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے ـــــ یار ہمیں تو بخش دیا کرو۔"

مکاری میں طالب کمہار بھی اُس کا باپ تھا۔

"یار طالب بس تیری یہ عادت نہ گئی۔ خواہ مخواہ یاروں پر بھی شک کرتا رہتا ہے۔ تجھ سے کیا پردہ ہے یار ـــــ تجھ سے کیا چھپا ہے۔ اب خدا جانے تجھے کون سا مال یاد آگیا۔ کیا بنا اُس کتے کی دم کا۔ اُس کا دماغ ٹھیک کرنے کا بندوبست ہوا یا نہیں۔ یار ایک مرتبہ اس کی چھٹی اس شہر سے ہو جائے تو ہمارے تمہارے کئی رکے ہوئے کام بن جائیں۔"

ایم این اے اس کی رگ رگ سمجھتا تھا اور جان گیا تھا کہ اُس موذی کا پیٹ اس رقم سے نہیں بھرا جو اس نے "ڈرامہ" تیار کرتے ہوئے اُسے تھمائی تھی۔

"میں وہی کہنے والا تھا۔ یوں سمجھو کہ اچانک ترپ کا پتہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ اگر پرسوں تک اے ایس پی سلیم کو او۔ ایس۔ ڈی نہ بنوا دوں تو میرا کوئی باپ نہیں۔"

طالب کمہار نے اپنا تکیہ کلام دُہرایا۔

ایم این اے کو اپنی طرح اُس کی ولدیت کے متعلق ہمیشہ شک ہی رہا تھا۔ اُس کا دل کئی مرتبہ چاہا کہ اس کے اس تکیۂ کلام کے آخر میں اُس کی ہاں میں ہاں ملا دیا کرے۔

لیکن ـــــ

بے چارہ اپنی زبان دانتوں تلے دبا کر رہ جاتا۔

"یار تیرے بچے جئیں ـــــ تو نے میرا سیروں خون بڑھا دیا۔ حکم کر دس بیس ہزار اور پہنچا دوں۔"

ایم این اے میاں صاحب کا دل ایک مرتبہ تو زور سے دھڑک کر رہ گیا۔

"بس میاں صاحب آپ ہیں اور ہم ہیں یہی فرق ہے۔ ہم آپ کے حکم پر ساری خدائی سے ٹکر لے لیتے ہیں اور آپ ہمیں بے وقوف بناتے رہتے ہیں ـــــ کروڑوں کا مال آپ کے "آستانہ عالیہ" پر پہنچ چکا ہے اور ہمارا حصہ بھکاریوں کی طرح دے رہے ہیں ـــــ"

طالب نے فقرہ چھوڑ کر ایم این اے کے پاؤں تلے سے زمین سرکانا چاہی۔

"یار کیوں بے پر کی اُڑاتے ہو۔ آخر اخبار والے ہو ناں۔!"

میاں صاحب نے سنبھل کر بظاہر ہنستے ہوئے اپنے اعصاب نارمل کرنا چاہے۔

"میاں جی آج کل بابے شاہ سے دوستی کچھ زیادہ ہی بڑھتی جا رہی ہے اور ....."

"بس ـــــ بس یار فون پر ایسی باتیں نہیں کیا کرتے ـــــ لعنت بھیجو۔ اچھا اچھا تم بتاؤ ـــــ"

"بابے شاہ" کے نام نے ہی ایم این اے کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس حرام خور کمہار کو شاید ان کی نئی "ڈیل" کا علم بھی ہو گیا تھا یا پھر محض اس نے شک کی بنیاد پر ہوا میں تیر چلا کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے تھے۔

"میاں صاحب! ہم حقیر ضرور ہیں لیکن ایک جہان کی خبر رکھتے ہیں۔ پانچ لاکھ دوپہر تک پہنچا دیں ـــ باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں ـــ"

طالب کمہار نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

"یار طالب عقل کر پانچ لاکھ کہاں سے لاؤں گا۔ بس دو لاکھ کافی ہیں۔ دو لاکھ ـــ بس بس یار سمجھا کر ـــ زندگی میں ایسے موقعے آتے رہتے ہیں۔"

ایم این اے نے جان چھڑانی چاہی۔

"میاں صاحب تمہاری نہ ہماری تین لاکھ آ جائیں کیش ہی بھیجنا ـــ اچھا خدا حافظ ـــ"

اس نے میاں صاحب کی اگلی کوئی بات سننے سے پہلے ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

"اچھا کمہار کبھی تو میری ڈاڑھ کے نیچے آئے گا ـــ اگر پیس کر نہ رکھ دیا تو میرا بھی کوئی باپ نہیں ہو گا ـــ"

ایم این اے نے اسے تین چار موٹی موٹی گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

اکبر شاہ جب امیر کیانی کے ساتھ سرکاری ہسپتال پہنچا تو تین چار اخبارات کے فوٹوگرافر وہاں پہنچ چکے تھے۔ خدا جانے ان کو طالب نے کیا لالچ دے کر نیند سے اٹھا کر یہاں بھیجا تھا۔ عام حالت میں تو اگر شہر میں قیامت بھی آ جاتی تو یہ لوگ اتنی صبح یہاں نہ پہنچتے۔

انہوں نے کھٹاک کھٹاک سے زخمیوں کی تصاویر بنانی شروع کر دیں۔

کار کی جو درگت انسپکٹر عنایت شاہ نے بنائی تھی اس کی تصاویر الگ سے بننے لگیں۔ سرکاری سرجن کے سامنے چھوٹے چھوٹے دو ٹیپ ریکارڈ رکھے ان لوگوں نے زخموں کی سنگین نوعیت کے متعلق زبردستی اس کے منہ سے بہت کچھ اگلوا لیا اور اس کے "ناں ناں" کرنے کے باوجود اس کی تصاویر بھی ساتھ ہی اتار لیں۔

سرکاری سرجن کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

کیا ہونے والا ہے؟

اس بے چارے کو ابھی کارپوریشن کی نوکری میں آئے بمشکل چند ماہ ہوئے تھے جب یہ بلا اس کے گلے منڈھ دی گئی۔ عموماً وہ پولیس میڈیکولیگل کیسز میں اپنی ماہرانہ رائے متعلقہ تھانے کے صلاح مشورے سے ہی دیا کرتا تھا۔

لیکن ـــ

یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ گئی تھی۔

خدا جانے یہ کس قسم کے اخبار نویس تھے جنہوں نے اس سے زبردستی بہت کچھ اگلوا لیا تھا۔ ان لوگوں نے چند منٹ کے اندر اندر زخموں کی رپورٹیں ٹائپ کروا کر ان کی کاپیاں اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔

ٹائپسٹ نے بھی ایک انچ والا زخم گھبراہٹ میں تین تین انچ کا لکھ دیا تھا۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ دونوں کو پولیس والوں نے بڑی طرح مارا پیٹا تھا۔

لیکن ـــ

یہ تو معمول کی بات تھی۔

عوام کو مارنا تو یہاں پولیس کا معمول تھا۔ آج تک درجنوں ایسے کیس اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے پاس آ چکے تھے جب پولیس نے محض چند ہزار ہتھیانے کے لیے کسی بھی شخص کو مار مار کر اُس کی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔

یہاں تو بے گناہوں سے اقبالِ جرم کروانے کے لیے پولیس والے انہیں زندہ درگور کر دیتے تھے۔

کسی بھی گناہ گار کو بے گناہ قرار دلوانے کے لیے کسی بھی بے گناہ کو لٹکا دینا یہاں کا رواج تھا۔

اُسے تو تنخواہ ہی اس بات کی ملتی تھی کہ پولیس تشدد سے مرنے والوں کی موت کو خودکشی قرار دے اور خودکشی کے کیس کو قتل کے مقدمے میں تبدیل کروا دے ـــ!!

یوں اگر وہ صحیح میڈیکل رپورٹس جاری کرنے لگا تو گئی پولیس کی نوکری ـــ!

اُس نے خدا خدا کر کے جانے کہاں کہاں سے سفارشیں سمیٹ کر اربابِ بست وکشاد کی جھولیاں بھری تھیں تب کہیں جا کر یہ نوکری نصیب ہوئی تھی۔

اس شہر کے بدمعاش ایک دوسرے کے خلاف اپنے کیس مضبوط کرنے کے لیے اُس کے گھر ہزاروں روپے کا نذرانہ پہنچایا کرتے تھے اور وہ رشوت بھی ان کیسوں میں لیا کرتا تھا جہاں پولیس کا کوئی تعلق نہ ہو۔

آج صبح صبح اُس کے ساتھ جو حادثہ گزرا تھا اُس نے تو سرکاری سرجن کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

خدا جانے اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ کیونکہ ان رپورٹس کی بنیاد پر جو اُس نے گھبراہٹ میں جاری کر دی تھیں کسی بھی پولیس آفیسر کا دھڑن تختہ ہو سکتا تھا۔ مریض کی میڈیکل رپورٹس اور مرہم پٹی کے بعد ان کے لواحقین انہیں واپس لے گئے ان رپورٹس کی بنیاد پر وہ ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانے کا ارادہ

کر چکے تھے۔

اے ایس پی سلیم کو یاد تھا کہ مقامی تھانے کا چارج سنبھالنے کے چند روز بعد ہی جب اُس نے ایک جگہ ریڈ کر کے شراب کی بوتلیں برآمد کی تھیں تو اُس کا اور طالب کھہار کا پہلا تعارف ہوا تھا۔

"سر! طالب صاحب کا فون ہے ـــ"

اُس کے پی اے نے کہا تھا۔

"کون طالب صاحب بھئی ـــ تعارف تو کروا دو ـــ"

"سر! یہ مقامی روزنامہ کے بڑے ایڈیٹر ہیں۔ بڑی پہنچ والے ہیں جناب۔ افسروں سے ان کی بہت دوستی رہتی ہے۔"

"اچھا ـــ"

کہتے ہوئے اُس نے فون اُٹھایا۔

"اے ایس پی صاحب میں عموماً ایس پی سے کم رینک کے آفیسر سے بات نہیں کیا کرتا۔ آپ کا سٹاف آپ کو بتا دے گا ـــ لیکن ایک مجبوری آن پڑی ہے ـــ"

اے ایس پی کو اس کی گفتگو کا انداز بہت بُرا لگا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں اتنا بدتمیز صحافی نہیں دیکھا تھا۔

"فرمایئے ـــ"

اُس نے خود پر بڑی مشکل سے قابو پایا تھا۔

"آپ نے جہاں "ریڈ" کی ہے وہاں آج تک کوئی پولیس آفیسر نہیں گیا۔ ابھی بات میرے اور آپ کے درمیان ہے۔ دونوں آدمیوں کو ان کے سامان سمیت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا کر دیجئے ـــــ ممکن ہے یہی واقعہ ہماری دوستی کی بنیاد بن جائے۔"!

طالب کمہار نے اس طرح بات کی تھی جیسے اے ایس پی اس کا زرخرید غلام ہو۔

"میں ایسی دوستی پر لعنت بھیجتا ہوں ـــ اور تم جیسے گھٹیا لوگوں کے منہ لگنا مجھے بھی پسند نہیں ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے غصے سے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

سر! یہ اچھا آدمی نہیں۔ ایسے لوگوں کے منہ لگنا خواہ مخواہ اُلجھنیں ہی پیدا کرتا ہے۔ جناب والا اس نے...."

"شٹ اپ ـــ"

تھوڑی دیر بعد جب اُس کے پی اے نے اے ایس پی کو طالب کا تعارف کروانا چاہا تو اس نے پی اے کو ڈانٹ دیا۔

اس ٹیلی فونک ملاقات کے بعد سے تو دونوں گویا ایک دوسرے کی ضد بن کر رہ گئے تھے گو کہ طالب نے اس کے لیے ہر ممکن مسائل پیدا کر دیئے تھے۔

لیکن اے ایس پی سلیم کا تعلق بھی ملک کے مقتدر گھرانے سے تھا گو کہ وہ کسی دولت مند خاندان کا سپوت نہیں تھا۔

لیکن ـــ

اس کے پاس ایمانداری، وفاداری اور محنت کی ایک روایت تسلسل سے موجود تھی یہی وجہ تھی کہ اُس کے خاندان کے لیے بیوروکریسی کے کرپٹ افسروں کے دلوں میں بھی اس حوالے سے احترام موجود تھا۔

طالب کی مسلسل حرامکاریوں کے سبب بالآخر اُس کا تبادلہ سٹی سے کینٹ میں ہو گیا۔ جہاں تقدیر نے ایک مرتبہ پھر دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

اے ایس پی کو یہ رپورٹ اُس کے نہایت اہم "سورس" نے پہنچائی تھی کہ اس راستے سے رات کو فلاں کار میں ہیروئن بڑی مقدار میں سمگل کی جائے گی یہ "سورس" کوئی معمولی سا مخبر نہیں تھا بلکہ "بابے شاہ" کا خاص ڈرائیور تھا۔

اُسی نے تو اُس مال کے ساتھ جانا تھا۔

پھر وہ سفید کار جس میں امیر کبالی آیا تھا اس کا اسرار کیا ہے؟

کیا یہ "دھوکے کی چال" تھی ـــــ

ان لوگوں کو اُلجھا کر راستہ صاف کیا گیا تھا ـــــ

ضرور امیر کبالی کا اس گروہ سے کوئی تعلق ہے ـــ

لیکن ـــــ

عین موقعے پر فوٹو گرافر اور رپورٹر کی آمد ـــــ اور پھر سرکاری سرجن کے ہاں جو ڈرامہ رچایا گیا۔

یہ سب کیا ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا "سورس" پکڑا گیا ہو۔

بابے شاہ کوئی معمولی سمگلر نہیں تھا۔

اُس کے بین الاقوامی رابطے تھے۔

دنیا کے کئی ممالک تک اس نے پاؤں پھیلا رکھے تھے۔

لیکن ـــــ

کیا مجال کہ اُس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت کبھی کسی کے ہاتھ آیا ہو
یہ تو اُس کی خوش قسمتی تھی کہ ریاض ڈرائیور کو اس نے کسی طرح پھانس لیا اور اس کے ذریعے اب تک مختلف علاقوں میں تین چار بہت اہم کامیابیاں حاصل کر چکا تھا۔ اس نے ریاض ڈرائیور کی مدد سے بابے شاہ کا مال چار مرتبہ مختلف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جگہ سے پکڑا تو تھا۔

لیکن ——

مال کے ساتھ گرفتار ہونے والوں نے زبان کھولنے پر مر جانے کو ترجیح دی تھی۔ وہ لوگ خدا جانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے جو اپنے جسم کا بند بند کٹوانے کے بعد بھی یہ نہیں بتاتے تھے کہ مال کس کا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جانا ہے؟

انہیں صرف اتنا بتایا جاتا تھا کہ فلاں جگہ فلاں شخص سے مال لے کر فلاں جگہ فلاں شخص تک پہنچا دو۔

اس زنجیر کے شروع اور آخر کی کڑیاں کبھی نہیں مل پاتی تھیں۔

جیسے ہی ان لوگوں کا ریمانڈ پورا ہوتا انہیں ضمانت پر رہا کروا لیا جاتا پولیس والے منہ دیکھتے رہ جاتے۔

اے ایس پی سلیم کو اس بات کا بھی علم تھا کہ ان لوگوں پر تھرڈ ڈگری طریقے صرف اس کی موجودگی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔

جیسے ہی وہ تفتیش سے الگ ہوتا گرفتار شدگان کو تھانے میں "جوائیوں" والی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی۔ کسی پولیس افسر کو ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان کے جسم کو انگلی سے ہی چھو لے۔

اے ایس پی سلیم کو اس بات کا احساس تو ہونے لگا تھا کہ امیر کبانی کی گاڑی کی وہاں آمد اور وہ سارا ڈرامہ جو اس کے نکالنے میں کھیلا گیا تھا دراصل بلے شاہ کے ساتھیوں کا ترتیب دیا ہوا تھا۔

اس سے زیادہ ہوشیار اور چالاک مجرم آج تک اس نے نہیں لڑا تھا۔

اگر یہ ڈرامہ واقعی بابے شاہ کے گروہ کا سٹیج کردہ تھا تو اس میں ضرور

طالب نے اہم رول ادا کیا تھا۔

اب اُسے صرف اس سوال کا جواب تلاش کرنا تھا کہ بابے شاہ کے گروہ نے طالب کمہار کو "استعمال" کیا ہے یا وہ اُن کا باقاعدہ ساتھی ہے۔؟

یہی کچھ وہ سوچ رہا تھا جب ایس ایس پی صاحب کی طرف سے اُسے بلاوا آ گیا۔

"خدا خیر کرے —!!

اس نے دل ہی دل میں کہا اور ٹوپی سر پر رکھتا اپنے آفس سے باہر آ گیا۔

○

شام ڈھلے دونوں جہاں پہنچے تھے یہ شہر سے باہر مضافاتی علاقے میں واقع ایم این اے میاں صاحب کی حویلی تھی۔

یہاں چاروں طرف موجود سینکڑوں ایکڑ زمین اُس کی تھی جن پر جدید فارموں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس وقت میاں صاحب کے ڈیرے پر بابے شاہ اُن کا منتظر تھا۔ یہ سال میں دوسرا موقع تھا جب بابے شاہ اُن کی ملاقات کے لیے آیا تھا ——

دونوں نے روایتی بدمعاشوں کی طرح ایک دوسرے کا استقبال بانہیں پھیلا کر کیا اور اس آرام دہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے جو زیر زمین بنایا گیا تھا۔ اور جسے دیکھ کر واقعی یوں لگتا تھا جیسے کسی نے جنگل میں منگل رچایا ہو —!!

"مال ٹھیک ٹھاک پہنچ گیا ——"

اُس نے میاں صاحب کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"بابے شاہ تیرا مال اور ٹھیک ٹھاک نہ پہنچے۔ اس بات کا تو سوال ہی پیدا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہوتا۔"

ایم این اے کی باچھیں کھِل جاتی تھیں۔

"میاں یہاں سے دنیا کے دوسرے کونے تک اسی طرح میرا مال پہنچتا ہے ابھی اس ملک میں کسی ماں نے ایسے سپوت کو جنم نہیں دیا جو بلے شاہ کو مات دے سکے۔"

بلے شاہ نے یہ بات ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے بطورِ خاص کہی تھی۔

"کب تک یہ دفع ہوگا یہاں سے ــــ یا پھر میں ہی اسے اوپر بھیجنے کا بندوبست کروں ــــ"

بلے شاہ نے ایم این اے کی طرف دیکھا۔

"شاہ جی ــــ کل تک اس کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہو چکا ہوگا۔ جب ہم جیسے نوکر موجود ہوں تو آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت کیوں ہوگی ــــ؟"

میاں صاحب نے چاپلوسی سے کہا۔

"میاں ــــ میں چاہتا ہوں کل صبح جب اس کی آنکھ کھلے تو اسے ہماری طرف سے ایک تحفہ ضرور ملنا چاہیے۔"

بلے شاہ نے اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"حکم شاہ جی ــــ"

اس مرتبہ ایم این اے کے بجائے ریاض کے ساتھی نے کہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں اُسے اس کے مخبر کی لاش کا تحفہ بھی پہنچا دوں ــــ ہاں جہان خان میں غداروں کا وجود ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کرسکتا۔"

بلے شاہ نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"حرام خور ــــ تو نالی کا کیڑا۔ گندگی میں رینگنے والا ــــ پولیس والوں نے

تجھے کتے کی زندگی جینے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ تیری آنکھوں کے سامنے تھانے میں تیری ماں بہن کا کیا حشر کیا تھا ــــ میں نے تجھے اُن کے چنگل سے نکالا۔ تجھے باعزت زندگی دی۔ کیا اس لیے کہ تو کل کو میری ہی آستین کا سانپ ثابت ہو جائے۔ تو نے تین مرتبہ میرا مال پکڑوا دیا لیکن پولیس مجھ تک نہیں پہنچ سکی ــــ اس کے باوجود تجھے احساس نہ ہوا کہ تو باز آجائے۔ تیرے جیسے غدار کو جینے کا حق دینے سے بڑی زیادتی کوئی نہیں ہوگی ــــ"

اُس نے ریاض ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کی خوف کے مارے ٹانگیں لرز رہی تھیں اور رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

"شاہ جی مجھ پر رحم کیجئے ــــ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجئے ــــ"

اُس نے چاہا کہ بلے شاہ کی ٹانگوں سے لپٹ جائے۔

لیکن ــــ

سر پر پڑنے والی زوردار ٹھوکر نے اُسے دُور گرا دیا۔

"کتے کے پلے ــــ تو نے مجھے کب معاف کیا تھا۔ تو نے اپنے محسن کو ڈسا۔ مجھے جس نے تجھے نئی زندگی دی تو زندہ رہنے کے قابل نہیں۔"

بلے شاہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

"شاہ جی....."

اُس کے منہ سے بمشکل اتنا ہی نکلا تھا جب جہان خان کے پستول سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں نکل کر اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو گئیں۔

ریاض کو آواز نکالنے کی مہلت نہیں ملی تھی ــــ!

"اس کی لاش کو اسی قالین میں پیک کر کے ملک ایس پی کے دروازے پر چھوڑ آؤ ــــ اور ہاں جہان خان اس کی ماں کو رقم پہنچا دینا ــــ ہماری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خدمت بھی کمبخت نے بہت کی ہے ـــ بُرا ہو ان پولیس والوں کا جن کی وجہ سے اُسے یہ دن دیکھنا پڑا ـــ"

بلے شاہ نے اپنی گھنی مونچھوں پر اُلٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

○

"سلیم صاحب آپ نے یہ کیا کر دیا۔ یہ اخبار والے جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کا قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتے۔ منسٹر صاحب کی طرف سے بڑی سخت ہدایات بھی ہیں۔ آپ نہیں جانتے کل صبح مقامی روزنامہ ہمارے خلاف کیا طوفان اُٹھانے والا ہے۔"

ایس ایس پی نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"میں جانتا ہوں سر! کہ کل صبح کیا ہونے والا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ طالب جیسی کالی بھیڑیں جو صحافت کے مقدس پیشے کا لبادہ اُوڑھے اپنی مجرمانہ شناخت پر پردہ ڈالے بیٹھی ہیں ہمارے لیے کتنی خطرناک ہیں ـــ

لیکن سر ـــ کسی نہ کسی کو تو پہلا پتھر اُٹھانا ہی تھا ـــ مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا یہ عہدہ سنبھالنے کے تیسرے ہی روز مجھے علم ہو گیا تھا کہ احمد صاحب کا تبادلہ کیوں ہوا تھا ـــ انہوں نے بھی میری طرح اس موذی کی شراب پکڑی تھی ـــ لیکن میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔ میں نے جب یہ وردی اپنے تن پر سجائی تھی تو اپنے خدا سے ایک عہد کیا تھا جس کی پاسداری مرتے دم تک کروں گا ـــ آج طالب ایسے لوگ ہم پر صرف اس لیے حاوی ہیں سر! کہ ہم نے خود کو ان کا محتاج کر لیا ہے ـــ ہم ...."

"واہ صاحبزادے ـــ اب تم مجھے بھی سمجھاؤ گے ـــ شاباش! لگے رہو۔ خوب نام روشن ہو گا تمہارا اور اس ڈیپارٹمنٹ کا جب کل اخبارات

میں یہ تصویریں چھپیں گی ـــ"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی میز سے تصاویر کا ایک لفافہ نکال کر اُن کی طرف پھینک دیا۔

اے ایس پی صاحب نے لفافے سے تصاویر نکالیں ایک ایک تصویر اُن کے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

یہ تصاویر تو انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل سکتی تھیں۔

ان میں تو بڑے واضح طریقے سے امیر کبالی اور اس کے ساتھی کو پولیس کے بے رحمانہ تشدد کا شکار دکھایا گیا تھا۔

"میرے خیال سے آپ کا دماغ کچھ ٹھکانے پر آ گیا ہو گا ـــ"

ایس ایس پی صاحب نے ان کے چہرے کی بدلتی کیفیت پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ جانتے ہیں کہ یہ سب بکواس ہے۔"

اے ایس پی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس صریحاً دھاندلی کے خلاف کس انداز سے اپنا احتجاج ریکارڈ پر لائے۔

"ہاں ـــ اور میرے یہ کہہ دینے سے کہ یہ سب کچھ بکواس ہے یقیناً یہ سب کچھ بکواس ثابت بھی ہو جائے گا ـــ ہم باعزت بری بھی ہو جائیں گے۔ ویل ڈن مسٹر سلیم! شاباش! تم جیسے ہونہار آفیسر ہی اس محکمے کو چار چاند لگائیں گے۔"

ایس ایس پی صاحب کے طنزیہ لہجے نے اے ایس پی کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے کدھر جائے؟

"مسٹر سلیم! ہم بھی کبھی نوجوان تھے ـــ لیکن ہم نے اپنے دماغ کو ہمیشہ ٹھنڈا رکھا۔ تم ایک پولیس آفیسر کے بیٹے ہو۔ تم سے اس ڈیپارٹمنٹ کو بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امیدیں ہیں۔ بہرحال ــــ میں نے کسی نہ کسی طرح اُن لوگوں کی منت سماجت کر کے اُنہیں کل کے اخبارات میں یہ تصاویر دینے سے روک لیا ہے ــــ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تم کل رخصت پر جا رہے ہو اور رخصت کے درمیان ہی تمہارا تبادلہ دوسرے شہر میں کر دیا جائے گا ــــ مجھے اُمید ہے تم میرے جذبات کو سمجھو گے اور اس بات کا بھی احساس کرو گے کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کی ــــ"

ایس ایس پی صاحب نے نپے تُلے الفاظ میں اُسے سمجھایا۔

"نہیں سر! مجھے تو آپ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ آپ نے مجھے جیل جانے سے بچا لیا۔ ان لوگوں سے کیا بعید ہے ــــ یہ تو کسی بھی قسم کے ثبوت اکٹھے کر کے مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتے ہیں ــــ میں ایک ہفتے رخصت کی درخواست چھوڑے جا رہا ہوں سر!"

اے ایس پی سلیم نے کہا اور سیلوٹ کر کے واپس مڑ گیا۔

"نوجوان ہے ــــ خون گرم ہے ناں ــــ جلدی ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

ایس ایس پی صاحب نے دل ہی دل میں کہا اور اپنی بے بسی پر مسکرا کر رہ گئے۔

یہ واقعی اُن کی ہمت تھی کہ انہوں نے کسی بھی طرح طالب کمہار کو قابو کر کے اس وعدے پر اے ایس پی کی جان بخشی کروا لی تھی کہ وہ کل اس شہر میں نظر نہیں آئے گا اور اس کا تبادلہ بھی دوسرے شہر میں کر دیا جائے گا۔ وہ تو ایس ایس پی صاحب کی ذاتی دوستیاں کام آ گئیں ورنہ طالب کمہار تو اے ایس پی کے خلاف مقدمہ درج کروانے پر تُلا ہوا تھا اور ان لوگوں نے اپنی قانونی پوزیشن بھی خاصی مضبوط بنا لی تھی۔

مقامی تین چار ایم این اے اس بُرے وقت میں ان کے کام آ گئے ورنہ محکمے کی وہ درگت بنتی کہ ایک عام آدمی بھی تماشا دیکھتا۔

اے ایس پی صاحب اپنے آفس پہنچے تو اُن کا چہرہ خاصا بجھا بجھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس بات کا تو انہیں یقین تھا کہ عنایت شاہ کے وہاں سے ہٹ جانے کے بعد اس علاقے سے ہیروئن کی کھیپ آسانی سے گزر گئی ہو گی ــــ یوں بھی عنایت شاہ کے ساتھیوں نے جس طرح کار کی تلاشی لی تھی اے ایس پی کا حکم انہوں نے ہرگز نہیں دیا تھا۔

عنایت شاہ کو اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ "صاحب بہادر" آج کل کے ہی مہمان ہیں کیونکہ اس نے اخبار نویسوں کو تھانے میں تصاویر بناتے ایک دیوار کے پیچھے چھپ کر دیکھ لیا تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ تصویروں میں اس کی شکل ہرگز دکھائی نہ دے اور اس میں کامیاب بھی رہا۔

عنایت شاہ اس میدان کا پُرانا کھلاڑی تھا اور جانتا تھا کہ اخبار والے جس کام میں ہاتھ ڈال دیں اُسے سرے چڑھا کر ہی دم لیتے ہیں۔

"سر جی ــــ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ اس علاقے میں اس طرح کا کرائم نہیں ہو رہا یہاں تو بس معمولی چوری چکاری ...."

اس نے اپنی دانست میں اے ایس پی صاحب سے اظہارِ ہمدردی کیا تھا لیکن جیسے ہی انہوں نے نظریں اُٹھا کر عنایت شاہ کی طرف دیکھا اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

"ٹھیک ہے سر ــــ او۔ کے سر!"

وہ ایڑیاں بجا کر دفتر سے باہر نکل گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اے ایس پی صاحب نے بادلِ نخواستہ ایک ہفتہ رخصت کی درخواست لکھی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایس ایس پی نے اُنہیں بتا دیا تھا کہ اُنہیں کس شہر میں جانا ہے۔ فی الوقت وہ اپنے آبائی گھر جانا چاہتے تھے جس کے بعد ہی آگے کا پروگرام بناتے۔ ایک ماہ پہلے اُن کی شادی ہوئی تھی اور ابھی چند روز پہلے ہی انہیں ڈھنگ کی رہائش میسر آئی تھی جب انہیں پھر بوریا بستر سمیٹ کر جانا پڑا۔

بوجھل قدموں سے وہ اپنے گھر میں داخل ہوئے ابھی تک انہوں نے اپنی نوبیاہتا بیگم کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

اُن کی بیگم نے پھولوں کا ایک "بوکے" اور لفافہ اُن کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ——"

اے ایس پی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"معلوم نہیں تھوڑی دیر پہلے کسی نے پہنچایا تھا کسی طالب صاحب نے بھیجا ہے۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں آرہی کہ کس لیے بھیجا ہے۔ شاید کوئی سرپرائز ہو"

اُن کی بیگم نے کہا۔

اے ایس پی صاحب جانتے تھے اس میں کیا "سرپرائز" ہو سکتا ہے لیکن وہ اپنی پریشانی میں اپنی بیوی کو شامل نہیں کرنا چاہتے تھے —— !

اُن کا واسطہ بڑے ہی کمینے اور گھٹیا انسان سے پڑا تھا جو قدم قدم پر اُنہیں زچ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اے ایس پی صاحب نے لفافہ کھولا جس میں سے مختصر سی تحریر برآمد ہوئی۔

"تبادلہ مبارک —— امید نہیں کہ اب دوبارہ کبھی اس شہر میں ملاقات ہو سکے۔"

ایک زہریلی مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر چپک کر رہ گئی۔

وہ جانتے تھے کہ طالب کمار اذیت پسند ذہنی مریض ہے اور اب اس طرح کی گھٹیا حرکتیں کر کے انہیں اپنی اہمیت جتلانا چاہتا ہے۔

"کیا ہے یہ ——؟"

بیگم صاحبہ نے اُنہیں بظاہر مسکراتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"بھئی میں نے کہا ناں کہ سرپرائز تھا —— دراصل میں پچھلے چند دنوں سے اس شہر سے بہت تنگ آ گیا تھا۔ دن رات ڈیوٹی نے تھکا ڈالا ہے۔ کچھ وقت تو اپنی گرہستی کے لیے نکالنا چاہیے ناں —— سو میں نے ایک دو دوستوں کو تبادلے کے لیے کہہ دیا تھا —— اور جناب آج ہماری درخواست منظور ہو گئی —— اب ایک ہفتے کی چھٹیاں پھر دوسرے شہر میں تبادلہ ——"

انہوں نے بظاہر اپنی بات کے خاتمے پر قہقہہ بھی لگایا تھا۔

لیکن ——

بیگم صاحبہ نے اس کھوکھلے قہقہے کی اصلیت کو جان لیا تھا۔

"کمال ہے بھئی۔ چُپ چاپ فیصلہ کر لیا اور اس پر عمل بھی کروا لیا۔ کل تک تو آپ اس شہر کی تعریف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے اور آج —— خیر! آپ جیسے افسروں کا موڈ بدلتے کچھ دیر تو لگتی نہیں۔"

دونوں نے اکٹھے قہقہہ لگایا تھا۔ پھر وہ روزمرہ کے کام میں مشغول ہو گئے۔ رات دیر گئے تک دونوں میاں بیوی ٹی وی دیکھتے رہے جس کے بعد دونوں سونے کے لیے چل دیے۔

صبح سے چونکہ اے ایس پی صاحب رخصت پر جا رہے تھے اس لیے انہیں کچھ جلدی بھی نہیں تھی۔ گھر کے سامان کی پیکنگ کے لیے انہوں نے اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آبائی گھر فون کر کے وہاں سے اپنے گھریلو نوکر کو بلوا لیا تھا جسے اس کام کا خاصا تجربہ تھا کیونکہ ان کے والد اور بھائی بھی پولیس آفیسر ہی تھے جن کے تبادلے اور سامان کا لانا لے جانا لگا رہتا تھا۔

اے ایس پی صاحب کی کوشش یہی تھی کہ جیسے بھی ممکن ہو اپنی نو بیاہتا بیگم کو اپنے غم میں شریک نہ کریں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آج کے واقعات کا علم اُسے ہو۔

صبح وہ خلافِ معمول دیر تک لمبی تان کر سوئے رہے۔ جب اُٹھ کر غسل خانے کی طرف جانے لگے تو اُن کی بیگم نے بتایا کہ گھر کے باہر شاید کوئی واقعہ ہو گیا ہے کیونکہ ڈیوٹی کرنے والے گارڈ نے کچھ دیر پہلے اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اُس نے بیگم صاحبہ کو کچھ نہیں بتایا۔ بس یہ کہا تھا کہ جیسے ہی صاحب بیدار ہوں اُسے بُلا لیں۔

"خیریت ــــ میں دیکھتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنے شبِ خوابی کے لباس ہی میں باہر آ گئے۔

اُن کی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے پولیس کھڑی تھی اور سڑک کے دوسرے کنارے مجمع اکٹھا ہوا تھا یوں لگتا تھا جیسے پولیس نے زبردستی انہیں پیچھے ہٹا دیا ہو۔!

اے ایس پی صاحب کو آتے دیکھ کر پولیس ملازمین کے ہاتھ تعظیم کے لیے بلند ہو گئے۔

"کیا ہے علم الدین ــــ کیا واقعہ ہوا ہے ــــ؟"

انہوں نے اپنے ڈیوٹی گارڈ سے دریافت کیا۔

"سر ــــ صبح جب میں نے معمول کے مطابق مین گیٹ کھولا ہے تو ایک

لاش قالین میں لپٹی گیٹ کے سامنے دھری تھی۔ میں نے جناب کو جگانا مناسب نہیں جانا۔ مقامی تھانے کو فون کر دیا تھا ــــ"

"ہوں ــــ" کہتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور پولیس کے ایک جوان کو لاش کے چہرے پر پڑی چادر ہٹانے کا حکم دیا۔

لاش پر نظر پڑتے ہی ان کا دل دھک سے رہ گیا۔

یہ بے چارہ ریاض ڈرائیور تھا۔

ان کا انتہائی قابل اعتبار مخبر جس کی اطلاعات پر وہ تین انتہائی کامیاب چھاپے مار کر لاکھوں روپے کی ہیروئن برآمد کر چکے تھے۔

کل رات بھی اُسی کی اطلاع پر انہوں نے ناکہ لگایا تھا۔

اے ایس پی صاحب کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ یہ بہت عظیم شخص تھا جس نے اپنی جان پر کھیل کر قانون کی مدد کی تھی۔ اس نے اے ایس پی صاحب کو بتایا تھا کہ وہ جوان بہن اور بوڑھی ماں کا بیٹا ہے جن کی پولیس نے اس کی موجودگی میں تھانے میں بے عزتی کی تھی۔

لیکن ــــ

اس کے باوجود اس کا ایمان لا اینڈ آرڈر سے نہیں اُٹھا تھا اور آج بھی وہ ایک محبِ وطن شہری کی حیثیت سے پولیس کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار تھا۔

"اُف میرے خدایا ــــ یہ تو بہت ظلم ہوا۔"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

"ضروری کارروائی مکمل کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو ــــ"

انہوں نے مقامی پولیس انچارج کو حکم دیا اور بوجھل قدموں سے اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈرائنگ روم میں ڈھیر ہو گئے۔

"کیا ہوا ۔۔۔ ؟ کیا بات ہے ۔۔۔ ؟"

اُن کی بیگم نے اے ایس پی صاحب کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ۔ کچھ نہیں ۔ گھر کے باہر ہمارے ایک انتہائی اہم مخبر کی لاش موجود ہے۔ اُس کے ساتھیوں نے شاید شک گزرنے پر اُسے قتل کر کے ہماری بے بسی کا مذاق اُڑانے کے لیے گھر کے سامنے پھینک دیا ہے"

وہ اپنی بیوی سے کہے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر کب تک اُسے لاعلم رکھتے۔

"آپ ہاتھ لیجئے ۔۔۔ میں چائے لاتی ہوں ۔۔۔"

اُن کی بیگم ذمہ دار خاتون تھیں اور ساتھ ہی احساس ہو گیا تھا کہ مجرموں نے اُن کے خاوند کو کتنا زبردست ذہنی دھچکا لگایا ہے۔

اے ایس پی صاحب باتھ روم سے باہر نکلے تو ایس ایس پی صاحب ڈرائنگ روم میں اُن کے منتظر تھے۔

"کون ہے یہ ۔۔۔ ؟"

انہوں نے اے ایس پی صاحب کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"سر! یہی تھا "وائٹ فلاور" ۔۔۔ ہمارا ۔۔۔ اہم ترین سورس۔ اس کی اطلاعات پر ہم نے تین کامیاب کارروائیاں کی تھیں اس کی اطلاع پر کل ناکہ بندی کی تھی شاید دشمن کو علم ہو گیا اُس نے ایک ہی وقت میں دو شکار کھیل لیے ۔۔۔ میرا بدلہ اور اِس بے چارے کا قتل ۔۔۔" اے ایس پی صاحب نے کہا۔

"اوہ مائی گاڈ ۔۔۔ یہ ریاض ہے ۔۔۔ ویری سیڈ ۔۔۔ ویری سیڈ"

ایس ایس پی صاحب کفِ افسوس ملنے لگے۔

بالے شاہ

ایم این اے میاں صاحب کو اے ایس پی سلیم باجوہ کی تبدیلی کی خبر ان کے ایک خاص مخبر نے دی تھی۔!

اپنے مخبر میاں صاحب نے پولیس اور انٹیلی جنس میں رکھے ہوئے تھے۔

یہ دراصل بالے شاہ کا کمال تھا۔ بالے شاہ بلا کا ذہین تھا۔

بالکل پولیس کی طرح کام کرنے والا، سابقہ پولیس انسپکٹر اقبال شاہ جو آج بالے شاہ کے نام سے مشہور تھا۔ گھر کا ایسا بھیدی تھا جو موقعہ ملنے پر فوراً لنکا ڈھا دیتا۔ اس نے اپنے مکروہ دھندے کی شروعات پولیس ملازمت سے ہی کی تھی۔

اُن دنوں وہ اے ایس آئی تھا جب اس کی آنکھوں کے سامنے شہر کے بڑے بڑے منشیات فروشوں کو لے دے کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اے ایس آئی اقبال شاہ پولیس اکیڈمی سے واپس لوٹا تو اس کے دل و دماغ میں بڑے بڑے خواب انگڑائیاں لے رہے تھے۔ اُس نے اپنی دانست میں معاشرے سے جرائم کی بیخ کنی کا بیڑا اکیلے ہی اُٹھا لیا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ ضرورت سے زیادہ کارکردگی دکھانے لگا تھا۔

اُس نے اپنے تھانے کی حدود میں جوئے اور منشیات فروشی کے اڈوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے قلع قمع کا عہد کر رکھا تھا۔ اس روز جب وہ مقامی ایم پی اے کے خاص چمچے کو سارے بازار میں رسوا کرنے کے بعد تھانے میں لایا تو زندگی میں پہلے بھرپور جھٹکے سے دوچار ہوا۔

"اقبال شاہ اپنی اوقات سے آگے نہ بڑھو ـــــ اتنا اونچا اُڑو گے تو منہ کے بل زمین پر گرو گے اور ساری زندگی اُٹھ نہ سکو گے۔ میں نے تمہیں کہہ دیا تھا کہ میری اجازت کے بغیر تم کہیں چھاپہ نہیں مار سکتے ـــــ پھر تم نے۔۔۔؟"

ایس ایچ او جو اپنے کمرے کے باہر آرام دہ کرسی پر بیٹھا ایک ملازم سے اپنی ٹانگوں کی مالش کروا رہا تھا ایم پی اے صاحب کے چمچے کی شکل دیکھتے ہی اقبال شاہ پر برس پڑا۔

"لیکن سر! میں نے اسے رنگے ہاتھوں۔۔۔۔!"

"بھاڑ میں گئے تم اور تمہارے رنگے ہاتھ ـــــ"

ایس ایچ او نے اقبال شاہ کی بات غصے سے کاٹتے ہوئے اسے قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اقبال شاہ جانتا تھا کہ اس تھانے کا ایس ایچ او، ڈی آئی جی کا خاص منہ چڑھا ہونے کے علاوہ ذاتی طور پر بڑے اثر و رسوخ کا مالک ہے۔ شہر کے قریباً تمام وی آئی پیز سے اُس کے خصوصی مراسم تھے۔ شاید ہی شہر کی کوئی ایسی تقریب ہوتی تھی، جہاں اس کی شمولیت ضروری نہ سمجھی جاتی ہو۔

"معاف کرنا حاجی صاحب ـــــ نئے نئے رنگروٹ ہیں۔ خدا جانے ان لوگوں کو اس محکمے میں کون بھرتی کر لیتا ہے۔"

اس نے مقامی ایم پی اے کے چمچے سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"اوئے موج دین ـــــ حاجی صاحب کے لیے بوتل منگوا۔"

اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا اور اقبال شاہ کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی ـــــ آپ کوئی امریکن پولیس میں کام نہیں کرتے۔ جاؤ! اور اپنے دماغ کو ٹھنڈا کرو ـــــ پولیس کی نوکری بچوں کا کھیل نہیں ـــــ ایسی حرکتیں کہانیوں اور فلموں میں اچھی لگتی ہیں عام زندگی میں نہیں ـــــ جاؤ شاباش آرام کرو۔"

"بھٹی صاحب ـــــ کوئی بات نہیں ـــــ نوجوان آدمی ہے خون کچھ زیادہ ہی گرم لگتا ہے۔ کوئی بات نہیں جلدی سمجھ جائے گا۔"

حاجی صاحب نے جنہیں لے ایس آئی اقبال شاہ گھسیٹتے ہوئے تھانے تک لایا تھا اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

اقبال شاہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمین پھٹتی اور وہ اس میں سما جاتا۔

چپ چاپ سر جھکائے وہ اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ رہا۔

"شاہ جی ـــــ ان لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں ـــــ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بھٹی صاحب کے حکم کے بغیر کوئی کارروائی نہ کریں ـــــ شاہ جی آپ سید بادشاہ ہیں آپ کو ابھی پولیس محکمے کا علم نہیں ہوا۔ جو کچھ پڑھایا اور بتایا جاتا ہے اس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ـــــ!"

حوالدار رحم علی نے کہ جس کی ایک عمر اس دشت کی سیاحی کی نذر ہو گئی تھی اقبال شاہ کی اشک شوئی کرتے ہوئے کہا۔

اقبال نے پہلی مرتبہ شکست نہیں مانی تھی ـــــ!

اس نے دوبارہ حاجی صاحب کو گھیرا اور اس جرم کی پاداش میں اس کا

تبادلہ پولیس لائن میں کر دیا گیا۔

پولیس لائنز کی زندگی تھانے سے بالکل الگ نوعیت کی تھی۔

شہر میں سیاسی ابتری تھی اور آئے روز جلسے جلوس اور ہنگامہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ یہاں اقبال شاہ کو "مارا ماری" کے لیے مختص کر دیا گیا۔

کبھی طلباء کے جلوس پہ لاٹھی چارج ——

کبھی خواتین سے پنجہ آزمائی ——

اور کبھی نام نہاد سیاست دانوں سے گالیاں تھپڑ کھانے ——

ایسے ہی ایک جلوس میں جب اقبال شاہ نے ایک ترقی پسند خاتون کو جس نے اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی تھی ہاتھ پکڑ کر اس حرکت سے روکنا چاہا تو عین اُن لمحات میں مقامی اخبار کے فوٹوگرافر نے اس کی تصویر کھینچ لی۔

اگلے روز جب یہ چار کالمی تصویر اخبار کے صفحہ نمبر ۲ پر چھپی تو اقبال شاہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

اس تصویر کے نیچے یہ کیپشن جمایا ہوا تھا کہ مقامی ڈی ایس پی کے حکم پر پولیس والے خواتین کی "عزت افزائی" کر رہے ہیں۔

اقبال شاہ کی تصویر اتنی نمایاں تھی کہ لائن میں موجود قریباً ہر دوسرے افسر نے اسے طنزاً "مبارکباد" اور "اگلے عہدے" پر ترقی کی "خوشخبری" سنا دی تھی۔

اور اقبال شاہ کی ترقی بھی ہو گئی۔

اُسے لائن سے "لائن حاضر" کر دیا گیا۔ مرے پر سو درے کہ پھر بیچارے کو "معطل" بھی ہونا پڑا۔

دو ماہ تک افسران کی منت سماجت اور "جوتم بیزار" کے بعد بالآخر اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علاقے کے ایم این اے کی سفارش پر اُسے بحال کرتے ہوئے ایس پی صاحب نے کمال شفقت سے اس کا تبادلہ بھی دوسرے تھانے میں کر دیا۔

اب اقبال شاہ کو خاصی سمجھ آ چکی تھی۔

اس نے دیکھ لیا تھا کہ اکیلا اے ایس آئی انقلاب برپا نہیں کر سکتا البتہ نوکری سے کسی بھی وقت ہاتھ دھو سکتا ہے۔

○

اُس کا آغاز ہی بڑا بھیانک تھا ——

اپنے عہدے کا چارج لینے کے بعد وہ سیدھا "حاجی صاحب" کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ گو کہ اس کا تعلق دوسرے تھانے سے تھا جس کی حدود میں "حاجی صاحب" کا علاقہ نہیں آتا تھا۔

لیکن ——

اس مرتبہ وہ کسی اور ارادے سے آیا تھا۔

"سناؤ بھئی اقبال شاہ —— کیسے ہو۔ ہتھکڑی تو ساتھ لائے ہو گے۔"

حاجی صاحب نے اُسے بھلایا نہیں تھا۔

"نہیں حاجی صاحب —— میں تو اپنی گستاخی کی معافی مانگنے آیا ہوں۔"

اقبال شاہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اوئے نہیں یار —— یہ اونچ نیچ تو ہمارے دھندے میں ہوتی رہتی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے حاجی صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور اس کی کمر میں ہاتھ دے کر اسے اپنے خاص کمرے میں لے آئے۔ یہاں موجود باقی لوگوں کو حاجی صاحب نے اشارے سے باہر جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

حاجی صاحب کو اپنے کاروبار کی وسعت کی فکر دامنگیر تھی اور اقبال شاہ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاجی صاحب کی "آشیرواد" درکار تھی۔ جب اس نے حاجی صاحب کو بتایا کہ وہ یہاں ایک گاہک کی حیثیت سے آیا ہے تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔

"میں پہلی مرتبہ اُدھار لوں گا ___ دوبارہ کبھی نہیں ___"

اقبال شاہ اے ایس آئی نے حاجی صاحب سے کہا۔

"اقبال شاہ ___ میں اُدھار کا قائل ہی نہیں ہوں ___ اُدھار تو لوگوں کی محبت کی قینچی ہوتا ہے۔ میں تو "سانجھے داری" کو مانتا ہوں ___ مال ہمارا ___ محنت تمہاری اور حصہ آدھا آدھا ___"

حاجی صاحب نے کہ نحوست جن کے چہرے پر مستقل بسیرا رکھتی تھی۔ نیا مُرغا پھنستے دیکھ کر اپنے پَر پھیلائے۔

"ٹھیک ہے حاجی صاحب ۔ آپ مجھے بہرصورت اپنا وفادار پائیں گے۔"

اقبال شاہ نے بڑی نیازمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اقبال شاہ ___ اگر ہم سے بنا کر رکھو گے تو کوئی تمہاری ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ جب، جہاں اور جتنا مال چاہو تمہیں ملے گا اور یہی نہیں۔ وقت پڑنے پر ہم بھی تمہارے کام آئیں گے۔ لیکن یہ تعاون دوطرفہ ہونا چاہیے ___"

حاجی صاحب نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اے ایس آئی اقبال شاہ نے اپنے تھانے میں دو تین روز ہی میں اپنے کام کے آدمی تلاش کر لیے تھے۔

اُس کا پہلا شکار تھا سپاہی اللہ دتہ ___!

سپاہی اللہ دتہ کو پولیس ملازمت کے دوران ہی نشے کی لت لگ گئی تھی اور حال ہی میں اس نے ہیروئن پینا شروع کر دی تھی۔ اُس کی ڈیوٹی عموماً تانگہ سٹینڈوں پر لگتی تھی جہاں وہ تانگے والوں سے ایک ایک

دو دو روپے اکٹھے کر کے اپنے لیے ایک دو سگریٹوں کا خرچہ نکال لیا کرتا تھا۔

لیکن ___

اب کچھ دنوں سے اُس کی طلب بڑھنے لگی تھی جب کہ "وسائل" بڑے "محدود" تھے۔ وہ پولیس کا معمولی کانسٹیبل تھا یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ "کار خاص" میں ہونے کی وجہ سے وہ ایس ایچ او کی خدمت کا کوئی نہ کوئی موقعہ ڈھونڈھ نکالتا تھا ورنہ اس کا تبادلہ اگر پولیس لائنز میں ہو جاتا تو نوبت شاید خودکشی تک پہنچ جاتی۔

جب اے ایس آئی اقبال شاہ نے چارج سنبھالنے کے دوسرے روز اُسے اپنے کمرے میں طلب کیا تو اللہ دتہ گھبرا گیا۔

"اللہ دتے گھبرانے کی بات نہیں ___ مجھ سے کچھ چھپانے کی بھی ضرورت نہیں ___ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے اپنے تین چار سگریٹوں کا خرچہ نکالنا مشکل نہیں رہا ___ تم بال بچے دار آدمی ہو۔ جس روز تمہارا تبادلہ لائن میں ہو گیا تو بھوکے مر جاؤ گے۔ اگر تم چاہو تو نہ صرف تمہارا خرچہ نکل آیا کرے گا بلکہ تمہاری تنخواہ سے پانچ چھ گنا تنخواہ تمہیں ایک ہفتے میں مل جایا کرے گی۔"

اقبال شاہ نے اس کے سامنے ہوس کا دانہ پھینکا اور سپاہی اللہ دتہ اس کے جال میں پھنس گیا۔

"شاہ جی۔ آپ جانی جان ہیں۔ آپ سے کچھ چھپا نہیں۔ سرکار جو خدمت میرے ذمے لگائیں گے میں اس کے لیے دل و جان سے حاضر ہوں ___"

اس نے اقبال شاہ کے پاؤں پکڑ لیے تھے اور اب اس کی ٹانگیں بھی دبانے لگا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اللہ دتہ ایک بات ذہن نشین کر لینا ـــــ یہ موج میلہ تمہیں مفت میں کروا رہا ہوں۔ لیکن کسی مرحلے پر اگر تمہاری زبان پھسل گئی تو کتے کی موت مارے جاؤ گے اور تمہاری دونوں جوان بیٹیاں ۔۔۔"

"بس بس شاہ جی ـــــ میں کوئی بچہ نہیں ـــ ہر بات سمجھتا ہوں۔ دس سال سے پولیس میں جھک مار رہا ہوں جناب ـــــ"

اللہ دتہ نے اقبال شاہ کی بات درمیان میں سے کاٹ دی تھی جو اقبال شاہ کہنے جا رہا تھا اُس کے تصور ہی سے وہ خوفزدہ تھا ـــــ

اللہ دتہ سے زیادہ اس تلخ حقیقت سے کون باخبر تھا کہ اس کی جوان بیٹیاں بھی ہیں۔

"ٹھیک ہے ـــــ تم جانتے ہو اس علاقے میں کتنے پینے والے نوجوان ہیں۔ آج کے بعد سے انہیں مال تم سپلائی کیا کرو گے۔ کیونکہ آج کے بعد اس علاقے میں تمہارے علاوہ اگر کسی اور نے "جہاز چلانے" کی کوشش کی تو میں اس کی ہڈیاں اپنے ہاتھوں سے توڑ دوں گا۔"

اقبال شاہ کا لہجہ اس لمحے خود اقبال شاہ کے لیے اجنبی تھا۔

اللہ دتہ نے پہلے ہی دن آدھا کلو مال صاف کروا دیا۔

اے ایس آئی اقبال شاہ نے جان لیا تھا کہ کون سی پارٹی اس علاقے میں کام کر رہی ہے۔ حاجی صاحب کے تعاون اور اپنی دھونس سے اس نے ایک خاص علاقے میں دوسرے کسی بھی منشیات فروش کا داخلہ ناممکن بنا دیا تھا ـــــ اب یہاں اس کا مال فروخت ہوتا تھا۔

ہیروئن پینے والوں کو معلوم تھا کہ اللہ دتہ کون ہے ـــــ؟

اس سے زیادہ محفوظ ڈیلر انہیں کہاں میسر آ سکتا تھا۔ اللہ دتہ نے انہیں احساس کروا دیا تھا کہ کوئی مائی کا لال اُن کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا ـــــ اس نے بے ایمانی کے سارے سبق اپنی ملازمت میں پڑھ لیے تھے۔

اگر دیکھتے ہی دیکھتے اقبال شاہ لاکھوں میں کھیلنے لگا تھا تو سپاہی اللہ دتہ نے بھی کچھ کم ہاتھ نہیں دکھلائے تھے جہاں اس کا اپنا سینکڑوں روپے روزانہ کا نشہ پورا ہو رہا تھا وہاں وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی اولاد کے لیے بھی حرام جمع کر رہا تھا۔

ہوس اور حرام کاری نے اُسے اندھا کر دیا تھا۔

اُس نے اب ایک کی دو اور پھر تین پڑیاں بنانی شروع کر دی تھیں اور جب دیکھتے ہی دیکھتے دو ماہ میں ہیروئن پینے والے پانچ نوجوان اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تو اُن کے والدین کی آہ و بکا نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو بھی "ایکٹو" ہونے پر مجبور کر دیا۔

ایس پی نے جو حسنِ اتفاق سے انتہائی ایماندار اور دردِ دل رکھنے والے آفیسر تھے اس صورتِ حال کا بہت سخت نوٹس لیا اور اپنے خصوصی مخبروں کا جال چاروں طرف پھیلا دیا ـــــ جلد ہی اُن تک یہ اطلاع بھی پہنچ گئی کہ اس حرام کاری کا منبع کہیں اور سے نہیں بلکہ مقامی تھانے سے پھوٹتا ہے۔

اس سے پہلے کہ اُن کی افسری کو خطرات لاحق ہو جائیں انہوں نے اپنے ایک قابلِ اعتماد ڈی ایس پی کو تحقیقات پر مامور کر دیا جس نے دوسرے ہی دن رنگے ہاتھوں سپاہی اللہ دتہ کو پکڑ لیا۔

اللہ دتہ نے دو جوتے بھی نہیں کھائے تھے کہ اے ایس آئی اقبال شاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا نام دے دیا۔

اقبال شاہ کو حالات اور وقت نے بہت کچھ لکھا پڑھا دیا تھا۔

اس نے اپنا دھندہ ڈیڑھ سال تک بڑی کامیابی سے چلایا تھا اور اب لاکھوں کی آسامی بن چکا تھا۔ اسے اب ملازمت کی فکر ہرگز نہیں تھی نہ ہی وہ اب یہ "دو ٹکے کی نوکری" پسند کرتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ "حاجی صاحب" جیسی بلائیں قانون اور انصاف کو پلک جھپکنے میں نگل جائیں گی۔

لیکن ——

وہ اس سے بھی آگے جانا چاہتا تھا۔

پولیس انکوائری کے دوران ہی اُس نے اپنے ایس ایچ او، ڈی ایس پی اور چار دیگر ساتھیوں کو اپنے "پارٹنرز" بنا دیا اور اس گروہ کا سرغنہ ڈی ایس پی کو قرار دیتے ہوئے یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگر اس کے خلاف کوئی بھی قدم اُٹھایا گیا تو وہ فوراً پولیس کے ذریعے یہ بات اخبارات تک پہنچا دے گا۔

اس کی "بلیک میلنگ" اور ارادے کی مضبوطی نے افسران میں تشویش کی لہر دوڑا دی۔ جسمانی ریمانڈ میں کسی نے اس پر انگلی اُٹھانے کی جرأت نہیں کی اور اُسے جوڈیشل لاک اپ میں بھیج دیا۔

پولیس والے اپنے ہی ایک ساتھی کے قابو آ گئے تھے۔

لیکن ——

انہیں یہ بلا کسی نہ کسی کے گلے تو منڈھنی ہی تھی۔

سپاہی اللہ دتہ قربانی کا بکرا بن گیا اور سارا کیس اس پر ڈال کر عدالت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اے ایس آئی اقبال شاہ کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اُس کا جرم یہ بتایا گیا کہ اُسے ایک مرحلے پر اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ اللہ دتہ یہ گھناؤنا کام کر رہا ہے لیکن اس نے آنکھیں بند رکھیں۔

یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں تھا جس پر اقبال شاہ کو قرار واقعی سزا ملتی۔ پہلے مرحلے پر وہ ضمانت پر رہا ہو گیا اور دوسرے مرحلے پر اس کے وکیل نے اعلیٰ افسران کی بدنیتی اور اقبال شاہ کے تئیں ان کے متعصبانہ رویے کا ڈھنڈورا پیٹ کر اپنے مؤکل کو صاف بری کروا لیا۔

سپاہی اللہ دتہ پندرہ سال کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا اور بالے شاہ نے "اقبال موٹرز" کے نام سے اپنا کاروں کا شوروم کھول لیا۔

یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے اللہ دتہ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی دونوں بیٹیوں کا بیاہ کروایا اور اس کی بیوی کو بھی خرچے کے لیے باقاعدگی سے ہر ماہ کچھ نہ کچھ بھیجتا رہا۔

اللہ دتہ کو ہیروئن فروشی سے زیادہ ہیروئن نوشی کا شوق تھا۔

"خصوصی کیس" ہونے کی وجہ سے اُسے سخت نگرانی میں رکھا جاتا تھا کیونکہ اُسے تین نوجوانوں کی موت کا ذمہ دار سمجھا جا رہا تھا اور پولیس سے اس کا تعلق ہونے کی وجہ سے جیل کے باقی حوالاتی اور قیدی لوگ بھی اس سے نفرت کرتے تھے۔

جیل کی روایت تھی کہ پولیس کا کوئی بھی ملازم بھلے کسی بھی جرم میں جیل میں آئے تو اُس کا "سواگت" مار پیٹ سے کیا جاتا تھا۔ جیل حکام نے اس کی حفاظت کے پیش نظر اسے الگ سیل میں بند کر رکھا تھا۔

یہ جیل کا خاص احاطہ تھا جہاں کوئی نشہ پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیل ملازمین کو اپنے افسرِ اعلیٰ کی طرف سے سخت وارننگ دی گئی تھی کہ اگر کسی نے جیل رولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سپاہی اللہ دتہ کی مدد کرنے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کی تو سخت انجام سے دو چار ہوگا۔ یوں بھی اللہ دتہ کے پاس ان لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے اب بچا ہی کیا تھا۔

"سپیشل کورٹ میں اس کا مقدمہ چلا ——

مہینوں میں مقدمے کا فیصلہ ہو گیا۔

فیصلے کے چند روز بعد ہی وہ بستر سے لگ گیا۔ اب تک کسی نہ کسی طرح اس کی بیوی اس کے لیے جیل کے اندر نشے کا بندوبست کرتی رہی تھی۔

لیکن ——

اب وہ بے چاری بھی اس قابل نہیں رہ گئی تھی نہ اپنے "مجازی خدا" کے لیے اپنی بیٹیوں کا تیار کردہ جہیز بیچنے سے رہی۔ اتنی عقل مند تھی کہ وہ اپنا برا بھلا اور آنے والے حالات کا اندازہ کر سکتی۔

ایک روز جیل ہی میں اللہ دتہ سلاخوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر نشے کی التجائیں کرتا مر گیا ——!

مرنے سے پہلے اس کے لیے باعثِ اطمینان اگر کوئی خبر تھی تو صرف یہ کہ اقبال شاہ نے اس کی دونوں بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کر دیے تھے۔

○

بالے شاہ نے حاجی صاحب سے اپنی دوستی کا آغاز دشمن بن کر کیا تھا۔

لیکن ——

یہ بڑی جاندار "ڈیل" تھی۔

دونوں اب برابر کے پارٹنر بن گئے تھے۔ کبھی وہ حاجی صاحب کا گاہک تھا اور آج ان کے برابر کی پارٹی بن چکا تھا۔

اس کے پاس بہت کچھ تھا جبکہ حاجی صاحب کے پاس دولت اور اثر و رسوخ

کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ یہ بالے شاہ ہی تھا جس نے حاجی صاحب کو خود کونسلر بننے کی ترغیب دی تھی۔

اور ——

وہ دن بھی آ گیا جب حاجی صاحب کونسلر بن گئے۔ اب کس کی مجال تھی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا۔ حاجی صاحب جو کبھی اقبال شاہ کے ملجا و ماویٰ بنے ہوئے تھے اب قدم قدم پر بالے شاہ کے محتاج ہو کر رہ گئے تھے

پھر وہ دن بھی آ گیا جب ان کی حیثیت بالے شاہ کے سامنے بالکل ایسی ہی ہو کر رہ گئی جیسے کبھی بالے شاہ کی اُن کے سامنے تھی۔

بالے شاہ کی ایم این اے میاں صاحب سے دوستی مفادات کی دوستی تھی۔

دونوں کا بزنس ایک تھا۔

لیکن ——

میاں صاحب بھی حاجی صاحب کی طرح قدم قدم پر بالے شاہ کے محتاج رہتے تھے۔ الیکشن میں دھاندلی کے لیے —— ہنگامہ آرائی کے لیے —— اپوزیشن کے جلسے جلوسوں میں غنڈہ گردی کے مظاہرے کے لیے اور سرکار دربار میں اپنے مخالفین کا سر کچلنے کے لیے انہیں بہرحال بالے شاہ کی ضرورت تھی۔

بالے شاہ نے آج تک طالب کمہار سے ملاقات نہیں کی تھی۔

یہ اس کے خلافِ شان تھا کہ وہ ایسے نالی کے کیڑوں سے دوستیاں نبھاتا پھرے۔ وہ اب بین الاقوامی شہرت کا حامل سمگلر تھا جس سے متعلق یورپ اور امریکہ کی حکومتیں شکوک و شبہات کا شکار ہوا کرتی تھیں۔

لیکن ——

جس کے خلاف کوئی ثبوت کسی حکومت کے پاس نہیں تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بابے شاہ نے گزشتہ تین چار ماہ سے محسوس کیا تھا کہ ایم این اے میاں صاحب طالب کمہار کا ضرورت سے زیادہ ہی دست نگر رہنے لگا تھا۔

بابے شاہ زمانہ ساز آدمی تھا۔

ایم این اے میاں صاحب نے تو اُسے برسبیلِ تذکرہ اس طریقِ واردات سے آگاہ کیا تھا۔ جس کے ذریعے اس نے طالب کمہار کی مدد سے اے ایس پی سلیم باجوہ کو شہر بدر کروایا تھا۔

لیکن ___

اس گفتگو میں کچھ ایسے موڑ بھی آئے تھے جن پر بابے شاہ اچانک ٹھٹک کر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ یہ طالب کمہار کہیں اُن کے لیے خطرے کی گھنٹی ہی نہ بن جائے۔

محض یہ خبر کہ اُسے میاں صاحب اور بابے شاہ کے "تعلقاتِ کار" کی خبر ہو گئی ہے۔ اُسے چونکا دینے کے لیے کافی تھی۔

"بڑا ہوشیار آدمی لگتا ہے کہیں آگے چل کر تمہیں بھی ...!"

اُس نے اچانک ہی میاں صاحب کی بات کاٹ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور میاں صاحب کے لیے اشارہ ہی کافی تھا۔

"شاہ جی ___ مجبوری ہے ___ ہم نے بڑا وقت اکٹھے گزارا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ یہ حرام خور اتنا آگے بڑھ جائے گا۔"

اُس نے اپنی دانست میں صفائی پیش کی۔

"میاں صاحب ___ اسے روکیے ___ یہیں روک دیجئے ___ اور ہاں آج کے بعد اُس کی زبان پر کسی بھی حوالے سے کسی بھی محفل میں میرا نام تمہارے تعلق کے حوالے سے نہیں آنا چاہیے ___ میں خود اس بات کا خیال رکھوں گا۔

تم جانتے ہو میاں کہ میں سانپ کے پھن اٹھا کر ڈنک مارنے کا انتظار نہیں کیا کرتا ___ میں سانپ کو پھن اُٹھانے سے پہلے اُس کا سر کچل دینے کا قائل ہوں۔

میری بات سمجھ گئے ناں۔"

"ہاں جی ___ بالکل سمجھ گیا شاہ جی ___ آئندہ آپ کے کانوں تک یہ نام نہیں پہنچے گا۔"

میاں صاحب کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ خدا جانے بابے شاہ کیا کر گزرے۔ واقعی وہ معاملات کی جزئیات پر نظر رکھنے والا شخص تھا ___ اُس کے دماغ میں معمولی سی بات بھی اٹک جاتی تو اُسے انجام تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"را"

امرتسر سے دہلی تک ۶۴۴ کلومیٹر کا فاصلہ اس نے ریل گاڑی میں تیسرے درجے کے مسافر کی حیثیت سے طے کیا تھا۔ اس کی منزل دہلی کے جنوب میں واقع "وسنت وہار" کے مشرقی سیکٹر کا بلاک نمبر ۱۲ تھا ——!

کلدیپ سنگھ نے یہ سفر بظاہر بڑی خاموشی سے طے کیا تھا اور اس بات کا بطور خاص خیال رکھا تھا کہ اُس کے کسی ساتھی کو اس کی روانگی کا علم نہ ہو سکے۔

لیکن ——

وہ نہیں جانتا تھا کہ جن لوگوں سے ملاقات کرنے جا رہا ہے۔ انہوں نے امرتسر ہی سے اس کا تعاقب شروع کر دیا تھا اور دہلی تک وہ سائے کی طرح اس سے چپکے رہتے تھے۔

"وسنت وہار" میں بھارتی انٹیلی جنس "را" کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

یوں تو اس عمارت کا ہر حصہ اپنے اندر اسرار و تحیر کی کئی داستانیں سمیٹے ہوئے تھا۔ لیکن مشرقی سیکٹر کا بلاک نمبر ۱۲ سب سے الگ تھلگ اور انتہائی خاص لوگوں کے لیے مختص تھا۔ یہاں آنے والوں کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔ سوائے اُن کے "کیس آفیسرز" کے اور کسی کو اس بات کی خبر نہیں ہوتی تھی کہ کون آیا اور کون گیا؟

اس بلاک کے دُور دور تک پولیس یا کسی دوسری پیرا ملٹری آرگنائزیشن کو پھٹکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی کیونکہ یہاں آنے والے مہمانوں میں زیادہ تعداد اُن کی تھی جو بھارتی لاء اینڈ آرڈر نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے ریکارڈ میں مفرور اور اشتہاری ہوتے تھے۔

کلدیپ سنگھ کا تعلق بھی اسی قماش کے لوگوں سے تھا۔

"اُس کے سر کی قیمت پانچ لاکھ روپے تھی ——"

اس کا تعلق مشرقی پنجاب میں اپنی آزادی کے لیے سرگرم سکھوں کی تحریک سے تھا اور ہر دوسرے تیسرے مہینے اس کے ساتھ کسی نہ کسی پولیس مقابلے کی خبر اخبارات میں آتی رہتی تھی۔

عموماً بھارتی پولیس کی طرف سے اس کے "پولیس کو چکمہ دے کر" نکل جانے کی خبریں بھی آتی رہتی تھیں۔

کلدیپ سنگھ سے متعلق اگر کوئی حلف اُٹھا کر بھی یہ بات کہتا کہ وہ "را" کا خاص ایجنٹ ہے تو پنجاب کے بیشتر سکھ ایسے شخص کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔

اخبارات کے ذریعے اس کی بہادری اور اپنے دھرم سے محبت کی داستانیں پنجاب کے اکثر گھروں میں پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔

کلدیپ سنگھ نے جب بندوق اٹھائی تھی تب وہ اپنے مشن کے ساتھ واقعی مخلص تھا۔ اس نے دو سال تک اپنی تنظیم کے لیے بہادری کے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے تھے کہ جلد ہی اس کا شمار صفِ اوّل کے سکھ سورماؤں میں ہونے لگا۔

لیکن ——

دو سال بعد جب ایک روز وہ معمول کے مطابق ایک خفیہ ٹھکانے کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی ماں، بیوی اور بہن سے ملاقات کرنے کے لیے جا رہا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ وہ کسی گہری سازش میں پھنسنے والا ہے

وہ اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری سے اس گوردوارے تک پہنچا تھا۔

جس کے ایک کمرے میں اُس نے اپنے عزیزوں رشتہ داروں اور پیاروں سے ملاقات کرنی تھی ——!

پہر رات کا دوسرا پہر تھا ——

اس وقت گوردوارے میں سوائے سیوا داروں اور "گرنتھی" کے اور کوئی موجود نہیں تھا۔

یہ "گرنتھی" ہی دراصل اُن کا خاص آدمی تھا جسے اس روپ میں تنظیم نے گوردوارے میں بٹھا رکھا تھا تاکہ وہ یہاں سیکورٹی والوں کی چالوں پر نظر رکھ سکے اور تحریک آزادی میں سرگرم سکھ نوجوانوں کے رشتہ دار اس کی مدد سے اپنے رشتہ داروں سے یہاں ملاقات کر لیا کریں کیونکہ اپنے گھروں سے میلوں دُور تک اُن کے لیے کوئی بھی جائے پناہ نہیں تھی۔

کلدیپ سنگھ کے پیارے بھی اس گوردوارے تک قریباً پچاس میل کا سفر طے کر کے پہنچے تھے اور انہوں نے یہاں مسافروں کے روپ میں قیام کیا تھا۔

مقامی ریلوے سٹیشن پر ایک پسنجر ٹرین بمشکل پانچ منٹ کے لیے رُکتی تھی، اس کے ذریعے کلدیپ سنگھ یہاں پہنچا تھا اور اب معمول کے مطابق رات ڈھلنے کا منتظر تھا

اُس نے شام سے رات تک کا وقت ریلوے سٹیشن سے ملحقہ کھیتوں میں گزارا تھا۔

یہ چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی آبادی بمشکل چند ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور نزدیک دور کے دیہاتوں کے لیے یہاں کا واحد گوردوارہ یہی تھا۔ اس گوردوارے کو کچھ تاریخی اہمیت بھی حاصل تھی کہ یہاں سکھوں کے کسی گورو صاحب نے قیام کیا تھا۔

اس لیے بھی یہاں معمول سے کچھ زیادہ ہی رونق لگی رہتی تھی۔

گوردوارے کے ایک طرف آشرم بنائی گئی تھی جہاں کبھی کبھی رات کو کوئی "یاتری" قیام کر لیا کرتا تھا۔

گرنتھی کو علم تھا کہ آج کلدیپ سنگھ نے آنا ہے۔ اس کی ماں، بیوی اور بہن کو گرنتھی نے اپنے کمرے ہی میں ٹھہرایا ہوا تھا اور انہیں اپنا فرضی رشتے دار بنایا کرتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا گوردوارے کی پشت پر کھلنے والا دروازہ آج بھی کھلا رکھا تھا کیونکہ کلدیپ سنگھ اسی دروازے سے آتا تھا اور ساری رات یہاں گزارنے کے بعد علی الصبح اسی دروازے سے باہر چلا جاتا تھا۔

اسی طرح نہ تو کوئی اُسے یہاں آتے ہوئے دیکھ سکتا تھا اور نہ کوئی اُسے یہاں سے جاتے ہوئے دیکھ پاتا تھا۔

اُس نے آج بھی معمول کے مطابق پچھلا دروازہ کھولا تھا۔

دروازے کی کھڑکی سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ اندر اس کے گھر والے موجود ہیں۔

حسبِ معمول اس نے اطمینان سے دروازہ کھولا۔

لیکن ——

کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر وہ لرز کر رہ گیا ——!

کمرے کے عین وسط میں گرنتھی جی کی لاش پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں ایک سیوادار اوندھے منہ پڑا تھا اور باقی دونوں کونوں میں بھارتی پولیس کے کمانڈوز جنہیں "بلیک کیٹس" کہا جاتا تھا اس کی طرف آٹومیٹک رائفلیں اسی طرح سیدھی کیے کھڑے تھے کہ اگر وہ اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی کوشش بھی کرتا تو ایک لمحے میں درجنوں گولیاں اس کے جسم سے پار ہو جاتیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہینڈز اپ"

کلدیپ سنگھ کی شکل دکھائی دیتے ہی انہوں نے للکارا اور اس کے ہاتھ کسی میکانکی عمل کے تابع اُوپر اُٹھتے چلے گئے۔

اچانک ہی دروازے کی پُشت سے ایک کمانڈو نے بجلی کی سی پھرتی سے اُس پر چھلانگ لگائی اور اس سے پہلے کہ کلدیپ سنگھ وہ کرگزرتا جو اس کے ذہن میں موجود تھا اُسے بے بس کر کے رکھ دیا۔

بلیک کیٹس کو علم تھا کہ سکھ حریت پسند اپنی قمیض کے کالر میں ہمیشہ خطرناک زہر چھپا کر رکھتے ہیں اور گرفتاری کی صورت میں محض گردن کی معمولی سی جنبش سے اُسے چاٹ کر خود کو زندگی کے بوجھ سے سبکدوش کر لیتے ہیں کیونکہ بصورت دیگر انہیں جس اذیت ناک موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس سے مر جانا ہزار درجہ بہتر تھا۔

پلک جھپکتے میں پولیس کمانڈو نے اس کی قمیض کا کالر پکڑ کر ایک جھٹکے سے قمیض سے الگ کر دیا تھا۔

اب وہ مکمل بے بس تھا ——!!

"تمہاری ماں، بہن اور بیوی کو ہم نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے —— ان کی طرف سے فکرمند نہ ہونا اور نہ ہی زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کرنا۔ ہمیں اُمید ہے کہ اپنے ایک سال کے بیٹے کی زندگی تمہیں یقیناً عزیز ہو گی —— اپنے ساتھیوں کا حشر تو تم نے دیکھ لیا ہے ——"

اُن میں سے ایک نے کلدیپ سنگھ سے مخاطب ہو کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

کلدیپ سنگھ کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔

گرنتھی اور اس کے سیوادار کی لاشیں اُس کے سامنے پڑی تھیں۔ اُس کے

گھر کی عزت پر درندے قابض تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ کدھر جائے ——؟

صرف موت کا ایک راستہ باقی بچا تھا۔

لیکن ——

اب تو اس پر بھی کلدیپ سنگھ کا اختیار نہیں رہا تھا۔

"ہمارے پاس تمہارے لیے ایک شاندار "ڈیل" موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کسی نے تمہاری بہن یا بیوی کے جسم کو ہاتھ نہیں لگایا —— ورنہ تم تو جانتے ہی ہو کر......"

"گول اور تیکھی آنکھوں والے انٹیلی جنس آفیسر کی بات نے کلدیپ کے جسم میں خون کی بجائے سنسنی دوڑا دی تھی اور اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے منوں وزنی ہتھوڑے سے اس کے دل و دماغ کو کچل کر رکھ دیا ہو۔

"اور ہاں تمہارا ایک سال کا بچہ بھی تو ہے ——"

اُس درندے نے پھر گہرا گھاؤ لگایا۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ ——؟"

کلدیپ سنگھ بے بسی سے چیخ اُٹھا۔

اُس کی ساری مردانگی اپنے ایک سال کے بچے کے لیے ختم ہو گئی تھی۔

وہ جانتا تھا جن لوگوں سے اُس کا واسطہ پڑ گیا تھا یہ انسانی بھیڑیے اس کے بدن سے قطرہ قطرہ لہو نچوڑ لیں گے —— لیکن اُسے مرنے نہیں دیں گے۔

ان بے رحم درندوں سے جو بظاہر انسانی روپ میں اُس کے سامنے موجود تھے کچھ بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ابھی درندگی کا ننگا ناچ اُس کے سامنے ناچنا شروع کر دیتے۔ جس کی ابتدا اُس کی بہن یا بیوی کی آبروریزی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ہوتی۔

کلدیپ سنگھ مر سکتا تھا۔

لیکن ـــــ

اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی عزت تار تار ہو، اس کا تصور بھی محال تھا۔

"یہ ہوئی نا بات!"

اس بھیڑیے نے جو ان کا کمانڈر معلوم ہوتا تھا کلدیپ سے کہا اور اُسے کمرے سے باہر آنے کا حکم دیا۔

دو بندوقوں کی نوک پر اُسے کمرے سے باہر لایا گیا جہاں اب ایک جیپ آن کھڑی ہوئی تھی۔

پلک جھپکنے میں انہوں نے کلدیپ سنگھ کے ہاتھوں کو پُشت پر ہتھکڑی باندھ دی تھی اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُسے جیپ میں پھینک دیا اور جیپ تیزی سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئی۔

اس سفر کا اختتام دو گھنٹے بعد ہوا ـــــ!

کلدیپ سنگھ کی آنکھوں سے پٹی اتری تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندھا ہو گیا ہو بمشکل ایک منٹ بعد وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہوا۔ جہاں اسے لایا گیا تھا وہ ایک بڑا کمرہ تھا جس کے ایک کونے میں اسے ایک بڑی میز کے سامنے بٹھایا گیا تھا جس کے سامنے دو کرسیاں اور دھری تھیں جن پر "را" کے دو آفیسر موجود تھے۔

ان میں سے ایک وہی تھا جو گوردوارے سے یہاں تک اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔

"میرا نام گپتا ہے ـــــ تم نے یقیناً میرا نام سنا ہو گا ـــــ"

خدا جانے وہ اپنا نام صحیح بتا رہا تھا یا غلط ـــــ لیکن کلدیپ سنگھ نے یہ نام متعدد مرتبہ سنا تھا۔

اس کے جو ساتھی پنجاب میں گرفتار ہوئے انہیں کسی نہ کسی مرحلے پر گپتا کے سامنے پیش کیا جاتا تھا جس کے لیے انسانی جسم سے کھال کھینچ کر الگ کر دینا معمول کی بات تھی۔

"میں زیادہ باتیں نہیں کرتا ـــــ کام کی بات کرتا ہوں۔ تمہارے ماں، بہن، بیوی اور بچہ ہماری حفاظت میں رہیں گے۔ ہم انہیں دہلی میں مکان لے کر دیں گے جہاں وہ معمول کی زندگی بسر کریں گے۔ تم لوگ یوں بھی اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہو۔ اپنے ساتھیوں سے کہہ سکتے ہو کہ تم نے اُن کے لیے دہلی میں کوئی محفوظ جگہ تلاش کر لی ہے۔ بظاہر وہ آزاد ہوں گے لیکن ہماری اجازت کے بغیر اپنی جگہ سے موو نہیں کر سکیں گے۔ اُن کی تمام ضروریات زندگی کی ضمانت ہم خود دیتے ہیں۔ تم بھی ان سے آزادانہ ملاقات کر سکو گے۔ تم جانتے ہو میں تمہیں کتنی ناقابل یقین سہولتیں دے رہا ہوں۔ محض اس لیے کہ مجھے تمہاری جوانی پر ترس جانے کیوں رحم آگیا ہے۔ کلدیپ سنگھ تم اپنی جماعت کے ساتھ اسی طرح بندھے رہو گے، لیکن اب خالصتان کے لیے نہیں ہمارے لیے کام کرو گے ـــــ ہاں ہمارے لیے ـــــ ہماری طرف سے کبھی یہ کوشش نہیں ہو گی کہ ایسی کوئی غلطی کی جائے جس سے تمہارے "ڈبل کراس" ہونے کا راز فاش ہو جائے ـــــ اور تم ـــــ تم خود جانتے ہو کہ اس راز کی حفاظت کیسے کرنی ہے۔ اگر تمہارے ساتھیوں کو معمولی سا شک بھی ہو گیا تو وہ تمہیں کتے کی موت مار ڈالیں گے۔ کلدیپ سنگھ تم چاہو تو آسانی سے ہمیں دھوکہ دے کر نکل سکتے ہو لیکن اپنی ماں، بہن، بیوی اور بچے کی قیمت پر ـــــ جب جی چاہے یہ سودا کر لینا۔ بس ایک بات ذہن میں رکھنا کہ ہم "بلاتکار" (آبروریزی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضرور کرتے ہیں لیکن اتنا نہیں کہ چند دنوں میں ہی عورت مر جائے ـــــ وہ کئی سال زندہ رہ سکتی ہے اس عمل سے مسلسل گزرنے کے باوجود زندہ رہ سکتی ہے ہمارے پاس پیش کرنے کے لیے ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔"

"بس کرو ـــ بس کرو ـــ مجھے منظور ہے ـــ منظور ہے ـــ"

کلدیپ سنگھ بے بسی سے چلّا دیا۔

اسے یوں لگا جیسے چند منٹ اگر یہ شخص اسی طرح بولتا رہا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔

"ویل ڈن ـــ شاباش۔ حیرت ہے تم سکھ ہو کر اتنے سمجھ دار ہو ـــ"

اس نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تالی بجائی۔

کلدیپ سنگھ کی ملاقات انہوں نے اس کے پیاروں سے کروا کر ان کے دہلی کے ٹھکانے سے آگاہ کر دیا تھا۔ کلدیپ نے اپنی ستم رسیدہ فیملی کو بتا دیا تھا کہ اب انہیں زندگی کے باقی ایام دہلی ہی میں بسر کرتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا ہے ـــ یہی ایک صورت ہے کہ ان کی عزت اور جان محفوظ رہ سکے۔

اور ـــ

اس کے گھر والوں نے اسے تقدیر مان کر قبول کر لیا تھا۔

○

اگلے روز انہوں نے کلدیپ سنگھ کو واپس بھیج دیا۔

اسے "رابطہ" پیدا کرنے کا طریقہ سمجھا دیا گیا تھا ـــ راز داری کا اتنا اہتمام رکھا گیا کہ کوئی اسے اسٹیشن تک چھوڑنے نہیں گیا تھا۔

اسے یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سرکاری طور پر مفرور ہے۔ اسے دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہے۔ اسے سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ گرفتاری کی صورت میں

ہرگز ہرگز یہ نہ بتائیے کہ وہ ایجنسی کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر اس نے یہ بتایا تو اس کا تو حشر ہو گا سو ہو گا۔ اس کی فیملی کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کی طرف وہ لوگ اشارہ کر چکے تھے۔

بڑے خطرناک لوگ تھے ـــ

برا پھنسا تھا وہ ـــ

اپنی مرضی سے اسے گردن ہلانے کی مہلت بھی نصیب نہیں تھی۔

اگلے دو ماہ میں ان لوگوں نے کلدیپ سنگھ کے ذریعے سکھوں کی زیر زمین تحریک کے پانچ سرکردہ لیڈروں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا ـــ پھر یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔

"را" نے کلدیپ سنگھ کی صورت میں آستین کا ایک ایسا سانپ سکھوں کے درمیان چھوڑ دیا تھا جس نے ایک ایک کر کے درجنوں نوجوانوں کا صفایا کروا دیا۔ اور وہی پولیس کے ہاتھوں بچے تھے جنہوں نے زیر زمین الگ تھلگ پناہ لے رکھی تھی۔

کلدیپ سنگھ کو اپنی بیوی بچے ماں بہن سے ملنے کی مکمل آزادی حاصل ہو گئی تھی اور دہلی پہنچنے کے بعد سے وہ "را" کی حفاظت میں آ جاتا تھا۔

اگلے ہی روز اسے گپتا کی طرف سے پہلی فرصت میں دہلی پہنچنے کا حکم ملا تھا اور اب وہ اس حکم کی تعمیل میں دہلی پہنچا تھا۔ امرتسر ہی سے اس کی نگرانی شروع ہو گئی تھی۔ کیونکہ "را" نے اسے اس مرتبہ نہایت اہم ذمہ داری سونپنے کا پروگرام بنایا تھا اور اس منصوبے کے آغاز سے اختتام تک اس پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت تھی۔

دہلی ریلوے سٹیشن سے وہ سیدھا اپنی بیوی بچوں کی ملاقات کو گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان لوگوں کو بھی شاید پنجاب کی خوفزدہ اور سہمی سہمی زندگی سے یہاں کی پُرآسائش اور محفوظ زندگی زیادہ راس آگئی تھی۔ اور خاصے خوش دکھائی دے رہے تھے۔

"را" والوں نے کلدیپ سنگھ کی طرف سے انجام دیے گئے "کارناموں" کے احترام میں ان کا معیارِ زندگی خاصا بلند کر دیا تھا اور ایک کار بمعہ ڈرائیور انہیں سونپ دی گئی ——— یہ الگ بات کہ اس کار کا ڈرائیور "را" کا ایجنٹ تھا۔ اس طرح وہ لوگ اپنے مجوسوں کی زندگی کے ایک ایک پل سے آگاہ رہتے تھے۔

ابھی تک کلدیپ سنگھ نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی تھی کہ اس کی تنظیم کے لوگوں کا خیال اس طرف جاتا۔

وہ آج بھی اپنی "جتھے بندی" کا کمانڈر اور مقامی سکھ آبادی کی نظروں میں ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔

اپنے گھر میں موجود ٹیلی فون کے ذریعے اُس نے اپنے مقامی باس کو اپنی آمد سے مطلع کیا تھا اور رات کو "را" کی طرف سے ایک کار اُسے لینے آگئی۔

رات کا کھانا اُس نے سیکٹر نمبر ۱۲ میں کھایا۔

آج اُس کے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا تھا اور کھانے سے پہلے بطورِ خاص اُسے "وائن" پلائی گئی۔ اس کی خدمت پر بھی پہلی مرتبہ کسی مرد کے بجائے ایک بھارتیہ ناری کو مامور کیا گیا۔ جس نے چند منٹ کی ملاقات ہی میں کلدیپ سنگھ سے خاصی بے تکلفی پیدا کر لی تھی اور اب اس کے گلے کا ہار بن چکی تھی۔

کلدیپ کو گزشتہ آٹھ دس ماہ میں "را" نے مکمل بے غیرت بنا دیا۔ اپنے ہی بھائی بندوں کو غداری سے گرفتار کرواتے ہوئے پہلے پہل تو اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا تھا۔

لیکن ———

اب تو جیسے اُس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

یوں بھی تحریک اب ایسے موڑ پر آن کھڑی ہوئی تھی کہ بڑے بڑے سُورمے بددل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور کلدیپ سنگھ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو چکا تھا کہ اس نے بہرحال گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔

کرنل گپتا تھوڑی دیر میں وہاں موجود تھا۔

"کلدیپ سنگھ تمہاری کارگزاری سے خوش ہو کر سرکار نے تمہیں بڑے انعام سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم نے اپنے گھر والوں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر اندازہ کر لیا ہوگا ——— اب تم ایک اہم مشن انجام دینے جا رہے ہو۔ اس بات کا خیال رہے کہ اس مشن کی مکمل کامیابی بہت ضروری ہے۔ اگر تم کامیاب رہتے ہو تو اپنی ساری زندگی شناخت بدل کر اطمینان سے عام شہری کی حیثیت سے بھارت کے کسی بھی کونے میں گزار سکو گے اور سرکار تمہیں اگلی زندگی کے لیے خطیر رقم بھی دے گی۔"

کلدیپ سنگھ نے بطورِ خاص نوٹ کیا تھا کہ "را" کی فاحشہ لتا کمرے ہی میں موجود رہی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کوئی اہم ذمہ داری بھی رکھتی ہے۔

"آپ حکم دیجئے گپتا جی ——— پہلے آپ کے کون سے حکم کی تعمیل نہیں ہوئی۔"

اُس نے گپتا کی بات کا جواب بڑے اعتماد سے دیا۔

"شاباش ——— اِدھر آجاؤ ——— تم ذرا رات کے بھوجن وغیرہ کی تیاری کرلو۔"

گپتا نے اُسے اپنے نزدیک بلاتے ہوئے اس کی ساتھی لڑکی کو اشارہ کیا جو کلدیپ کو نخش سا اشارہ کر کے باہر نکل گئی۔

اب گپتا اور کلدیپ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں کے درمیان ایک موڑ سا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ویٹر نے شراب کے جام لا کر رکھ دیے تھے۔

گپتا نے اپنے سامنے رکھا بریف کیس کھولا اور ایک تصویر نکال کر اُسے دکھائی۔ یہ کسی پاکستانی کی تصویر تھی جس میں وہ قیمتی لباس پہنے اکیلا کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ مشہور ایم این اے میاں صاحب ہیں ——"

گپتا نے تصویر کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحب بین الاقوامی سطح پر ڈرگ کے دھندے میں ملوث ہے لیکن اس کے خلاف ابھی تک کوئی ثبوت ہاتھ نہیں آسکا کیونکہ اسے بالائے شاہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ میاں کے کارندے ہمارے ہاں بھی دھندہ کرتے ہیں۔ میں تمہاری ملاقات تھوڑی دیر بعد جوگا سنگھ سے کرواؤں گا۔ جوگا سنگھ سرحدی علاقے کا رہنے والا مشہور سمگلر ہے جو ایم این اے کے ساتھ دھندہ کرتا ہے۔ تم اپنی ذاتی حیثیت میں جوگا سنگھ کے ساتھ سرحد عبور کر کے جاؤ گے اور میاں سے ملاقات کر کے اس سے اپنی تحریک کے لیے اسلحہ حاصل کرو —— میاں کے پاکستان کے علاقہ غیر میں اسلحہ فروخت کرنے والوں سے قریبی تعلقات ہیں اُسے اچھی خاصی آفر دینا —— وہ ضرور تمہارے جال میں پھنسے گا —— تم اسلحہ لاؤ گے اور تمہارا ساتھی جوگا سنگھ ہیروئن لائے گا —— تمہارے ذہن میں صرف ایک بات ہونی چاہیے کہ تم جو ہیروئن اسلحہ کے ساتھ لا رہے ہو وہ بمبئی کے راستے امریکہ سمگل کی جائے گی —— ممکن ہے ہمیں تمہاری گرفتاری کا ڈرامہ بھی کرنا پڑے۔ بہرحال ابھی کچھ بتایا نہیں جا سکتا —— میرا مطلب سمجھ گئے ہو نا۔"

گپتا نے اپنی بات مکمل کر کے شراب کا ایک لمبا گھونٹ اپنے حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"بالکل سمجھ گیا مائی باپ۔ بالکل سمجھ گیا ——"

کلدیپ سنگھ کو ان لوگوں کے اشاروں پر ناچتے ڈیڑھ سال ہونے کو آرہا تھا اب وہ ان کی رگ رگ سمجھنے لگا تھا۔ اُسے اس بات کا علم تھا کہ بھارت میں چلنے والی مختلف علیحدگی کی تحریکوں میں پچاس فیصد لوگ "را" نے اپنے داخل کر رکھے ہیں۔

لیکن ——

اصل میں وہ "را" کے تربیت یافتہ ایجنٹ ہوتے ہیں جو ڈبل کراس کا رول ادا کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے ذریعے "را" ایسی حرکتیں کرواتی ہے جس سے دنیا کو یہ تاثر ملے کہ انہیں پاکستان کی پشت پناہی حاصل ہے اور عالمی سطح پر پاکستان کے خلاف دہشت گردی کا پروپیگنڈہ کر کے اس پر بین الاقوامی پابندیاں لگوانے کی راہ ہموار کی جائے۔

کلدیپ سنگھ کو پورے منصوبے سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

لیکن ——

وہ بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ بھی پاکستان کو کسی بین الاقوامی سازش میں پھانسنے کا چکر چلایا جا رہا ہے اور اب اُسے قربانی کا بکرا بنایا جائے گا کیونکہ عین ممکن تھا کہ سرحد کے دوسری طرف وہ گولی کا نشانہ ہی نہ بن جائے۔

دوسری طرف اُسے یہ اطمینان بھی تھا کہ جب گپتا جیسے آفیسر نے یہ سازش تیار کی ہے تو اس نے اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہو گی کیونکہ اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ درمیان میں ہی ناکامی کا منہ دیکھتے۔ اگر یہ سازش ناکام رہتی اور اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا تو عین ممکن تھا کہ بھارتی حکومت کو ہی لینے کے دینے پڑ جاتے۔

تھوڑی دیر بعد کرنل گپتا نے اس سے جوگا سنگھ کی ملاقات کروا دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جوگا سنگھ بھی اُس کی طرح سر منڈا (مونا) سکھ تھا جس کا آنا جانا سرحد کے آرپار
لگا رہتا تھا کرنل گپتا نے شاید اُسے پہلے سے سب کچھ سمجھا رکھا تھا کیونکہ اس نے
کلدیپ سنگھ کی شکل پہ نظر پڑتے ہی "سب اچھا —— سب اچھا" کی رٹ لگا دی تھی۔
"بے فکر ہو جائیے مہاراج جی —— آپ کے حکم کے عین مطابق سارا کام ہو گا۔
بس آپ سب کچھ مجھ پہ چھوڑ دیجئے۔ میرا نام بھی جوگا سنگھ ہے ——"
یوں لگتا تھا جیسے وہ ملحقہ کمرے میں شراب نوشی کرتا کرتا اُٹھ کر باہر آ گیا ہو۔

○

ایم این اے میاں صاحب سے جہاں خان کی یہ تیسری ملاقات تھی ——!!
اب تک وہ تین مرتبہ جان پہ کھیل کر اُن کے لیے مال لایا تھا۔ اس دوران
میاں صاحب کو اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ اس کا تعلق علاقہ غیر سے ہے اور جہاں خان
کے پاس افغان جہاد میں استعمال ہونے والے جدید ترین اسلحہ کے ڈپو موجود ہیں۔
جو وہ ملکی اور غیر ملکی گاہکوں کے ہاتھوں فروخت کرتا ہے۔
میاں صاحب نے کوئی ساری زندگی کے لیے بالے شاہ کی غلامی کا پٹہ نہیں
لکھوا لیا تھا نہ ہی وہ اس کے محتاج رہ کر کام کرنے کی لت ڈالنا چاہتے تھے۔!
یوں بھی بالے شاہ جیسے شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ خدا جانے وہ کب کسی
بات پر ناراض ہو کر میاں صاحب کا ہی "بولو رام" کر دا دے —— جوگا سنگھ سے
میاں صاحب کا تعلق اس زمانے سے تھا جب وہ سر پہ افیم اُٹھا کر پانڈیوں کی
حیثیت سے سرحد عبور کیا کرتے تھے پھر انہوں نے جوگا سنگھ سے دوستی کی
اور اُس سے مل کر اپنا الگ بزنس شروع کر دیا۔
اس بزنس نے ہی انہیں اگلا الیکشن لڑنے کے لائق بنایا تھا۔ جیسے جیسے
میاں صاحب نے ترقی کی جوگا سنگھ سے گاڑھی چھنتی گئی —— گزشتہ

تین چار ملاقاتوں سے جوگا سنگھ میاں صاحب کو اسلحے کا کام کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔
"میاں جی —— سرحد سے مال چلتا ہے اور ہماری سرحد پہ مال پہنچا کر یہ لوگ
پیسے وصول کرتے ہیں۔ آپ نے تو صرف سرپرستی کرنی ہے باقی کام تو ہمارا ہو گا۔
ایک ہی پھیرے میں لاکھوں کا منافع ملے گا —— لاکھوں کا ——"
میاں صاحب کو اس بات کا علم تو تھا کہ اسلحے کا کام آجکل زوروں پہ ہے۔
لیکن ——

اپنی سیاسی حیثیت کے پیش نظر وہ قدرے محتاط رہتے تھے۔ جہاں تک ڈرگ
کا تعلق تھا تو اُن کے بیشمار بھائی بند اس پیشے سے منسلک تھے اور ایک ہی پیشے
سے تعلق ہونے کے سبب اُن کے درمیان قدرتی طور پر ایک یونین سی بن گئی تھی۔
ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں بھی یہ لوگ ایک دوسرے کے مفادات کا
تحفظ کرتے تھے تاکہ ان کے کاروبار محفوظ رہ سکیں۔
اگر بیٹھے بٹھائے محض اپنے اثر و رسوخ سے انہیں اتنا منافع مل جائے تو
اس میں حرج ہی کیا ہے؟
میاں صاحب کے شیطانی دماغ نے ان کو گمراہی کا راستہ دکھایا۔
اس روز جب جوگا سنگھ آیا تو اس نے ایسی بات کہہ دی کہ اب میاں صاحب
کے پاس "ناں" کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں بچی تھی۔
"میاں جی —— ہم نے اِدھر والوں کا "ناکہ" بھی پکا کر لیا ہے۔ اب نہ
رینجرز کی مصیبت رہی نہ بی ایس ایف کی —— اور پارٹی بھی بڑے کام کی
ملی ہے —— میاں جی ایک چکر لگا دیں مجھ غریب کی قسمت بھی بن جائے گی
آپ کا کیا جائے گا!"
اور میاں جی پگھل گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے آج پہلی مرتبہ کھل کر جہان خان سے بات کی تھی۔

"میاں صاحب میرے خیال سے بابے شاہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا ـــ وہ بڑے کھلے دل کا مرد ہے ـــ وہ اپنے ساتھیوں کو ترقی کرتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے میاں صاحب ـــ اور آپ یہ غلط فہمی بھی نکال دیں کہ آپ یہ کام کرنے والے پہلے شخص ہوں گے۔ یہ جو آئے دن اخبارات اور ٹی وی پر اسلحے کے ٹرک پکڑنے کی خبریں آتی ہیں یہ کون لوگ ہیں ـــ؟ ہم تک تو اس مال کی خبر پہنچتی ہے میاں صاحب جو پکڑا جاتا ہے۔ اس سے سو گنا زیادہ تو نکل جاتا ہے ـــ آپ سے بہتر کون جانتا ہے اس بات کو ـــ آپ حکم کریں۔ جو مال درکار ہو ـــ جہاں درکار ہو ـــ وہاں کی قیمت اسی حساب سے ہوگی اور مال پہنچ جائے گا ـــ"

جہان خان نے میاں صاحب کو تسلی دی۔

"ٹھیک ہے جہان خان تم پرسوں آجانا ـــ!"

○

اس روز جب جہان خان ایم این اے میاں صاحب کی دیہاتی حویلی پر پہنچا تو یہاں دو سکھ پہلے سے موجود تھے۔ میاں صاحب نے ان دونوں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

یہ کلدیپ سنگھ اور جوگا سنگھ تھے ـــ!

دونوں کو سرحد عبور کروانے کے لیے "را" کی خصوصی ٹیم دہلی سے آئی تھی اور انہوں نے ایسے علاقے سے سرحد عبور کی تھی جہاں سے عام حالات میں سرحد عبور کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن ـــ

اس بات کی بطور خاص احتیاط برتی گئی تھی کہ کسی کو شائبہ تک نہ گزرے کہ دال

میں کچھ کالا ہے۔ انہوں نے عام سمگلروں کی حیثیت سے سرحد عبور کی تھی۔ ایسے سمگلر جو دونوں طرف "ناکہ" دینے کے بعد اطمینان سے اپنا مال اِدھر اُدھر لے جا اور لا سکتے تھے۔

میاں صاحب کے گاؤں تک وہ رات کے اندھیرے ہی میں پہنچ گئے تھے جہاں اُن کے کارندے دونوں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ میاں صاحب سے اُن کی ملاقات اگلے دن کروائی گئی تھی۔ جوگا سنگھ نے کلدیپ سنگھ کا تعارف کرواتے ہوئے میاں صاحب سے کہا تھا کہ ان لوگوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا یوں بھی بڑے ثواب کا کام ہے کیونکہ بے چارے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔

ایم این اے میاں صاحب کی طرف سے ان کی آزادی یا غلامی جائے بھاڑ میں۔ انہیں اپنے مال کی فکر تھی۔ جب کلدیپ سنگھ نے پانچ لاکھ کیش کا ڈھیر اُن کے سامنے لگایا تو میاں صاحب کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔ یہ اُن کی دیرینہ کمزوری تھی۔ جب اُن کے سامنے دولت کا انبار لگتا وہ ندیدے بچوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑنے کو بے چین ہو جاتے۔ ان کی خواہش تھی کہ ساری دُنیا کے بینکوں میں موجود دولت ان کی گھریلو تجوری میں منتقل ہو جائے اور یہ کام بھی پلک جھپکتے انجام پائے۔ وہ اس میں معمولی سی دیر بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

جہان خان کا تعارف میاں صاحب نے فرضی نام سے کروایا اور کلدیپ سنگھ نے اپنی ڈیمانڈ بتا دی۔ جہان خان نے انہیں اگلے ۴۸ گھنٹے کے اندر ان کی مطلوبہ جگہ تک مال پہنچا دینے کا وعدہ کیا اور وہ لوگ شراب نوشی کرنے لگے۔

عقل کے اندھے میاں صاحب کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ کلدیپ سنگھ کے بریف کیس میں نصب کیمرے کے ذریعے یہ ساری فلم تیار ہو رہی ہے اور ایک ایک پل کی گفتگو بمعہ تصاویر کے محفوظ کی جا رہی ہے۔

کرنل گپتا کی خصوصی ہدایت پر کلدیپ سنگھ نے جان بوجھ کر "دہشت گردی" کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حوالے سے باتیں کی تھیں اور یہ کہا تھا کہ وہ اس اسلحے اور بارود سے بھارت میں موجود غیر ملکی سفارت خانوں کو نشانہ بنائے گا ـــــ اس کے ساتھ ہی اُس نے میاں صاحب سے ہیروئن بھیجنے کے راستے امریکہ پہنچانے کی بات کی تھی اور بے چارے ملک صاحب نے بڑے جوش و خروش سے نہ صرف اس کی ہر پیش کش پر ہاں میں ہاں ملائی تھی بلکہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر اُسے اپنے بین الاقوامی نیٹ ورک کا حصہ بنانے کی ہامی بھی بار بار بھری تھی۔

شراب کے نشے میں دھت ایم این اے میاں صاحب نے بڑی بڑی بڑہانک دی تھی اور کلدیپ سنگھ کو باور کروانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کوئی معمولی یا گھٹیا قسم کے سمگلر نہیں ہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر اُن کا کاروبار پھیلا ہوا ہے اور انہیں بین الاقوامی شہرت کے حامل بابے شاہ کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ انہوں نے کلدیپ سنگھ کو پیش کش کر دی تھی کہ اگر وہ بھیجے والا چینل کھول دے تو ففٹی ففٹی پر کام کر سکتے ہیں۔

اور ـ

کلدیپ سنگھ نے بابے کا چینل بھی کھول دیا۔

اُس نے اپنی دانست میں کرنل گپتا کی اُمید سے زیادہ کامیابی حاصل کی تھی اور وہ سب کچھ "را" کے لیے اگلوا لیا تھا جس کی اُسے ضرورت تھی۔

اگلے روز وہ شراب و شباب کے نشے میں دُھت گہری نیند سوئے رہے اور شام ڈھلے پر اُن کا مال تیار ہو کر اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔

سرحد کے دونوں اطراف کی ذمہ داری اُن لوگوں نے خود لے رکھی تھی۔

پانچ لاکھ کیش میاں صاحب کی تجوری میں منتقل ہو گیا۔

لیکن ـــــ

اربوں کھربوں روپوں سے زیادہ قیمتی ملک کی عزت داؤ پر لگا دی گئی ـــــ!

"را" نے بڑا کامیاب معرکہ سر کیا تھا۔

جیسے ہی خطرناک گولہ بارود اور ہیروئن سے بھرے تھیلے اپنے جسموں سے باندھے کلدیپ اور جوگا سنگھ بھارتی سرحد کے اندر داخل ہوئے۔ انہیں ایک ناکے پر للکار کر گرفتار کر لیا گیا۔

اب تک تو ڈرامہ ہو رہا تھا لیکن اس کے بعد ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کا سامان بھی موجود تھا۔

O

امریکہ کی طرف سے ساری دنیا میں ڈرگ سمگلنگ کو کنٹرول کرنے والے ادارے ڈی۔ ای۔ اے (ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی) کا ایجنٹ پیٹر اس وقت "را" کے کرنل گپتا کے ساتھ کیمپ ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا وہ "ویڈیو فلم" دیکھ رہا تھا جو کلدیپ اور جوگا سنگھ کے ذریعے حاصل کی گئی تھی۔

اُسے "را" کے افسر وہاں موجود باقی لوگوں کے متعلق بتا رہے تھے کہ یہ پاکستانی انٹیلی جنس کے اعلیٰ آفیسر ہیں۔ میاں صاحب کا تعارف ایجنٹ پیٹر کو پہلے سے تھا۔

"را" والوں نے جہان خان کو آئی ایس آئی کا کرنل بنا کر پیش کیا تھا اور یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ یہ سارا "کھڑاگ" آئی ایس آئی نے پھیلا رکھا ہے اور سکھ دہشت گردوں کے ذریعے نہ صرف بھارت میں تخریب کاری کی جا رہی ہے بلکہ ان دہشت گردوں کے ذریعے ڈرگ بھی امریکہ اور یورپ میں پہنچائی جا رہی ہے۔

ڈی۔ ای۔ اے کا متعصب یہودی ایجنٹ پیٹر اُن کی ہر "جھوٹی اطلاع" پر "آمنا صدقنا" کر رہا تھا۔

اگلے روز فوجی کیمپ ہیڈ کوارٹر میں اس کی ملاقات دونوں ملزموں سے کروائی گئی جنہوں نے رضاکارانہ طور پر اپنے بیانات ریکارڈ کروا دیئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کلدیپ سنگھ کا نام سکھوں کی زیرِ زمین تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے سی آئی اے کی فائلوں میں موجود تھا۔

"را" نے آج کے دن کے لیے تو کلدیپ سنگھ کو تیار کیا تھا۔ انہوں نے اس سے جو کام لینا تھا وہ لے لیا تھا۔

کلدیپ سنگھ اور اس کے ساتھی کو اب ڈرامے کے اگلے حصے پر عمل کرنا تھا جو دراصل اس کھیل کا ڈراپ سین تھا۔ اس منظر میں انہیں بی ایس ایف کی حراست سے جیب سے چھلانگیں لگا کر فرار ہونا تھا۔

لیکن ——

یہاں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔

انہیں بی ایس ایف کے جوان کرنل گپتا کی کمان میں ایک ٹرک میں گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔ جب ایک ویران جگہ ٹرک رک گیا۔ دونوں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔

"بھاگ جاؤ۔"

کرنل گپتا نے انہیں حکم دیا۔

دونوں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق نہر کی طرف بھاگنے لگے۔ ابھی بمشکل انہوں نے چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے جب کرنل گپتا کے اشارے پر بی ایس ایف (بارڈر سیکورٹی فورسز) کے جوانوں نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی ——!

پل بھر میں دونوں کے مردہ اور خون آلود جسم ڈھیر کی صورت زمین بوس ہو گئے۔

اگلے روز جب ڈی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ پیٹر "پاکستانی دہشت گردی" کے نام نہاد

ثبوت لے کر دہلی سے نیویارک کی طرف عازمِ سفر تھا عین انہی لمحات میں مقامی پریس کے فوٹوگرافروں نے دو سکھ "دہشت گردوں" کی لاشوں کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔

پنجاب پولیس کا چیف لاشوں کے سامنے ترتیب سے بچھی کرسیوں، میزوں پر اپنے ماتحتوں کے ساتھ پریس کانفرنس میں بڑی بڑی ڈینگیں ہانک رہا تھا۔ مرنے والے کے سر پر دس لاکھ کا انعام مقرر تھا اور وہ پولیس کو قتل کی ۲۵ سے زیادہ وارداتوں میں مطلوب تھا۔ اس کے بعد لاش کے سامنے بی ایس ایف کے ان جوانوں نے گھیرا ڈال کر تصویریں بنوانا شروع کر دیں جو یہاں موجود تھے۔

سکھوں کو "شہید" مل گیا۔

"را" نے اپنا الو سیدھا کر لیا

اور ——

پاکستان کو بدنام کرنے کی ایک اور سازش کامیاب ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈرگ مافیا

امیر کیانی اپنی دانست میں بڑا معرکہ سر کرنے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔

"تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے اس طرح منہ اٹھا کر میرے دفتر میں نہ چلے آیا کرو —— یہ اخبار کا دفتر ہے چنڈو خانہ نہیں"

طالب کمہار کے خلاف توقع سلوک نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔

"طالب صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کوئی پہلی مرتبہ یہاں نہیں آیا"

اس نے اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تمہیں آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ آج کے بعد مجھے تمہاری شکل اس دفتر میں دکھائی نہ دے۔ جو کام ہو گھر پہ آیا کرو۔ سمجھ گئے ناں ——"

طالب کمہار نے اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ یہ تاثر دے رہا تھا جیسے اسے کسی ضروری کام سے یہاں سے باہر جانا ہے۔

امیر کیانی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس کی مجبوری تھی وہ اس موذی کے خلاف کچھ کر گزرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ طالب کمہار نے اس کی حیثیت ایک ٹکے کے دلال جیسی بنا کر رکھ دی تھی۔ اس کا جب جی چاہتا امیر کیانی کی بے عزتی کر دیتا حالانکہ یہ امیر کیانی ہی تھا جس کے سہارے طالب کمہار نے شہر کی اعلیٰ کلاس تک رسائی حاصل کی تھی۔

لیکن ——

اس نے نوٹ کیا تھا کہ کچھ دنوں سے طالب کمہار کچھ زیادہ ہی اونچا اڑنے لگا تھا۔ اس نے امیر کیانی کو بھاڑے کا ٹٹو بنا رکھا تھا اور جب جی چاہتا اسے الٹے سیدھے احکامات جاری کر دیتا۔

اے ایس پی سلیم باجوہ کے تبادلے میں بھی بنیادی کردار اس نے ہی ادا کیا تھا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نیلم ایک پیشہ ور عورت تھی۔

لیکن ——

یہ ماضی کی بات ہے اب تو وہ اس کی بیوی تھی۔

اور اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اس نے اپنی بیوی کو بھی استعمال کیا تھا۔ ایسی بے عزتی کا مظاہرہ اس کے لیے کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں تھی کیونکہ گزشتہ پانچ چھ سال سے وہ دلالی ہی تو کر رہا تھا اور اپنے اسی فن کی بنا پر اس نے طالب کمہار تک رسائی حاصل کی تھی۔

طالب کمہار نے پہلی ہی ملاقات میں اندازہ کر لیا تھا کہ آدمی کام کا ہے اور اس نے امیر کیانی سے دوستی بڑھانی شروع کر دی تھی۔ امیر کیانی کے لیے پیشہ ور لڑکیوں تک رسائی اب کوئی مسئلہ نہیں رہ گیا تھا۔ اسے شہر کے قریباً تمام ایسے اڈوں کا علم تھا جہاں سے شرفاء کے لیے لڑکیاں سپلائی کی جاتی تھیں اور زیادہ کمیشن کے لالچ میں ان اڈوں کے دلال اس کے احکامات بجا لانا سعادت جاننے لگے تھے۔

نیلم بھی اسی طرح اس سے ٹکرائی تھی۔

خدا جانے امیر کیانی کو کیا سوجھی کہ اس نے ایک روز نیلم کو شادی کی پیشکش کر دی۔ نیلم نے بھی مستقبل کی ضمانت ایک کوٹھی اور کار کی صورت میں حاصل کر کے امیر کیانی کو جھٹ سے ہاں کر دی۔ جس کے بعد سے وہ اس کی "بیوی"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بن گئی تھی۔

اس روز جب اس نے نیلم کو بتایا کہ انہوں نے کسی طرح ایک بہروپ رچا کر طالب کمہار کے اشاروں پر ناچنا ہے تو نیلم کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیانی ___ تم تو ڈھنگ کا سوانگ بھی نہ بھر سکے۔"

اس نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا ___ کیا . . . ."

امیر کیانی سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا۔

"مجھے کم از کم پانچ چھ ماہ تو بیوی بنائے رکھتے۔ ابھی سے دھندے پر لگا رہے ہو۔"

وہ بھی نیلم تھی ___

ابھی اس کے پاس فروخت کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں تھا۔

جوان جسم، ادائیں، ناز و انداز۔

کیا کمی تھی اس کے پاس۔ پھر وہ کیوں خاموش رہتی۔ امیر کیانی کو اس بات کا احساس تھا کہ زندگی بھر دلالی سے اس نے جو کمایا تھا اس سے یہی ایک کوٹھی اور کار حاصل کر پایا تھا۔ جو نیلم نے شادی سے پہلے ہی اپنے نام لکھوا لی تھی۔

"تم غلط سمجھی ہو ___ ایسی کوئی بات نہیں۔ بھئی طالب کمہار اپنا یار ہے۔ اور یار ہی یاروں کے کام آتے ہیں۔"

اس نے بے غیرتی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے ___ لیکن ایک بات

یاد رکھنا کہ دھندے کی میں بھی پوری ہوں ___ آج کا شو تو مفت ہو جائے گا۔ آئندہ کے لیے ففٹی ففٹی کا سمجھ گئے ناں ___ میں نے تمہارے ساتھ شادی میں یہ شرط نہیں لکھوائی تھی کہ شادی کے بعد بھی تمہاری داشتہ بن کر رہوں گی ___ اگر بزنس ہی کرنا ہے تو پھر اس کے لیے اصول بھی پورے کرنے ہوں گے۔"

"سالی کی زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے ___"

امیر کیانی نے دل ہی دل میں کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

نیلم نے اس کھیل میں بڑا شاندار رول ادا کیا تھا اور طالب کمہار کو کامیابی بھی حاصل ہو گئی تھی۔

سلیم باجوہ کے تبادلے کی خبر پڑھتے ہی اس نے امیر کیانی سے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا تھا۔

"کر کر کیا مطلب ہے تمہارا ___"

وہ تو گڑبڑا گیا تھا۔

"میں نے کسی اجنبی زبان میں بات نہیں کی۔ یہ معمولی کام نہیں تھا۔ کیا وصول کیا ہے تم نے اس کے عوض۔ مجھے میرا حصہ دے دو ___ اللہ اللہ خیر صلا ___ میں نے تو سیدھی سی بزنس کی بات کی ہے ___"

اس نے امیر کیانی کے سامنے ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"دیکھو نیلم اپنی حد میں رہنے کی کوشش کرو۔ اب تم وہ نہیں ہو جو تم اب بھی خود کو سمجھ رہی ہو۔"

اس نے اپنی دانست میں نیلم کو ڈانٹا تھا۔

لیکن ___

نیلم مسکرا کر اس کا وار سہہ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچھا ـــــ بہت اچھا کیا تم نے کہ مجھے میری اصلیت یاد دلا دی اور میں تمہیں بھی ایک بات یاد دلا دوں کہ نکاح نامے میں طلاق دینے کا حق میں نے اپنے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ تین چار ماہ گزار کر جھک نہیں ماری۔ تمہارے ایک ایک نشکار کا علم ہے مجھے ـــــ میرے لیے کسی سے براہِ راست رابطہ قائم کرنا کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ سمجھے تم امیر کیانی ـــــ"

نیلم نے گویا پگھلتا ہوا سیسہ اُس کے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔ امیر کیانی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ غصّے کی صورت میں اُس کی طرف سے کی جانے والی کوئی بھی کارروائی اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے والی بات ہوتی۔

وہ چپ چاپ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سگریٹ سُلگا کر جب اُس نے دو چار لمبے کش لیے اور زہریلا دھواں اپنے معدے میں اُتارا تو اُس کا دماغ ٹھکانے پر آ گیا۔

"نیلم کی بات تو صحیح تھی ـــــ"

اُس نے پروفیشنل بن کر سوچا۔

"اس دھندے سے طالب کمہار نے جانے کتنے ہزار یا پھر لاکھ کمائے ہوں گے "پولیس کو مصروف رکھنے کا مطلب" یہی تھا کہ اُس دوران وہاں سے کوئی غیر قانونی نقل و حرکت آسانی سے کی جائے اور میاں صاحب سے طالب کمہار کے تعلقات کا اُسے بخوبی علم ہے۔ عین ممکن تھا اُس نے میاں صاحب ہی کے ایما پر یہ کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ امیر کیانی نے اس کھیل میں اپنی ہڈیاں بھی تُڑوائی تھیں۔ تھانے والوں نے اس کی اچھی خاصی حجامت کی تھی اُسے یونہی نہیں چھوڑ دیا تھا ـــــ اُسے تو یہی اُمید تھی کہ اُس کا حصّہ گھر پہنچ جائے گا لیکن دو تین روز تک جب "بیڈ ریسٹ" کے دوران اُسے طالب کمہار نے فون کرنے کی زحمت بھی نہ کی اور اب

نیلم نے اپنے حصّے کا تقاضا شروع کر دیا تو وہ طالب کمہار کے آفس گیا تھا۔ لیکن ـــــ

یہاں طالب کمہار نے اُسے بے عزت کر کے نکال دیا۔

یہ کہاں کا انصاف ہے؟

اُس نے سوچا۔

امیر کیانی کے لیے بے عزت ہونا کچھ ایسا مشکل یا ناپسندیدہ فعل بھی نہیں تھا بے غیرتی کے جس منصب پر حالات نے اُسے فائز کیا تھا وہاں گالیاں کھا کر مسکراتے رہنا اضافی خوبی سمجھی جاتی تھی۔

فی الوقت اس نے اپنا خون جلانے کی بجائے اس معاملے کو آنے والے کل پر چھوڑ دیا تھا۔ اور طالب کمہار کے گھر جا کر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا۔

اگلے روز وہ طالب کمہار کے گھر پہنچ گیا۔

"یہ لو اور آئندہ دفتر نہ آنا ـــــ تم میری پوزیشن نہیں سمجھتے۔ وہاں بڑے لوگوں کا آنا جانا رہتا ہے۔ اگر کسی نے تمہیں پہچان لیا تو ...."

طالب کمہار نے پانچ ہزار روپے اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے اُس کی حیثیت یاد دلائی۔

"طالب صاحب ـــــ یہ تو بہت کم ہیں۔ اتنا بڑا کام اور صرف پانچ ہزار ـــــ"

"اور کیا تجھے پچاس ہزار دوں سالے ـــــ! اپنی اوقات بھول رہا ہے۔"

طالب کمہار کو اُس کے اچانک احتجاج نے سیخ پا کر دیا تھا۔ ایسا ماضی میں کبھی نہیں ہُوا تھا۔

"طالب صاحب۔ یہ معمولی کام نہیں تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو استعمال کیا۔ مار کھائی ہے اور آپ نے صرف ـــــ"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امیر کیانی نے دبی دبی زبان سے احتجاج کیا۔

"اے گدھے! ایک مہینہ اگر تو لڑکیاں سپلائی کرتا رہے تو اتنی کمیشن نہیں بنے گی جتنے پیسے میں نے تجھے ایک رات کے دے دیئے ـــــ اور آج کے بعد اگر تو نے کبھی اس معاملے میں چوں چراں کی تو پولیس میں دے دوں گا اور وہ جوتیاں لگواؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا ـــــ"

طالب کمہار نے اُسے دو تین گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ امیر کیانی کو غصہ آیا تھا۔

لیکن ـــــ

ابھی اس کا اتنا زیادہ دماغ خراب نہیں ہوا تھا کہ اپنے لیے کوئی نیا عذاب کھڑا کرے اُس کا جی تو چاہتا تھا کہ طالب کمہار کا منہ نوچ لے لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

فی الوقت مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔

"ٹھیک ہے طالب صاحب جیسے آپ کی مرضی ـــــ"

سلام کر کے وہ باہر آ گیا۔ اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے شدت سے ذلت کا احساس ہوا تھا۔ اس شخص کے لیے اُس نے کیا کیا نہیں کیا تھا۔ اپنے والدین کو، گھر بار کو چھوڑا اور ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود شہر میں ایک دلال کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگا تھا۔

اُسے اس دھندے پر لگانے والا بھی طالب کمہار ہی تو تھا۔

اس نے امیر کیانی کو یہ راہ سجھائی تھی اور اب بھی طالب کمہار اس کو آنکھیں دکھلائے جا رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں کمہار! کبھی دادا کی، کبھی بابے کی۔ اگر میری ڈاڑھ تلے آ گیا تو ایسا سبق دوں گا کہ اپنی اوقات یاد آ جائے گی تجھے ـــــ"

اس نے دل ہی دل میں کہا۔

○

نیلم کو اُس نے بلا کم و کاست ساری بات بتا کر پانچ ہزار روپے اس کے سامنے پھینک دیئے۔

"ہوں ـــــ تو یہ بات ہے۔ بالآخر اس کمہار کی اولاد نے تمہیں دھتکار ہی دیا۔ اور جانتے ہو اس کے عوض اس نے کیا حاصل کیا ہے ـــــ کم از کم پانچ لاکھ لیے ہوں گے ـــــ تم نہیں جانتے اس لئے ایس پی کے تبادلے کے لیے کتنے لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا ـــــ اور اس نے نہ صرف تمہارے ذریعے یہ مقصد حاصل کیا بلکہ کروڑوں روپے کی ہیروئن بھی آسانی سے گزاری ہے ـــــ"

"مجھے احساس ہے نیلم لیکن میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

امیر کیانی نے بے بسی سے کہا۔

"تم گدھے ہو ـــــ بیوقوف تم ہی تو اس کا سب کچھ بگاڑ سکتے ہو ـــــ"

"کیسے ـــــ؟"

اس نے نیلم کی بات پر چونک کر بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"وقت آنے پر بتاؤں گی ـــــ"

نیلم نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیوانی تحفہ

افغانستان کی خانہ جنگی اور ۸۰ کے عشرے میں ایران میں آنے والے انقلاب اور اس کے مابعد اثرات نے مکران کی معاشی اہمیت کو دوچند کر دیا تھا۔

ساحلِ سمندر پر بسا یہ شہر جہاں میلوں دُور تک انسانی آبادی کا نام و نشان بھی دکھائی نہیں دیتا اچانک ہی سمگلروں کے نزدیک خصوصی اہمیت اختیار کر گیا۔

ایران عراق جنگ کے دوران جب ایران میں گندم کا قحط پڑ رہا تھا تو اس علاقے سے گندم سمگل ہو کر ایران جاتی تھی۔ اُن دنوں ایرانی حکام اپنی ضرورت کے ہاتھوں اتنے مجبور تھے کہ انہوں نے اس طرف سے مکمل آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

ایران کی بندرگاہیں "چاہ بہار" اور "کرک" جہاں گندم لانچوں سے اُتاری اور چڑھائی جاتی تھی وہاں کی قریباً ساری آبادی ایرانی النسل بلوچوں پر مشتمل ہے۔ یہی بلوچ قبائل "سربندر" میں آباد ہیں۔

یہی وہ دَور تھا جب گندم کی آڑ میں ایرانی حکام کی غفلت کا فائدہ اُٹھا کر اس راستے سے ڈرگ ساری دنیا کو سپلائی ہونے لگی تھی۔ پھر وہ دَور آیا کہ جیوانی پسنی، گوادر اور اورمارا کی بندرگاہیں ڈرگ سمگلرز کی محفوظ پناہ گاہیں بنتی چلی گئیں

یہاں سے سمندری راستوں کے ذریعے دنیا میں ڈرگ کا زہر پھیلنے لگا۔

بلوچستان کی پشتو بولنے والے افغانستان، صوبہ سرحد کے درمیان ان لوگوں نے آنے جانے کے لیے دو محفوظ راستے دریافت کیے۔

ایک راستہ تو چاغی سے فاران کے راستے مکران میں داخلہ تھا۔ پھر مکران سے ان کے پاس دو چانسز ہوتے تھے۔ ایک راستہ تو "توشاب" کی خفیہ پہاڑیوں سے "منڈ" کو جاتا تھا جہاں سے یہ لوگ بآسانی ایران میں داخل ہو جاتے تھے اور دوسرا راستہ ساحل سمندر کا تھا جس کے ذریعے ان کی رسائی بین الاقوامی سمندری راستوں تک ہو جاتی ہے۔

مکران کے ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئیں "قدرتی بندرگاہیں" ڈرگ سمگلرز کے لیے غیبی امداد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان قدرتی بندرگاہوں میں سمگلروں کو اپنی لانچیں بآسانی مہینوں کوسٹل گارڈ کی نظروں سے چھپائے رکھنے کی قدرتی سہولت موجود ہے۔ معمولی خطرے کی بو سونگھنے پر وہ پانی کی ان خفیہ غاروں میں اس طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ جیسے شکاریوں کے نرغے میں آیا ہوا کوئی جنگلی جانور اچانک گھنے جنگل میں چھپ جاتا ہے۔

"اورمارا" سے "جیوانی" تک ایسے اکیس محفوظ اور خفیہ آبی غار موجود ہیں جہاں سے سمگلرز بآسانی غائب ہو کر اپنا سفر آگے جاری رکھ سکتے ہیں۔ اور ان آبی غاروں تک رسائی کے لیے نیوی کے کئی بحری بیڑے بھی ناکافی ہوں گے۔

مکران کے آٹھ سو تا ایک ہزار میل لمبے طویل اور تھکا دینے والے اندھے خطرناک راستوں پر کڑی نگرانی رکھنا کسی بھی تربیت یافتہ فوج کے ایک بریگیڈ کے لیے بھی ممکن نہیں جبکہ اس طویل راستے پر حکومت کی طرف سے صرف پانچ سو سکاؤٹس ڈیوٹی دیتے ہیں۔ جن کے پاس موجود معمولی اسلحہ سمگلروں کے جدید اسلحے کے مقابلے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھلونوں کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔

○

بلوچستان کے شمال مشرق میں اس وقت شام ڈھل رہی تھی جب "کوہلواہ" سے زرگل نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اُس کے ٹرک میں اس کے ساتھ تین اور نوجوان موجود تھے گو کہ انہوں نے عام سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کلینر اور مکینک کی حیثیت میں سفر کرنے والے زرگل کے یہ تینوں ساتھی انسانی روپ میں درندے تھے۔ انہیں دنیا کے بہترین اسلحے پر عبور حاصل تھا اور ایک اشارے پر کشتوں کے پشتے لگا دینا ان کے لیے کھیل تماشے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

گزشتہ چار دنوں سے وہ مسلسل سفر کر رہے تھے۔ اس دوران زیادہ تر ڈرائیونگ گو کہ زرگل نے کی تھی۔

لیکن ــــ

وہ تینوں بھی اس سے کسی طرح کم نہیں تھے۔!

کسی آبادی کے باہر اگر انہوں نے ٹرک کے ٹائر وغیرہ دھونے کے دوران چند منٹ تک سستا لیا ہو تو الگ بات ــــ ورنہ تو انہوں نے یہ تمام عرصہ ٹرک کے اندر ہی گزارا تھا۔

تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح وہ ٹرک کے ایک حصے میں موجود اپنی خوراک کے ذخیرے میں سے ایک مرغی نکالتے رات کے اندھیرے میں اس کو ذبح کرتے اور ٹرک ہی میں موجود تیل کے چولہے پر کھانا تیار کر لیتے جسے دوران سفر ہی وہ کھاتے رہتے تھے۔

کوئٹہ سے انہوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

کوئٹہ سے وہ "نوشکی" پہنچے تھے جہاں سے انہوں نے آر سی ڈی شاہراہ پر

اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور اسی سڑک پر سفر کرتے ہوئے وہ خاران ڈویژن میں داخل ہو گئے تھے۔

اس دوران انہیں راستے میں بمشکل دو جگہ روکا گیا تھا لیکن دونوں جگہ ایک خاص لفظ ادا کرنے پر کسی نے اگلا سوال کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

آر سی ڈی ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے وہ رات کے اندھیرے ہی میں اس گاؤں تک پہنچے تھے۔ اس گاؤں میں بمشکل تیس چالیس مکان دکھائی دے رہے تھے۔ جس کی واحد وجہ شاید یہاں پانی کی موجودگی تھی۔ یہ مکانات بھی عارضی تھے۔ کیونکہ اس علاقہ میں لوگ مستقل گھر نہیں بناتے جب تک کہیں پانی موجود رہتا ہے یہ لوگ وہاں کاروبار حیات چلاتے رہتے ہیں اور زمین کے بانجھ ہوتے ہی وہاں سے اگلے پڑاؤ کی طرف کوچ کر جاتے تھے۔

ٹرک آبادی سے کچھ فاصلے پر کھڑا کر کے زرگل اور اس کا ایک ساتھی ہاتھ میں طاقتور ٹارچ پکڑے پیدل ہی گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ دونوں نے اپنے کندھوں سے کلاشنکوفیں لٹکا رکھی تھیں اور ان کی کمر سے گولیوں کے پٹے بندھے ہوئے تھے۔

گاؤں کے مکانوں میں لالٹین اور دیے روشن ہو رہے تھے لیکن گھروں کے باہر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید لوگ اس وقت کھانا پکا رہے تھے اور اپنے کاموں سے تھکے ہارے واپس لوٹے تھے۔

"تم یہیں ٹھہرو ــــ ہوشیار رہنا ــــ"

اُس نے گاؤں کے نزدیک پہنچ کر کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں اپنے ساتھی کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ــــ"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خونخوار غراہٹ اُس کے حلق سے برآمد ہوئی اور اس کا ساتھی ایک درخت سے ٹیک لگا کر اپنی بندوق ہاتھ میں پکڑے اس طرح کھڑا ہو گیا تھا جیسے اشارہ ملنے پر گاؤں کے مکینوں کو بھون کر رکھ دے گا۔

زرگل بڑی احتیاط سے دبے پاؤں چلتا۔ آبادی کے کونے والے ایک مکان پر جس کی حالت باقی مکانات سے قدرے بہتر نظر آ رہی تھی پہنچا تھا۔

دروازے پر رُک کر اُس نے آہستہ سے دستک دی۔

"کون ——؟"

اندر سے ایک آواز سنائی دی۔

"میں —— زرگل ——"

"ٹھیک ہے —— چلے آؤ۔"

اس کی شناخت پر مختصر سا حکم ملا اور زرگل اندر داخل ہو گیا۔

گیس لیمپ کی روشنی میں ایک کمرے میں زمین پر بچھی چٹائیوں پر گاؤ تکیے سجائے وہاں دو نوجوان بیٹھے تھے جنہوں نے کھڑے ہو کر مقامی انداز میں زرگل کا استقبال کیا۔

اچانک ہی مختصر دروازہ کھلا اور ایک ڈھلتی عمر کا بلوچ اندر داخل ہوا۔

اُس کی عمر تو ساٹھ ستر کے نزدیک تھی لیکن قد کاٹھ اور جسمانی ساخت سے وہ تیس سال کا دکھائی دے رہا تھا۔

"کیسے ہو چاکر خان ——"

زرگل نے اُس سے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بھلا ہوں بابا —— بھلا چنگا ہوں —— کیا بات ہے کچھ دیر ہو گئی میں تو...."

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ بس ذرا راستے میں ایک دو جگہ رُکنا پڑا۔ تم جانتے ہو چاکر خان ان راستوں پر سفر کرتے زندگی بہت گزر گئی لیکن یہاں کے موسم کا مزاج سمجھ نہیں آسکا۔ ایک جگہ انجن نے کچھ تنگ کیا تو دیر ہو گئی ——"

"شاہ جی سے بات کر لو ——"

یہ کہتے ہوئے اس نے کمرے کے کونے میں دھرے لکڑی کے تخت پوش کے نیچے سے ایک ٹرنک نکالا اور اس پر لگا تالا اپنی جیب میں موجود چابیوں کے ایک گچھے کی مدد سے کھولنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک سیلولر فون نکال کر باہر رکھ چکا تھا۔ اس علاقے میں بجلی تو موجود نہیں تھی۔ شاید چاکر خان اس دستی فون کو ان طاقتور غیر ملکی بیٹریوں کے ذریعے "ان ایکشن" رکھتا تھا جن کی خاصی تعداد یہاں موجود تھی۔ اس کے گھر میں انسانی ضرورت کی تقریباً ہر غیر ملکی شئے موجود تھی۔

ٹیلی فون پر نمبر چاکر خان نے خود ڈائل کیا تھا۔

خدا جانے یہ دنیا کا کون سا ٹیلی فون تھا جس نے کھٹاک سے مطلوبہ نمبر ملا دیا۔

شاید وائرلیس کا کوئی سسٹم تھا۔

دوسرے ہی لمحے دوسری طرف بلالے شاہ اُس سے مخاطب تھا۔

"کیسے ہو زرگل ——"

"آپ کی دعا ہے شاہ جی ——"

زرگل نے بلالے شاہ کی آواز پہچان لی تھی۔

"تین نمبر چیز کی پرت پچھلے مہینے والا "کوڈ" دہرانا۔ چاکر خان سے مال وصول کر لو اور اپنے آدمیوں کو بھی راستے ہی میں چھوڑ آنا۔"

ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری طرف سے ملنے والے پیغام کا مطلب وہ سمجھ گیا تھا۔

"جو حکم شاہ جی ——"

زرگل اس طرح مؤدب ہو کر فون سن رہا تھا جیسے بلے شاہ بنفس نفیس اس کے سامنے کھڑا ہو۔

"واپسی پر ٹرک بھی چھوڑ دینا۔ کراچی پہنچ جانا۔ بندہ موجود ہے وہیں آٹھ دس دن موج میلہ کرو۔ اس کے بعد اگلا کام بتائیں گے۔"

"جو حکم شاہ جی —— ٹھیک ہے شاہ جی ——"

زرگل زرخرید غلاموں کی طرح شاہ جی، شاہ جی کی رٹ لگا رہا تھا اور اب اس نے بلے شاہ کی ہدایت پر ہی فون بوڑھے جاکرخان کو واپس کر دیا تھا۔

جاکرخان دوسری طرف سے ملنے والے احکامات پر ہوں ہاں کرتا رہا پھر اس نے فون کو اسی طرح بند کر کے ٹرنک میں رکھا اور اسے تالہ لگا کر تخت پوش کے نیچے سرکا دیا۔

"میرے بندے "سبی" تیار کر رہے ہیں —— گاؤں کے دوسری طرف۔ وہیں ٹرک لے کر آجاؤ۔ مال وہیں لوڈ ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے جاتا ہوں۔ کوئی خطرے والی بات...."

"نہیں —— ایسا سوچنا بھی نہیں —— یہ جاکرخان کا علاقہ ہے —— یہاں سردار زئی حکومت ہے پتا نہیں ہل سکتا سردار کی مرضی کے بغیر ——"

جاکرخان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

سردار زئی مقامی اسمبلی کا ممبر اور علاقے کا سردار تھا۔ یہاں چاروں طرف اس کے قبائل آباد تھے۔ خود تو وہ کوئٹہ شہر میں رہتا تھا لیکن کبھی کبھی محض اپنی انا کی تسکین کے لیے یہاں بھی آجاتا کیونکہ قبیلے کا سردار ہونے کے ناطے اسے سال میں ایک دو

مرتبہ مقامی رسم و رواج میں حصہ لینا پڑتا تھا۔

سردار زئی بھی بلے شاہ کی طرح بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا۔ اس کا جال دنیا کے کونے کونے میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ اس علاقے کا شاید واحد ایسا ایم پی اے تھا جس کے پاس اپنا ذاتی جہاز سواری کے لیے موجود تھا۔

دنیا کی بیش قیمت جیپیں اور کاریں اس کے تصرف میں رہتی تھیں۔

وہ قلعہ بند ہو کر زندگی بسر کرتا تھا۔

سردار زئی کی جو رہائش گاہ کوئٹہ میں تھی وہ بھی ایک قلعہ کی مانند تھی جہاں جدید اسلحے سے لیس درجنوں تربیت یافتہ غنڈے اس کی حفاظت کے لیے پہرے پر موجود رہتے تھے۔

اس نے اپنی باقاعدہ فوج بنا رکھی تھی۔

کوئٹہ سے قلات تک اس کے پاس پانچ ایسے رہائشی قلعے موجود تھے۔

سردار زئی کے حفاظتی اقدامات کا یہ عالم تھا کہ اس کے بہت قریبی لوگوں کو بھی اس بات کا علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ آج رات کہاں گزارے گا۔

مری قبائل سے دشمنی کی بنا پر اس پر تین قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔

لیکن ——

آج تک کوئی حملہ آور اپنی شناخت کروانے کے لیے زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ سردار زئی کے لوگ حملہ آور کو زخمی حالت میں گرفتار کرتے اور اس کی تفتیش کرنے کے بعد اسے مردہ حالت میں قلعے سے باہر پھینک دیتے۔

سرکار دربار میں اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے کسی سرکاری اہلکار کو وہ منہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس علاقے کا وہ بے تاج بادشاہ تھا۔ یہاں سرکاری ملازمین اس کی مرضی سے لگائے اور ہٹائے جاتے تھے۔ اس کے قبیلے میں ہونے والے جرائم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر سزا وہ خود دیا کرتا تھا اور آج تک اس کے قبیلے کا کوئی شخص پولیس کے پاس فریاد لے کر نہیں گیا تھا۔

چٹیل پہاڑیوں کے دامن میں اس کے خفیہ تھانوں اور ٹھکانوں میں ملزم اور مجرموں کے ساتھ ساتھ کروڑوں روپے کی وہ ڈرگز بھی موجود رہتی تھیں جو پھر بابے شاہ کے ذریعے دنیا کے کونے کونے میں پہنچ جاتیں۔

○

سردار زئی اور بابے شاہ کی ملاقات حادثاتی تھی ——!

دونوں اپنے اپنے میدان کے شاہ سوار تھے اور دونوں کی شہرت "انڈر ورلڈ" میں پہنچ چکی تھی۔

سردار زئی کے ایک غیر ملکی گاہک نے اس سے بابے شاہ کا تعارف کروایا تھا۔

اور بابے شاہ کے ایک غیر ملکی گاہک نے سردار زئی کا تعارف اس سے کروایا تھا۔

دونوں کو اپنی اپنی طاقت کا اندازہ تھا ——

دونوں ایک دوسرے کی کمزوری تھے ——

اگر بابے شاہ سردار زئی کی مدد کے بغیر با آسانی ہیروئن پہاڑوں اور خطرناک گزرگاہوں سے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ تو سردار زئی کو بھی علم تھا کہ بابے شاہ کی معاونت کے ساتھ ہی اس کا بین الاقوامی "نیٹ ورک" کام کر سکتا تھا۔ دونوں کی دوستی دو ضرورت مند بدمعاشوں کی دوستی تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

اس دوستی نے جلد ہی پارٹنر شپ کا روپ دھار لیا۔

اب وہ دونوں ایک دوسرے کے نفع نقصان کے پارٹنر تھے۔

ملک کے کونے کونے میں موجود درندہ نما انسانوں کی ایک فوج ان دونوں

نے بھرتی کر رکھی تھی۔ آج بھی زر گل جو بابے شاہ کا کارندہ تھا چاکر خان سے جو سردار زئی کا "چاکر (نوکر)" تھا معمول کے مطابق مال وصول کر کے اسے بین الاقوامی پانیوں تک پہنچانے جا رہا تھا۔

اس نے مال کا کچھ حصہ کوئٹہ سے اپنے سفر کے آغاز پر ہی لوڈ کر لیا تھا اور آدھے سے زیادہ مال اب اسے یہاں سے اٹھانا تھا۔

کھجوروں کے جھنڈ میں موجود اپنے ساتھی کے ساتھ وہ ٹرک تک پہنچا تھا اور اب وہ لوگ سڑک سے ایک کچے لیکن محفوظ راستے پر سفر کرتے ہوئے اس مخصوص ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے جہاں وہ اس سے پہلے بھی تین چار مرتبہ جا چکا تھا۔

آبادی سے چند میل کے فاصلے پر چٹیل پتھریلے راستوں پر سفر کرتے ہوئے وہ اس پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے جو سردار زئی کے ایک گودام کی حیثیت رکھتی تھی اور جس کے اندر جنریٹر نصب تھے جن کی مدد سے یہ لوگ حسبِ موقع حسبِ ضرورت بجلی پیدا کر لیا کرتے تھے۔

"آؤ زر گل —— آؤ —— خوش آمدید ——"

ٹرک کے دروازے تک پہنچنے والے چاکر خان نے اپنے مسلح ساتھیوں کی موجودگی میں انہیں خوش آمدید کہا اور اب وہ چاکر خان کی معیت میں آگ کے اس الاؤ کی طرف جا رہے تھے جس پر اس کے کارندے سالم بکرے لٹکائے انہیں پکا رہے تھے۔

یہ مقامی ڈش "سجی" کہلاتی تھی جو یہاں کی روایات کے مطابق مہمانوں کو عزت افزائی کے لیے پیش کی جاتی تھی۔

آگ کے الاؤ کے گرد پہلے سے بچھی چٹائیوں اور آرام دہ گدیلوں پر زر گل اور اس کے ساتھی آرام سے بیٹھ گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چند منٹ بعد ہی اُن کے سامنے دنیا کی بہترین شرابوں کی بوتلیں دھری تھیں جن پر وہ ندیدے بچوں کی طرح جھپٹے اور بے نوشی کرنے لگے۔

چاکر خان اس دعوت میں اُن کا ساتھ بڑھ چڑھ کر دے رہا تھا۔ آگ کا الاؤ اب دہکنے لگا تھا اور یہاں موجود انسان بھیڑیے بنتے جا رہے تھے۔

"رات کے آرام کا سامان بھی موجود ہے ـــــ چاکر خان میزبانی کے سارے آداب جانتا ہے ـــــ"

نشے میں مدہوش چاکر خان نے زرگل کے کان میں سرگوشی کی۔ جواب میں زرگل نے زوردار قہقہہ بلند کیا اور چاکر خان کو کھڑا کر کے سینے سے لگا لیا۔

اُس پر ابھی سے وحشت طاری ہونے لگی تھی۔

آنے والے وقت کے تصور نے اُس پر ابھی سے دیوانگی طاری کر دی تھی اور اس کے اندر ہوس کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔

"سجی" تیار تھی۔

بھوکے بھیڑیے اس پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے آدم خوروں کی طرح بکرے چاٹنا شروع کر دیئے۔

آدھے گھنٹے میں وہاں دسترخوان پر بھنبھوڑی ہوئی ہڈیوں کا انبار لگا ہوا تھا اور چاکر خان کے کارندے جنہوں نے یہ "سجی" تیار کی تھی۔

لیکن ــــ

جن کی جانے والوں کی طرح شاید آنے والی دو تین نسلوں میں سے بھی کسی کو "سجی" کھانے کی توفیق نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ اُن کے سامنے قہوے کی "چینکیں" سجا رہے تھے۔

ان میں بیشتر وہ بدقسمت تھے جن کی زبانوں نے جانے کتنے سال پہلے "سجی"

کا ذائقہ چکھا تھا۔ ان کی خوش قسمتی ہوتی تھی اگر کوئی مہمان کسی ہڈی پر گوشت کا ٹکڑا چھوڑ دیتا جس پر مہمانوں کی روانگی کے بعد وہ کتوں کی طرح جھپٹتے اور جھوٹی ہڈیاں چبانے کے بعد بھی ہڈیاں اپنے کپڑوں میں چھپا کر اپنے بچوں کے لیے لے جاتے تھے۔

○

"تم لوگ آرام کرو ــــ صبح اگلا سفر شروع ہو گا۔"

زرگل نے اپنے تینوں مدہوش ساتھیوں سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"مہمانوں کو آرام کرواؤ اور سامان اچھی طرح حفاظت سے لوڈ کر دو ـــــ"

چاکر خان نے اپنے کارندوں کو حکم دیا۔

زرگل کے تینوں ساتھیوں کو وہ لوگ "آرام کروانے" کے لیے پہاڑی سلسلے کے اندر لے گئے جبکہ زرگل کو چاکر خان اپنے ہمراہ دوسری طرف لے جا رہا تھا۔

"ادھر خاص مال ہے چاکر خان ــــ تازہ مال آیا ہے۔ کل ہی ــ کل ہی آیا ہے زرگل خان ــــ کل ہی ــــ کیا یاد کرو گے تم بھی ـــــ"

بوڑھے وحشی نے قہقہہ بلند کیا جس کے ساتھ ہی زرگل نے قہقہہ لگایا اور پہاڑی سلسلہ ان کی غراہٹوں سے گونجنے لگا۔

دونوں پہاڑی سلسلے کے اُس حصے تک پہنچ گئے تھے جس کے آگے بے شمار جھاڑیاں اس طرح اُگی ہوئی تھیں کہ آسمان سے دیکھنے پر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس پہاڑی سلسلے کے درے پر موجود مسلح پہرے داروں نے چاکر خان کی شکل پر نظر پڑتے ہی انہیں تعظیم دی اور ایک طرف ہٹ گئے۔

دونوں اندر داخل ہو گئے۔

پہاڑی کو اندر سے ماہر ہاتھوں نے تراش کر یہاں دو در یہ چھوٹے چھوٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے بنا رکھے تھے اور جنریٹروں کی مدد سے اندر بلب روشن تھے۔ یہاں آنے پر خنکی کا احساس بڑھنے لگا تھا۔

ان کمروں میں سردار نبی کا مال رکھا تھا ——!

جہاں ایک طرف ہیروئن، چرس اور دیگر ڈرگز کے ڈھیر موجود تھے وہاں زندہ انسان بھی بھیڑ بکریوں کی طرح باندھے ہوئے تھے۔

اس سلسلے کے آخری کمرے میں وہ بدقسمت بنگلہ دیشی عورتیں بند تھیں۔ جنہیں سنہرے مستقبل کے خواب دکھا کر چاکر خان اور زرگل خان کے ہم نسل درندے ورغلا کر یہاں لے آئے تھے۔ یہاں سے پھر انہیں انسانی ہوس کے بازاروں میں سجانے کے لیے پاکستان اور دنیا کے دوسرے کونوں تک پہنچایا جاتا تھا۔

خدا جانے یہ بدقسمت لڑکیاں اب تک وحشت و بربریت کے کن کن مناظر کا حصہ بن چکی تھیں۔

بے بسی، بے کسی اور انسانی بہیمیت کا شکار بر حوا زادیاں دونوں وحشیوں کی لعنتی شکلوں پر نظر پڑتے ہی خوفزدہ بھیڑیوں کی طرح دیواروں سے چمٹنے لگیں۔

ان کو شاید کھانا بھی اس عفونت خانے میں پہنچایا جاتا تھا کیونکہ کھانے کے برتن بھی ان کے قریب ہی رکھے تھے۔

دونوں درندوں نے اپنی وحشت ناک آنکھوں سے مظلومیت کی ان زندہ تصویروں کی ہڈیوں پر منڈھے گوشت کا جائزہ لیا اور قہقہے لگانے لگے۔ اُن کے قہقہوں سے پہاڑی لرزنے لگی تھی اور خوفزدہ لڑکیوں کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا تھا۔

"ڈرتی ہیں —— ڈرتی ہیں —— سالیاں ——"

بوڑھے بھیڑیے نے دانت نکالتے ہوئے زرگل سے کہا۔

"کوئی بات نہیں —— کوئی بات نہیں —— مجھے بھی ایسے شکار کا ہی مزہ آتا ہے۔"

زرگل نے قہقہہ بلند کیا۔

بوڑھے بھیڑیے نے سلاخوں والا دروازہ کھول دیا تھا۔

"کر لو —— اپنی مرضی کی پسند کر لو ——"

اس نے زرگل کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اُسے دھکا دیا۔

زرگل پہ نوعمر اور بے بس بھیڑوں کی طرح سہمی ہوئی لڑکیاں دیکھ کر جنون طاری ہونے لگا تھا۔ وہ پاگل درندوں کی طرح کبھی ایک اور کبھی دوسری کو جھنجھوڑنے لگتا۔ بالآخر اس نے ان میں سے ایک بدقسمت کا ہاتھ جھٹکا دے کر کھینچا اور باہر لے آیا۔ بالکل اسی طرح جیسے بھیڑوں کے ریوڑ میں سے کوئی موٹی تازی بھیڑ ذبح کرنے کے لیے منتخب کی جائے۔

شراب کے نشے میں دھت انسانی رگوں میں زہر پھیلانے والا زرگل اس مجبور لڑکی کو جس کے منہ سے خوف کے مارے ڈھنگ کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی قریباً گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے تک لے گیا جہاں زمین پر بچھی چٹائی پر اُسے پھینک کر زرگل نے اپنا منہ کالا اور نامۂ اعمال سیاہ کیا —— اس سے ملحقہ کمرے میں یہی گھناؤنا فعل چاکر خان انجام دے رہا تھا۔

دیر گئے تک دونوں ان مجبور عورتوں کے ساتھ درندگی کا ناچ ناچتے رہے۔ انہوں نے باری باری ان بدقسمت عورتوں کی آبروریزی کی جنہیں احتیاج اپنے گھروں سے یہاں تک لے آئی تھی۔

جو اپنے گھروں سے یقیناً اس کام کے لیے نہیں نکلی تھیں۔

لیکن ——

جنہیں ان ہی کے ہم مذہب ہم قوم انسانوں نے گھروں سے اُٹھا کر بازاروں کی زینت بنا دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علی الصباح اُس نے اپنے ساتھیوں کو جگایا۔

مال اُن کے ٹرک میں لوڈ ہو چکا تھا۔ رات کی دہشت جیسے اُس کے لیے معمول کی کارروائی تھی اور وہ خود کو تھکا ہارا انسان ہونے کے بجائے تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔

"تم گاڑی چلاؤ ــــ کوئی بات ہو تو مجھے جگا لینا۔"

اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا اور ٹرک کے پچھلے حصے ایک قدرے خالی جگہ پر لمبی تان کر لیٹ گیا۔ جاکر خان نے الوداع کہا تھا اور اب وہ پکی سڑک تک آ گئے تھے۔

ٹرک اب "سوداں" کے راستے پر گھوم گیا تھا جہاں سے اُن لوگوں نے "اُوداں" ہوتے ہوئے "کولوا" پہنچنا تھا۔ عموماً یہ لوگ "آوادان" سے "کولوا" تک کا فاصلہ اونٹوں کے ذریعے طے کرتے تھے۔

لیکن ــــ

زرگل کو اس خفیہ راستے کا علم تھا جس کے ذریعے وہ لوگ ٹرک پر ہی اپنی منزل تک پہنچ سکتے تھے۔ "کولوا" میں بالے شاہ کے مقامی بدمعاش اُن کے منتظر تھے رات انہوں نے یہیں بسر کی۔ اب اُن کی منزل "ارمارہ" تھی۔ یہاں سے "ارمارہ" کا سفر انہوں نے اونٹوں کے ذریعے طے کرنا تھا جس کے بعد یہ مال سمندری راستے سے اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا اور زرگل اور اس کے ساتھی ٹرک یہیں چھوڑ کر اپنے ٹھکانے پر الگ الگ راستوں سے سفر کرتے واپس لوٹ جاتے۔

دن رات کا مسلسل سفر انہیں اُس منزل تک لے آیا تھا جہاں سے انہوں

نے ٹرک چھوڑ دیا تھا۔ یہاں بھی پہلے ہی سے بالے شاہ کے کارندے اُن کے منتظر تھے۔ انہوں نے شام کی تاریکی میں مال اونٹوں پر لادا تھا۔

زرگل کے ساتھی ٹرک واپس لے گئے تھے۔ انہوں نے یہاں سے واپس کوئٹہ جانا تھا اور وہ خود اُن لوگوں کے ساتھ ایک اونٹ پر سوار ہو کر اُسی منزل کی طرف گامزن تھا جہاں سے اس مال کو لانچ میں لاد کر انہوں نے سمندری پانیوں کا سفر اختیار کرنا تھا۔

زرگل کی ڈیوٹی میں یہ بات شامل تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے مال کی ڈیلیوری دے گا اور آخر وقت تک مال کے ساتھ رہے گا۔

یہاں سے ان کا سفر ساری رات کا سفر تھا۔

انہوں نے ساری رات اونٹوں کے کوہانوں پر بسر کرنی تھی۔

دس اونٹوں پر اُن کا مال لدا ہوا تھا اور ان کی حفاظت کے لیے دس مزید اونٹوں پر مسلح سوار موجود تھے۔ وہ لوگ ایک قافلے کی صورت میں سفر کر رہے تھے اور کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت چوکس تھے۔

○

زرگل کے لیے یہ پہلا سفر نہیں تھا۔ اُسے ان اونٹوں پر آتے جاتے چار پانچ برس ہونے کو آ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس راستے میں آنے والی ایک دو پوسٹوں پر بالے شاہ نے پہلے ہی سے "ناکہ" دے رکھا ہوگا۔ بصورت دیگر بھی کم از کم کسی پوسٹ پر اتنی نفری یا اسلحہ موجود ہی نہیں کہ سرکاری لوگ زبردستی اُن کا راستہ روکنے کی ہمت کر سکیں۔

وہ تو اتنی زیادہ تعداد میں اپنے جدید اسلحے سے مسلح سواروں کو دیکھ کر ہی ادھر اُدھر ہٹ جاتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردارزئی اور بابے شاہ دونوں پڑھے لکھے، زمانہ شناس اور دُنیا گھومے ہوئے سمگلر تھے۔ ان کے ہاتھ وقت کی نبضوں پر بڑی مضبوطی سے جمے ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کس وقت کس مہرے کو آگے کرنا اور کسے پیچھے ہٹانا ہے۔

اس راستے پر سفر کرنے والے اُن کے غلاموں کی حیثیت اُن کے نزدیک شطرنج کے مہروں سے زیادہ کبھی نہیں رہی تھی۔ وہ جب چاہتے کسی بھی مخالف بادشاہ کو شہ مات کرنے کے لیے اپنا کوئی نہ کوئی مہرہ پٹوا لیتے تھے۔

اپنے قافلوں کے لیے محفوظ راستے وہ خود تلاش کرتے تھے۔

ان راستوں میں پیش آنے والی ممکنہ مشکلات کا حل وہ خود نکالتے تھے اور جب پورا اطمینان ہو جاتا اس کے بعد ہی اپنا سفر شروع کرتے تھے۔

زرگل جو مال لے کر جا رہا تھا بین الاقوامی منڈی میں اس کی قیمت کروڑوں روپے میں تھی۔

یہ اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سودا تھا۔

سردارزئی گزشتہ مہینے ایک سرکاری وفد میں پارلیمنٹیرین کے روپ میں یورپی ملک گیا تھا۔

اُس کے پاس بڑا محفوظ کور تھا۔ جس کی آڑ میں وہ ملکی سلامتی اور عزت کو داؤ پر لگا کر ہمیشہ اپنا اُلو سیدھا کیا کرتا تھا۔ اس کے نزدیک حب الوطنی یا وطن دوستی محض لفاظی تھی۔

اُسے اپنے وطن سے صرف اتنی محبت تھی جتنی کبھی کسی بھیڑیے کو اپنے بھٹ سے ہو سکتی ہے۔

ایسے سرکاری وفود جو غیر ملکی دورے کرتے رہتے تھے، اِن میں سے کسی نہ کسی میں وہ اپنا نام اپنے اثر و رسوخ یا دولت کے بل بوتے پر شامل کروا لیا کرتا تھا۔

اس سفر کے پس پردہ کار فرما گھناؤنے عزائم کا اس کے ساتھیوں کو اس لیے پتہ نہیں چلا کرتا تھا کہ وہ اس کی عیاشی کی قبیح عادت سے باخبر تھے اور جانتے تھے کہ وہ غیر ممالک میں صرف عیاشی کرنے آتا ہے۔ یہ کوئی ایسا "غیر پسندیدہ" فعل بھی نہیں تھا جس کا نوٹس لیا جاتا۔

گزشتہ دورے ہی میں اس نے یورپ کی ایک پارٹی سے رابطہ کر کے اُن کے ساتھ ایک بڑا سودا کیا تھا۔ اگر یہ مال کسی طرح متعلقہ ہاتھوں تک پہنچ جاتا تو سردارزئی کی جائیداد پہلے سے دوگنا ہو جاتی اور بابے شاہ کو اگلے چار یا پانچ سال تک بغیر کسی جھنجھٹ میں پڑے شاندار زندگی بسر کرنے کا موقع مل جاتا۔

دونوں نے ارادہ کیا تھا کہ اس مرتبہ وہ ایک بڑا چکر لگانے کے بعد کم از کم ایک سال تک غیر ملکی چکر نہیں لگائیں گے کیونکہ اب دنیا بھر میں پھیلی یورپی ممالک کے ڈرگ انفورسمنٹ ایجنٹوں نے ان میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی اور اگر اُن کے خلاف کوئی ثبوت حاصل ہو جاتا تو کم از کم بابے شاہ کو وہ لوگ مقدمہ چلانے کے لیے اپنے ملک میں لے جاتے اور دنیا کی کوئی طاقت اُسے پھر نہ بچا سکتی۔

اس "چکر" سے دونوں کو بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اس لیے اُنہوں نے اپنے کارندوں میں سے بہترین آدمی اس کام کے لیے مختص کیے تھے۔

○

"کوربوا" کی مقامی آبادی کے لیے اس شخص کی آمد کوئی ایسی اچنبھے کی بات بھی نہیں تھی۔ سال میں اس طرح کا ایک آدھ بے وقوف یہاں آتا رہتا تھا۔ یہ عموماً وہ لوگ ہوتے تھے جن کا تعلق دنیا کی کسی بڑی یونیورسٹی سے ہوتا اور وہ یا تو کسی ریسرچ پراجیکٹ سے متعلق ہوتے یا پھر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری

اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں یہاں کا سفر کرتے تھے۔

کبھی کبھی کسی بین الاقوامی خیراتی ادارے کا کوئی رکن بھی ادھر آجاتا اور مقامی لوگوں کے مسائل کا جائزہ لینے کے بعد ان کے لیے سفارشات تیار کر کے ساتھ لے جاتا۔ اس کی روانگی کے کچھ عرصہ بعد "کولوا" میں کسی بین الاقوامی ادارے کی طرف سے غذائی امداد بھی آجاتی۔

لیکن ——

ایسا تین سال میں ایک مرتبہ ہوتا تھا۔

جو اجنبی آتے وہ عموماً مقامی آبادی ہی کے کسی آدمی کے ہاں "پے انگ گیسٹ" کی حیثیت سے قیام کر لیا کرتے تھے۔ یہ "پے انگ گیسٹ" اپنے مالک مکان کو یہاں چند دن قیام کرنے کے بعد اتنی زیادہ رقم دے جاتا تھا جتنی عام حالت میں وہ ایک سال تک مسلسل محنت کر کے بھی نہیں کما سکتا تھا۔

"کولوا" کی مقامی آبادی نے پہلے پہل اس اجنبی کی آمد کا نوٹس محض اس لیے لیا تھا کہ یہ پاکستانی باشندہ تھا۔

اس نے اپنا نام ڈاکٹر ایاز بتایا اور اپنا تعلق ایک بین الاقوامی رفاہی ادارے سے بتا کر ان لوگوں سے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اپنے ادارے کی طرف سے اس علاقے میں رہنے والے لوگوں کو درپیش صحت اور معاشرتی مسائل پر ایک رپورٹ مرتب کر رہا ہے —— اس سلسلے میں اکثر کسی نہ کسی عورت مرد کو گھیرے رکھتا اور اس سے یہاں کی مقامی زندگی کے متعلق الٹے سیدھے سوالات کرتا رہتا۔

اس علاقے کے نوجوانوں کے لیے واحد منفعت بخش کاروبار بطور "پانڈی" ڈرگ سمگلروں کے لیے "پھیرے" لگانا تھا۔ اپنے اونٹوں کے ذریعے یہ لوگ

اردو ڈاٹ کام

ایک کامیاب چکر لگا کر ایک دو مہینے کی روٹیاں ایک ہی چکر میں حاصل کر لیا کرتے تھے۔

ان سیدھے سادھے بھولے بھالے لوگوں کے نزدیک یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں تھا۔ کیونکہ آج تک مقامی انتظامیہ نے اس جرم میں کسی کو گرفتار ہی نہیں کیا تھا۔

اگر کبھی ایسا ہوتا تو راتوں رات گرفتار ہونے والا واپس اپنے گھر لوٹ آتا۔ سردار زئی کی حیثیت یہاں مقامی بادشاہ جیسی تھی۔

مقامی آبادی میں سے شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب تھا جس نے اس کی شکل دیکھی ہو گی کیونکہ آج تک سردار زئی نے کبھی یہاں قدم نہیں رکھا تھا۔

البتہ اس سے ملاقات کرنے کی کچھ مقامی لوگوں کو سعادت نصیب ہو چکی تھی۔

یہ وہ لوگ تھے جو سردار زئی کے لیے اونٹ اور پانڈی مہیا کرتے تھے اور جب وہ کوئی کامیاب بین الاقوامی چکر لگاتا تو ان لوگوں کو اپنے کسی قلعے میں بلا کر ان میں انعام تقسیم کیا کرتا تھا۔

سردار زئی اس علاقے میں ایک پراسرار شخصیت سمجھا جاتا تھا۔

سب لوگ اس کے نام اور کام سے آشنا تھے۔

لیکن ——

کوئی کسی کے سامنے اس کا نام لینے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ ان لوگوں کو سردار زئی کی طرف سے اتنا خوفزدہ کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے بھی اس کا نام لیتے ہوئے گھبراتے تھے۔

کھوسو اس علاقے کا وہ باغی نوجوان تھا جو عموماً ایسے سماج میں پائے جاتے تھے۔ وہ آئے روز سردار زئی کے کسی نہ کسی پانڈی سے لڑ جھگڑ کر تھانے میں ایک آدھ

Scanned by iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات گزار آتا تھا۔ پولیس سے مار کھانا اس کا معمول بن چکا تھا اور پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا اس کا شغل ——— !!

ڈاکٹر ایاز کی حسنِ اتفاق سے پہلی ملاقات کھوسو ہی سے ہوئی جب وہ ایک طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی بس کے ذریعے یہاں پہنچا تھا۔ بستی کے باہر ہی چائے کے کھوکھے پر اس کا ٹکراؤ کھوسو سے ہو گیا۔ ڈاکٹر ایاز نے دیکھا کہ کھوسو اونچی اونچی آواز میں سردار زئی کو گالیاں دے رہا تھا اور مقامی نوجوان اس سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر ایاز نے جان لیا کہ یہ اس کام کا بندہ ہے ———!

اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہ لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ کیونکہ پہلی نظر میں وہ کوئی سرکاری افسر لگتا تھا۔ ایسے سرکاری افسر سال میں ایک آدھ مرتبہ اپنی نوکری پکی رکھنے کے لیے یہاں کا چکر لگا لیا کرتے تھے۔

اس بات کا تو انہیں بعد میں علم ہوا کہ وہ سرکاری نہیں غیر سرکاری آدمی ہے۔ لیکن اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے مقامی آبادی کے لوگ اس کی عزت کرنے لگے تھے۔

ڈاکٹر ایاز اپنے ساتھ دوائیوں کا ایک تھیلا بھر کے لایا تھا۔ اس نے پہلے ہی روز بستی کے لوگوں میں مفت دوائیاں تقسیم کر کے ان پر اپنی شرافت، سخاوت اور انسان دوستی کا سکہ جما لیا تھا۔

کھوسو کے ساتھ وہ اس کے گھر چلا آیا تھا جہاں وہ اپنے بوڑھے باپ اور ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں کی زندگی کھوسو کی حرکتوں کی وجہ سے اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے جب اپنے بیٹے کو ایک اجنبی کے ساتھ آتے دیکھا تو بے چارے گھبرا گئے کہ شاید کسی سرکاری افسر نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔

لیکن ———

کھوسو کی طرف سے اجنبی کا تعارف کروانے اور یہ بتانے پر کہ وہ پندرہ بیس روز تک ان کے ہاں قیام کرے گا ان کے چہرے کھل اٹھے۔

"یہ لو ——— بازار سے پندرہ بیس روز کا راشن لے آؤ"

اس نے پانچ سو کا نوٹ کھوسو کے بوڑھے باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ بوڑھے انسان نے زندگی میں شاید پہلی مرتبہ پانچ سو کا نوٹ دیکھا تھا اس کی تو آنکھیں ہی چندھیا کر رہ گئیں۔

"گھبراؤ نہیں ——— باقی پیسے تم رکھ لینا۔ بھئی میں نے آخر تمہارے ہاں رہنا ہے اتنے دن"

ڈاکٹر ایاز نے اسے تسلی دی۔

یہ اس کی کھوسو کے ساتھ دوستی کا آغاز تھا۔

اس نے بنیاد ہی اتنی مضبوط باندھی تھی کہ اب اس پر اپنی مرضی کی عمارت آسانی سے کھڑی کر سکتا تھا۔

شام تک اس نے کھوسو کے گھر آرام کیا۔ اس دوران اس نے کھوسو سے سردار زئی کے متعلق کوئی ایک بھی سوال نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر ایاز بڑا محتاط آدمی تھا اور کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس سے متعلق معمولی سا شک بھی ان لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کرتی۔

O

شام کے بعد اس نے بستی کا چکر لگایا اور وہاں لوگوں کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔ اس نے اس انداز سے اپنا اور اپنی تنظیم کا تعارف کروایا تھا کہ ان لوگوں کو خواہ مخواہ ڈاکٹر ایاز سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر ایاز خاصا ہوشیار آدمی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے بڑی ہوشیاری سے ان لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔ بظاہر وہ کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کرتا تھا جو یہاں معیوب سمجھی جائے۔ اس نے آج تک کسی خاتون سے اس کے لواحقین کی غیر موجودگی میں ملاقات نہیں کی تھی۔ وہ دن میں بمشکل [illegible] کرتا اور باقی وقت لکھنے پڑھنے میں بسر کر دیتا۔ اس نے یہاں کے خاصے مناظر کی فوٹوگرافی بھی کی تھی۔

اس روز ڈاکٹر ایاز کھوسو سے مقامی مسائل پہ بات چیت کر رہا تھا جب اچانک ہی وہ پھٹ پڑا۔

"ڈاکٹر صاحب! یہاں کے لوگ بہت بھولے بھالے ہیں۔ اس طرف کبھی کوئی غلط آدمی نہیں آیا تھا لیکن گزشتہ دو سال سے یہاں سردار زئی بادشاہ کا نام شیطان کی طرح گونجنے لگا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے گھٹیا اور ذلیل عزائم پورے کرنے کے لیے بڑا بھیانک راستہ اپنایا ہے۔ یہاں کے نوجوان جو کبھی سگریٹ بیڑی پینا بھی معیوب خیال کرتے تھے اب ان کی آدھی سے زیادہ تعداد ہیروئن کی عادی ہو چکی ہے اور اس کے ذمہ دار یہ درندے ہیں جنہوں نے ان لوگوں کو اپنا آلہ کار بنانے کے لیے اس زہریلے نشے پر لگایا ہے۔ اب یہ لوگ مرتے دم تک سردار زئی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔

ڈاکٹر صاحب! اس علاقے سے سردار زئی کیا کیا گھناؤنے جرم سرانجام دے رہا ہے اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بنگلہ دیش سے اغوا ہونے والی عورتوں کو اس راستے سے یہ وحشی لوگ نزدیکی ریاستوں میں بھیجتے ہیں آپ جہاں بیٹھے ہیں یہ بظاہر تو سیدھے سادے غریب اور پسماندہ لوگوں کی بستی ہے لیکن عملاً سردار زئی جیسے بین الاقوامی سمگلر کا بہت بڑا اڈہ جہاں اس کی حکومت بلاشرکت

غیرے ہے اور کسی کو اس کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

کھوسو کا ایک ایک لفظ ڈاکٹر ایاز کے ذہن پر نقش ہوتا جا رہا تھا۔

"تم کیوں ان سے دشمنی مول لیتے ہو۔"

اچانک ہی ڈاکٹر نے اس سے سوال کیا۔

"میں تو ان سے دشمنی مول لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تو دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ان کو گالیاں دے لیتا ہوں۔ یہاں کے لوگ کم از کم ابھی انسانیت کی سطح سے نہیں گرے کہ وہ میری شکایت کریں۔ جس روز سردار زئی کو کسی نے بتا دیا یا اس نے میرے متعلق یہ اندازہ کر لیا کہ میں اس کے لیے کوئی خطرہ پیدا کر سکتا ہوں اگلے ہی روز مجھے مروا دے گا اور کسی کو زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہو گی ــــ ممکن ہے اس تک میری باتیں پہنچتی ہوں لیکن وہ ابھی مجھے کوئی اہمیت ہی دینے پر تیار نہ ہو۔"

کھوسو نے جواب دیا۔

"لیکن تم نے کسی سرکاری اہلکار سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟"

ڈاکٹر ایاز نے اگلا سوال داغا۔ شاید وہ اسے آہستہ آہستہ کرید کر کھوسو کی اہمیت جاننے کے چکر میں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کھوسو کے ذریعے وہ لوگ ڈاکٹر ایاز کی اصلیت نہ جاننا چاہتے ہوں۔

"ہونہہ ــــ سرکاری اہلکار ــــ" اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا ــــ "وہ تو ان کے غلام ہیں۔ ان کے حکم کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔ وہ بیچارے کیا کریں گے۔ انہیں گھر بیٹھے ان کا حصہ پہنچ جاتا ہے۔"

"یہ تو بڑی تشویشناک صورت حال ہے۔"

ڈاکٹر ایاز نے اپنی دانست میں اظہار افسوس کیا تھا لیکن کھوسو کو غصہ آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ کے خیال میں مجھے علم نہیں اس بات کا کہ یہ صورتِ حال تشویشناک ہے۔ میں کیا جھک مار رہا ہوں۔ سب باتیں ہی کرتے ہیں۔ عملاً کوئی کچھ نہیں کرتا۔"

کھوسو یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا ـــ!

ڈاکٹر ایاز نے اُس سے اگلے دو روز تک اِس موضوع پر ہیر پھیر سے خاصی باتیں کرنے کے بعد اندازہ کر لیا تھا کہ آدمی کام کا ہے اور شاید اس کی مشکل اس کے ذریعے آسان ہو جائے بہت سوچ سمجھ کر اُس نے اپنے ذہن میں ایک پلان بنایا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

"میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں ایک سماجی کارکن ہونے کے ناطے میرے ضمیر نے مجھے بہت ملامت کی ہے لیکن بیوقوفوں کی طرح نہیں بلکہ عقلمندوں کی طرح اپنے ہوش و حواس قائم رکھ کر کام کرنا ہو گا۔ تم کسی طرح ان کے پانڈیوں میں شامل ہو جاؤ۔۔۔"

اس نے کھوسو کو منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ کھوسو اس کی ہر بات پر اپنا سر ہلا کر صاد کر رہا تھا۔

○

اگلے روز اچانک ہی کھوسو کے والد پر کھانسی کا پرانا حملہ ہوا تھا لیکن اس مرتبہ یہ حملہ بڑا خطرناک تھا۔

یہاں لوگوں کو پیچیدہ عوارض لاحق ہونا کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کا نوٹس لیا جاتا۔ غربت، جہالت اور ناکافی سہولیات کے سبب اس علاقے میں تو دُور دُور تک کوئی ڈاکٹر بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"تم اپنے والد کو کراچی لے جاؤ۔ ہمارا ادارہ ان کا مفت علاج کر دے گا بصورتِ دیگر اس کی موت کا خطرہ ہے کیونکہ اس پر دق کا حملہ ہوا ہے۔"

ڈاکٹر ایاز نے اُسے چند گولیاں دے کر کہا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے ـــــ"

برادری کے ایک شخص نے پوچھا۔

"یہ میری ذمہ داری ہے۔ تم لوگ سواری کا بندوبست کرو۔"

ڈاکٹر ایاز نے کہا۔

ڈاکٹر ایاز نے کھوسو کو اس کے والدین کے ساتھ کراچی روانہ کر دیا تھا جہاں کھوسو نے ڈاکٹر صاحب کی تنظیم کے لوگوں کو اپنے والدین کو سونپا اور اگلے روز واپس آ گیا۔

اب اس کے والدین "محفوظ ہاتھوں" میں پہنچ چکے تھے!

اگلے روز کھوسو بڑی سنجیدگی سے گردن لٹکائے سردار زئی کے مقامی آدمی کی بیٹھک پر جا رہا تھا۔

"آؤ کھوسو ـــ آؤ کیسے ہو ـــ سنا ہے تمہارے باپ کا علاج ڈاکٹر مفت کرا رہا ہے شہر میں"ـــ

ٹھیکیدار نے اس پر طنز کیا لیکن اس کا ردِ عمل ٹھیکیدار کو چونکا دینے والا تھا۔

"ہاں سائیں! تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ابھی میں اتنا بے غیرت نہیں ہوا کہ اپنے والدین کو کسی کا محتاج بناؤں۔ میں کام لینے آیا ہوں۔ تم میری وفاداری پر اعتماد کر سکتے ہو ـــ مجھے اپنی نوکری پر رکھ لو"ـــ

کھوسو نے گردن جھکا کر جواب دیا۔

"یہ ہوئی ناں بات ـــ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ تم غلطی کر رہے ہو ـــ بابا! اس علاقے میں سردار صاحب کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا۔ ان کی غلامی

اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آؤ گے تو مزے کرو گے ــــ مزے ــــ"

ٹھیکیدار نے کہا۔

تیسرے ہی روز کھوسو نے ڈاکٹر ایاز کو بتا دیا کہ وہ لوگ فلاں تاریخ کی شام کو قافلے کی "آرمارہ" کی طرف جا رہے ہیں۔ جس میں وہ بھی شامل ہو گا۔

"شاباش ــــ اب تم مطمئن رہنا اور اپنے حواس قائم رکھنا۔"

ڈاکٹر ایاز نے کہا۔

اگلے روز ڈاکٹر ایاز اپنا کام مکمل ہونے پر بستی کے لوگوں کا گھر گھر جا کر شکریہ ادا کرتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

کوسٹل گارڈز نے مرکز سے آئے ہوئے انٹیلی جنس آفیسر کی آمد کو پہلے پہل تو اپنی انا کے لیے چیلنج محسوس کیا لیکن جب میجر مخدوم نے ان سے ملاقات کی اور کچھ وقت ان کے ساتھ گزارا تو وہ سب اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ اس نے دو برق رفتار کشتیاں اور اپنے مطلب کے جوان منتخب کیے تھے۔ ابھی انہیں آپریشن کی تفصیلات نہیں بتائی تھیں۔

مقامی انٹیلی جنس یونٹ کے سربراہ کو "مرکز" کی طرف سے پیغام ملا تھا کہ وہاں سے میجر مخدوم ایک انتہائی مشن پر آ رہا ہے اور ان لوگوں نے اس کا ہر طرح ساتھ دینا ہے۔ ایک طرح سے میجر مخدوم اُن کا عملاً انچارج بن کر آ رہا تھا۔

"ہم بڑا خطرناک جوا کھیلنے جا رہے ہیں برادرِ عزیز ــــ!"

میجر مخدوم نے مقامی انٹیلی جنس فیلڈ یونٹ کے کمانڈر کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمیں ایک بڑا معرکہ سر کرنا ہے۔ یوں سمجھو کر ملک کی عزت داؤ پر لگی ہے۔

یہ بڑا نازک آپریشن ہے۔ جتنے زیادہ لوگوں کو اعتماد میں لیا جائے گا اتنی ہی زیادہ مشکلات کا سامنا ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ دشمن ہوشیار ہو جائے اور ہم ناکام رہیں۔"

اُس نے نوجوان آفیسر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ مطمئن رہیں۔ مجھے ہر طرح اپنے ساتھ پائیں گے۔ مجھے اپنے جوانوں پر مکمل اعتماد ہے ــــ۔"

اُس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

میجر مخدوم نے اپنی "ٹاسک فورس" کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصہ نیوی کے جوانوں اور ان کی دو برق رفتار کشتیوں پر مشتمل تھا اور دوسرا گروپ پیدل فوج کے جوانوں کا تھا۔

اس منصوبے کی رازداری کا یہ عالم تھا کہ ابھی تک اس نے انہیں راستوں کے متعلق اعتماد میں لینے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔

دونوں گروپوں کی روانگی سے چند منٹ پہلے اُس نے پیدل گروپ کے لیڈر کیپٹن منذر کو اپنے پاس بلا کر ایک نقشہ اُس کے سامنے پھیلاتے ہوئے اُسے ایک خاص جگہ انگلی رکھ کر سمجھایا تھا۔

"یہاں سے قافلہ آج رات کو گزرے گا ــــ آپ نے انہیں کچھ نہیں کہنا خود کو "کیموفلاج" کیے رکھنا ہے۔ دبے پاؤں اس طرح قافلے کا تعاقب کریں کہ یہ لوگ آپ کی نظر میں رہیں ــــ حملے کا آغاز سمندر سے ہو گا۔ نیوی کے جوان اس لانچ پر قبضہ کریں گے جس میں یہ مال لادا جائے گا۔ جس کے بعد آپ پشت سے انہیں شکار کریں گے اور اس طرح گھیرا بندی کرنی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بھاگ کر نہ جانے پائے۔ گرفتار ہونے والوں کو دو دو، تین تین کے گروپوں میں لائیں اور ان میں سے "کھوسو" نام کے نوجوان کو الگ کر لیں۔ یہ ہمارا آدمی ہے۔"

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ کہتے ہوئے میجر مخدوم نے اُسے ایک تصویر دکھائی تھی۔

یہ کھوسو کی تصویر تھی۔

"اوکے سر۔ انشاءاللہ آپ ہمیں کامیاب پائیں گے۔"

کیپٹن نے ایڑیاں بجائیں۔

"گڈ لک ___ مووو ___"

میجر مخدوم نے حکم دیا اور دونوں قافلے منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

○

سردار زئی کے ساتھیوں کے لیے جیسے کوئی آسمانی بلا نازل ہوئی تھی۔

وہ لوگ بڑے اطمینان سے راستے کے تین چار "ناکوں" پر اپنا حصہ ادا کرنے کے بعد زرگل کی کمان میں "ارمارہ" کے ساحلی علاقے کی طرف آرہے تھے یہاں سمندر کی محفوظ پناہ گاہ میں ایک بڑی لانچ ان کی منتظر تھی۔ انہوں نے بڑی آسانی سے اپنا مال لانچ میں منتقل کیا تھا اور اب لانچ کے عملے نے وصولی کی رسید دینے کے بعد کمان اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

اونٹ سوار واپس لوٹ رہے تھے۔

لانچ کے انجن سٹارٹ ہونے لگے تھے۔

اچانک ہی جیسے زمین آسمان سے اُن پر قہر نازل ہونے لگا۔ سمندری ساحل کے کٹاؤ میں چھپیں دو برق رفتار نیول بوٹس نے اپنی سرچ لائٹس جلا کر لانچ کی طرف اتنی تیزی سے دھاوا بولا تھا کہ اُس کے عملے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ان لوگوں نے گھبراہٹ میں سمندر میں چھلانگیں لگا دی تھیں۔

لیکن ___

چند منٹ کے اندر وہ سب نیوی کمانڈوز کی گرفت میں تھے۔ یہی عمل زمین پر

دہرایا گیا اور اونٹ سوار جو اپنی دانست میں بڑے مطمئن ہو کر واپس لوٹ رہے تھے اس لمحے چونکے جب انہیں ساحل سمندر پر نیوی کے جوانوں کے للکارنے کی آوازیں سنائی دیں۔

اس سے پہلے کہ صورت حال ان کی سمجھ میں آتی انہیں اپنی طرف روشنیاں لپکتی دکھائی دیں۔

یہ وہ "روشنی راؤنڈ" تھے جو ان کے چاروں طرف فائر کیے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی نیم دائرے میں کمانڈوز چیتے کی سی رفتار سے بھاگتے ہوئے اُن پر جھپٹے۔

زرگل اور اس کے تین چار ساتھیوں نے مقابلے کی ہمت کی جبکہ دوسرے تو اپنا اسلحہ ہی نہیں سنبھال پائے تھے جب قابو آ گئے۔ زرگل کے دو ساتھی مارے گئے باقی نے بندوقیں زمین پر رکھ کر ہاتھ کھڑے کر دیے۔ چند منٹ کے اندر ہی اُن کی مشکیں کس کر انہیں آرمی والے ہانکتے ہوئے ان ٹرکوں کی طرف لے آئے جن میں ڈال کر انہیں نامعلوم منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

یہ منشیات کی تاریخ کا سب سے بڑا چھاپا تھا۔

اربوں روپے مالیت کی ہیروئن اور پندرہ سمگلر گرفتار ہوئے تھے۔ ساری دنیا کے پریس نے اس کارروائی کو سراہا تھا۔ اور بلاشبہ یہ پاکستانی ایجنسیوں کا عظیم کارنامہ تھا۔

کھوسو کو میجر مخدوم کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

اس کی ملاقات اگلے ہی روز اس کے والدین سے ہو گئی۔ پھر ان تینوں کو پنجاب کے ایک گمنام سے قصبے کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ جہاں اس بڑی کارروائی میں حکومت کی مدد کرنے پر اسے انعام کی ایک خطیر رقم دی گئی جس سے وہ کوئی بھی اچھا کاروبار کر کے زندگی کے باقی دن آرام سے بسر کر سکتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہاں ڈاکٹر اباز اُس کا منتظر تھا۔

احساس تشکر سے کھوسو اور اُس کے والدین کی آنکھوں میں آنسو موجود تھے۔

ڈاکٹر اباز نے انہیں بتایا کہ وہ امریکہ واپس جا رہا ہے اور اب شاید اُن سے لمبے عرصے بعد ملاقات ہو۔ اُس نے کھوسو کو تلقین کی تھی کہ اپنے نئے نام کے ساتھ کاروبارِ حیات کا آغاز کرے اور کسی کو اپنی پرانی شناخت سے آگاہ نہ کرے۔

ڈاکٹر اباز دراصل اے ایس پی سلیم باجوہ تھا۔ جس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے آپ سے حلف لینے کے بعد انٹیلی جنس میں تبادلہ کروایا تھا کہ وہ بالے شاہ سے ریاض کی موت کا بدلہ لے کر رہے گا۔ اور اُن سب لوگوں کو برباد کر دے گا جنہوں نے دولت، غنڈہ گردی اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر ایوانِ اقتدار کو آکٹوپس کی طرح جکڑ رکھا ہے۔

اس کا پہلا مشن کامیاب رہا تھا۔

اس نے ملٹری انٹیلی جنس میں اپنے دیرینہ دوست میجر مخدوم کے ذریعے آپریشن کروایا تھا۔

○

بالے شاہ کے دماغ پر اس اطلاع سے بم پھٹا تھا۔

وہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔

اتنا بڑا دھچکا اسے لگا تھا جس کے بعد اس کا زندگی بھر کے لیے سنبھلنا مشکل ہو جاتا۔ اُس نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کیا تھا کہ سردار زئی کی نگرانی میں جانے والا مال بھی پکڑا جا سکتا ہے ——!

لیکن ہونی شدنی ——

حیرت کی بات یہ تھی کہ ابھی تک پولیس اُسے گرفتار کرنے نہیں آئی تھی

اس کی وجہ تو وہ جانتا تھا کہ گرفتار ہونے والوں میں سے کوئی بھی اس کا یا سردار زئی کا نام نہیں لے سکتا خواہ ان کے جسم کا بند بند الگ کر دیا جائے۔

کچھ ایسی ہی حالت سردار زئی کی بھی تھی۔ وہ بھی اس وقت اپنے کوئٹہ کے قلعے میں دادِ عیش دے رہا تھا جب اُسے یہ منحوس خبر سنائی گئی۔ اُسے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

لیکن ——

یہ امرِ واقعہ تھا ——

بالے شاہ غصے اور بے بسی کی تصویر بنا کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا جب گیٹ پر موجود چوکیدار نے اس کے سامنے ایک "بُوکے" لا کر رکھ دیا۔ اس کوٹھی کے مکینوں کو اس کی اصلیت یا اہمیت کا علم نہیں تھا کہ وہ آنے جانے والوں کا نوٹس لیتے۔ چوکیدار نے صرف اتنا بتایا کہ ایک "جنٹل مین" اس کے نام پر پھولوں کا گلدستہ چھوڑ گیا ہے۔

"سرپرائز ——"

بالے شاہ بڑبڑایا۔

اس نے اپنے ایک ساتھی کو حفاظتی اقدامات کے پیشِ نظر گلدستہ کھولنے کا حکم دیا۔ جس سے لفافے میں بند ایک مختصر سی تحریر برآمد ہوئی۔

"امید ہے تحفہ پسند آیا ہو گا —— اگر اب بھی تم اس بزنس میں رہے تو آئندہ ملاقات شاید جیل میں ہو گی۔"

"باجوہ ——"

بالے شاہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اُسے یاد آ گیا کبھی ایسا ہی ایک گلدستہ اس نے اے ایس پی سلیم باجوہ کی

اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے بسی کا مذاق اڑانے کے لیے اس سے ملتی جلتی تحریر اور ریاض ڈرائیور کی لاش کے ساتھ اس کے پاس روانہ کیا تھا ــــ!!

"تو یہ تم تھے ــ" وہ بڑبڑایا۔

"کون شاہ جی ــ" اس کے ایک محافظ نے پوچھا۔

"بکو مت سوچنے دو ــ"

بالے شاہ نے وحشیانہ انداز اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں اپنے ساتھی کو ڈانٹ پلا دی۔

نیلم

خاوند کی زندگی میں تو صغراں نے خود کو اس کی بیوی اور اپنے جسم کو خاوند کی امانت کبھی نہ جانا لیکن جیل میں اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اُسے "مرحوم نودولیتے" خاوند سے محبت ہو گئی اور اس کی وجہ تھی اس کی وہ کوٹھیاں جو ابھی تک کسی کے نام نہیں لگی تھیں۔

صغراں نے اپنے مرحوم خاوند کے چالیسویں تک تو خاصے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔

لیکن ــ

مرحوم کے چالیسویں کے اگلے روز وہ "نودولیتے" کی پہلی بیوی کے پاس اپنا حصہ لینے پہنچ گئی۔

"دونوں کوٹھیاں لے لو بہن ــ ہم تو اسی گھر میں گزارہ کر لیں گے۔"

گاؤں کی سیدھی سادی عورت نے اس کی تسلی کر دی۔

صغراں نے یہی جانا کہ جیسے اس کا کام بن گیا اُس کی تربیت کام آ گئی ہے۔

لیکن ــ

جب اُسے علم ہوا کہ یہ دونوں کوٹھیاں تو طالب کمہار کے قبضے میں ہیں

ون اردو ڈاٹ کوم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اس نے کمال مکاری سے کام لیتے ہوئے تو دو لینے کی زندگی ہی میں دونوں کوٹھیوں کے مختار نامے حاصل کر لیے تھے اور انہیں پھر قانونی ہیرا پھیری سے اس طرح کی پوزیشن میں لے آیا تھا کہ اگر صغراں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی تو بھی شاید اس کی تیسری نسل کو انصاف ملتا۔ اپنی زندگی میں وہ کبھی یہ کچھ حاصل نہ کر پاتی۔

صغراں بڑی گھاگ طوائف زادی تھی۔

اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بگڑا ہوا طالب کمہار اب اڑیل گدھے کی طرح اس کے قابو کبھی نہیں آئے گا کیونکہ اب اس نے بھی حرام کاری کے سارے داؤ پیچ سیکھ لیے تھے۔

ایک زمانہ تھا جب طالب کمہار کتے کی طرح اس کے جسم کی مشک پر کھنچا چلا آتا تھا لیکن اب اُسے صغراں سے کہیں بہتر اور اپنی مرضی کی عیاشیاں بستر تھیں پھر وہ اُسے منہ کیوں لگاتا۔

اب تو وہ صغراں سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔

صغراں جانتی تھی کہ اب یہ پہلے والا طالب کمہار نہیں رہا اور سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلے گا۔ اس نے اپنے طور پر بڑی ہوشیاری سے بات کی تھی اور اپنی قانونی حیثیت کا احساس دلانے کے بعد اس سے اپنا حصہ طلب کیا تھا۔

"کونسا حصہ ــــ کونسی کوٹھیاں ــــ انہیں تو فروخت کیے ایک سال ہو رہا ہے۔"

طالب کمہار نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

صغراں کے تو پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی۔ یہ خبر اس کے لیے

دھماکے سے کم نہیں تھی۔

"میں تمہیں ہر بات کا مطلب سمجھانے کا پابند نہیں ہوں۔ مقدمے بازی پر پیسے میں نے اپنے باپ کے مربع فروخت کر کے تو نہیں لگانے تھے۔ آخر اس کے مال سے خرچ کرنا تھا۔"

طالب کمہار نے بے رحمی کی حد تک بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"طالبے! ابھی صغراں اتنی بے بس نہیں ہوئی کہ تیرے جیسے کمہار جینے جی اس کا مال ہڑپ کر جائیں۔ میں مرحوم کی قانونی بیوی تھی اور اس کی موت کے بعد بھی یہ رشتہ ابھی قائم ہے۔ یاد رکھنا میرے ساتھ تیرا یہ ایچا پانی نہیں چلے گی۔ مجھے خواہ اتنے ہی پیسے اور خرچ کرنے پڑیں لیکن تجھے بھی یوں گلچھرے اڑانے کے لائق نہیں چھوڑوں گی" ــــ

اُس کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔

"دیکھو صغراں اپنی اوقات میں رہو ــــ تم ہو کیا؟ ایک طوائف ــــ کیا بگاڑ لو گی میرا ــــ جو دو ڈھائی لاکھ تمہارے حصے کا بنتا ہے وہ لے لو اور میری جان چھوڑو ــــ اگر زیادہ بک بک کی تو اس سے بھی جاؤ گی۔"

طالب کمہار نے بڑے سرد لہجے میں اسے قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

صغراں طوائف زادی تھی۔

گرم سرد چشیدہ۔

وہ جانتی تھی کہ اس موذی کے منہ نہیں لگ سکتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُس نے اخبارات میں اپنا نام شائع کرنا شروع کر دیا تھا اور حرام کی کمائی سے شہر کے "شرفا" میں اچھا خاصا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔

وہ اس کا کیا بگاڑ لیتی ــــ؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طالب کمہار سے براہِ راست دشمنی لینے کا مطلب یہ تھا کہ ایک پھوٹی کوڑی بھی اس کے ہاتھ نہ لگتی۔

بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی ـــــ اس نے سوچا اور باقی معاملات کو پھر کسی وقت نمٹانے کا فیصلہ کیا۔

"دیکھو طالب کم از کم اس بات کی شرم کرو کہ کبھی تمہارا اور میرا کتنا اہم تعلق رہا ہے۔ میں نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا حتیٰ کہ اپنا آپ بھی تم پر نچھاور کرتی رہی" ـــــ

اس نے کمال ضبط سے اپنے دلی جذبات کا گلا گھونٹ کر طالب کمہار کو بھولا ہوا تعلق یاد دلانا چاہا۔

لیکن ـــــ

طالب کمہار بھی پرلے درجے کا عیار تھا۔ اس نے یہ تعلق بھلایا ہی کب تھا۔

"میں بھی تو اس دور کی لاج رکھتے ہوئے تمہیں یہ رقم دے رہا ہوں کوئی اور ہوتا تو کب کا سارا مال ہڑپ کر کے چپت ہو چکا ہوتا۔"

اس نے اپنا احسان جتلانا چاہا ـــــ

صغراں کیا بحث کرتی۔

اپنے سینے پر پتھر کی سِل رکھ کر واپس لوٹ آئی۔

طالب کمہار نے اسے قریباً دو ڈھائی لاکھ روپے ادا تو کر دیے تھے لیکن جس طرح اس نے یہ رقم صغراں کو دی تھی یہ اس کی ہمت تھی کہ ابھی تک اس نے اپنے دماغ کی شریان کو غصے سے پھٹنے نہیں دیا تھا۔

کبھی دو ہزار، کبھی پانچ ہزار اور کبھی تین ہزار۔ وہ بھی بار بار تقاضا اور منت سماجت کرنے پر ـــــ

تین سال پر لگا کر اڑ گئے تھے۔

ان تین سالوں میں طالب کمہار کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا جبکہ صغراں نے اپنی ڈھلتی جوانی اور بڑھتے بڑھاپے کو سنبھالنے کے لیے "نور ولیج" کی اس کوٹھی کو جو اس کے قبضے میں رہ گئی تھی "کوٹھی خانے" میں تبدیل کر لیا تھا۔

یہی کچھ اس کے اختیار میں تھا۔

شہر کی فیشن زدہ خواتین اور ان کی بگڑی ہوئی صاحبزادیاں اس کا شکار ہوتی تھیں۔

اس کے پاس خاندانی تجربہ موجود تھا جس کے بل بوتے پر وہ بڑی کامیابی اور رازداری سے اپنا دھندہ چلا رہی تھی۔

اس دوران اس کی زندگی کا اگر کوئی مقصد درپیش تھا تو وہ طالب کمہار کی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے اپنے طور پر شہر کے تین چار با اثر افراد پر باری باری خاصی محنت کرنے کے بعد انہیں قابو کیا اور ہر ایک کے ذریعے چاہا کہ اپنے اندر دہکتی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرے۔

لیکن ـــــ

ناکامی اس کا مقدر بنی رہی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اپنے طور پر ہر دفعہ اس نے بڑی مضبوط پلاننگ کی اور جس شخص سے متعلق اسے شک بھی گزرتا کہ یہ طالب کمہار کو سبق سکھا سکتا ہے اس تک اپنی لڑکیوں کے ذریعے کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتی۔ اپنے شکار کو وہ شباب کی بھرپور رشوت پیش کرتی اور آخر میں اسے اپنا مدعا بتاتی ـــــ

لیکن ـــــ

اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیرت کی بات تھی کہ ان میں سے ہر کوئی بے شمار دعوے کرنے کے باوجود اُس کا بال بیکا نہیں کر سکا تھا۔

طالب کمہار نے اپنے شیطانی ذہن اور حرام کاریوں سے اپنے گرد اگرد ایسا حفاظتی حصار باندھ لیا تھا اور صحافت کے مضبوط قلعے میں اس طرح ہوشیاری سے مورچہ بند ہو کر بیٹھ رہا تھا کہ انتقام کی کوئی گولی اُس تک پہنچ ہی نہیں پاتی تھی۔!

بڑے بڑے پولیس آفیسر اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کرتے اور معاملہ بالائی کمان تک پہنچا کر اس موذی پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت طلب کرتے تو دوسری طرف "پراسرار خاموشی" طاری ہو جاتی۔ بار بار استفسار پر انہیں ایک ہی جواب ملتا "فی الوقت حالات اس ایکشن کے لیے کارساز نہیں ہیں۔"

سیانے آفیسر تو سرکاری زبان سمجھ جاتے اور اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ کر خاموشی اختیار کر لیتے۔ اگر کوئی جذباتی قسم کا آفیسر اس صورت حال سے چڑ کر کوئی قدم اپنے طور پر اٹھانے کی کوشش کرتا تو اُسے نہ صرف ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ بلکہ ایک آدھ مہینے بعد ہی اس کا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہو جاتا۔

صغراں کو ان باتوں کا علم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ طالب کمہار نے بے پناہ طاقت حاصل کر لی ہے۔

لیکن ——

اپنی بے بسی کے سامنے اُس نے سرنڈر نہیں کیا تھا۔ وہ بہر صورت جنگ جاری رکھنے پر تلی ہوئی تھی۔

اب تو طالب کمہار اس کی ضد بن گیا تھا۔

جس طرح اس نے صغراں کے جیتے جی اس کے "مرحوم خاوند" کی دولت

پر ہاتھ صاف کر کے خود کو طالب کمہار سے "طالب فرعون" بنا لیا تھا۔ اس بات کو وہ ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کر لیتی۔

در پردہ اس کی جنگ جاری تھی۔ اب بھی وہ کسی موقعے کی منتظر تھی جب اُسے پچھاڑ سکے۔ البتہ تجربے نے اُسے یہ ضرور سکھا دیا تھا کہ اس مرتبہ بھی پہلے کی طرح وہ طالب کمہار پر کچا ہاتھ نہ ڈالے۔

بے چینی سے وہ اس موقع کی منتظر تھی۔

اس روز جب وہ ایک گاہک کو "مال سپلائی" کر کے واپس لوٹی تو اپنی ایک پرانی دوست کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"نیلم —— تم ——"

اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"صغراں کیسی ہو!"

دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئیں۔

○

صغراں اور نیلم کا تعلق ماضی میں "پروفیشنل" جیسا تھا —— ایک ہی بازار اور ایک ہی دھندے سے متعلق ہونے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے آشنا تھیں پھر جب صغراں نے "نودولتیے" سے شادی رچالی تو اس کا آنا جانا بھی اپنے آبائی گھر میں نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

لیکن ——

انہوں سے اُس کا رابطہ کبھی نہیں ٹوٹا تھا۔

اُس کی ماں ایک آدھ مہینے بعد ملاقات کو آتی تو بازار کی ساری خبریں اس تک پہنچا جاتی۔ اپنی ماں ہی کی زبانی ایک روز اُسے علم ہوا کہ نیلم نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی سے بیاہ رچا لیا ہے پھر ایک۔ دو مرتبہ نیلم کی اس سے سرِ راہ سے ملاقات بھی ہوئی اور اُس نے اپنے خاوند کا تعارف بھی اُن سے ایک بزنس مین کی حیثیت سے کروایا۔

ایسے "بزنس مین" صغراں اور نیلم جیسی عورتوں کی زندگی میں آتے جاتے رہتے تھے اور وہ جانتی تھی کہ یہ بھی "تو دو لیتے" جیسا ہی کوئی "بزنس مین" ہوگا ---!

آج نیلم کی اچانک آمد سے خوشی بھی ہوئی اور وہ چونکی بھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی موجودہ زندگی سے متعلق کوئی اطلاع اُس کی سابقہ ہمپیشہ لوگوں تک پہنچے۔

دونوں کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں پھر نیلم نے "آمدم برسرِ مطلب" کی طرف آتے ہوئے جب طالب کمہار کی زیادتیوں کا رونا شروع کیا تو صغراں پھٹ پڑی۔

یہ لمحہ اُس کی زندگی کا شاید کمزور ترین لمحہ تھا جب آنسو اُس کی آنکھوں سے یوں بہے جیسے پتھروں کی چٹانوں کو توڑ کر پانی کا چشمہ اُبل پڑے۔

"نیلم تم نے کس موذی کا ذکر چھیڑ دیا اُس نے تو..."

"میں سب کچھ جانتی ہوں صغراں باجی --- ہم بھی اسی کے ڈسے ہوئے ہیں لیکن اب ہمیں مل کر کچھ کرنا ہوگا --- میں تو اُس کمہار کی اولاد کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

نیلم نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے" ---

صغراں نے اپنی حالت پر قابو پا لیا تھا ---

"ہمت کرنے سے کچھ ناممکن نہیں رہتا --- میرے پاس ایک منصوبہ ہے اس موذی سے نمٹنے کے لیے ---"

نیلم نے کہا۔

اور جب نیلم نے اُسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو صغراں کی باچھیں کھل گئیں اسے یقین ہو چلا تھا کہ دیر ہی سے سہی لیکن وہ طالب کمہار کو سبق ضرور سکھا دیں گی۔

○

ایم این اے میاں صاحب کو ایک ہی "ڈیل" نے پھیلا دیا تھا۔

جہان خان کی طرف سے انہیں گرین سگنل مل چکا تھا کہ وہ جتنا مال چاہیں اُٹھائیں لیکن کام نہیں رکنا چاہیے اور میاں صاحب سوچ رہے تھے کہ اب وہ چند مہینوں ہی میں بلے شاہ کے برابر بیٹھنے لگیں گے۔

اسلحے کی سمگلنگ کا پہلا مرحلہ کامیاب گزرنے پر میاں صاحب کو اپنے بے حد عقلمند ہونے کا گمان بھی گزرنے لگا تھا اور اب انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہے وہ طالب کمہار کے دستِ نگر نہیں رہیں گے۔

بلے شاہ کی طرف سے انہیں سگنل مل چکا تھا کہ طالب کمہار سے بچ کر رہنا ہے جس کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ بلے شاہ اُسے پسند نہیں کرے گا۔ دوسری طرف یہ خطرہ بھی اُن کے سر پر ننگی تلوار کی طرح لہرا رہا تھا کہ اگر اس جیسے صحافتی بھیڑیے اس کے قابو میں نہ رہے تو کہیں اپنی اسمبلی ممبری سے ہی اگلے الیکشن میں ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ کیونکہ ڈرگ کے اس دھندے کو وہ تب تک کامیابی سے چلا سکتے تھے جب تک سیاست میں "اِن" رہتے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر وہ سیاست سے "آؤٹ" ہو جاتے تو جانے کئی بند فائلیں کھل جاتیں۔ کتنے تحفظات کی دیواریں گر پڑتیں اور وہ اکیلے رہ جاتے۔

کیا کیا جائے ــــ؟

اس موذی کا متبادل کیسے تلاش کیا جائے ــــ؟

بالے شاہ سے ملاقات کے بعد سے یہ سوال ایم این اے میاں صاحب کو مسلسل پریشان کر رہا تھا۔ انہوں نے اسلحے کی موجودہ ڈیل بھی بالے شاہ کے علم میں لائے بغیر کی تھی اور اصولی طور پر ایسا کوئی جرم جس میں بالے شاہ کا کوئی حصہ نہ ہو یا اس کے علم میں لائے بغیر کیا گیا ہو۔ اگر خدانخواستہ اس جرم کے حوالے سے میاں صاحب گرفت میں آتے تو اخلاقی طور پر بھی وہ بالے شاہ کی مدد نہیں مانگ سکتے تھے۔

"کیا مصیبت ہے ــــ؟"

میاں صاحب نے عجیب و غریب سوچوں سے تنگ آ کر کہا۔

پھر اچانک ایک خیال ان کے شیطانی ذہن میں انگڑائیاں لینے لگا۔

آخر وہ بالے شاہ کے بھی محتاج کیوں نہیں ــــ؟

اگر جہان خان کا اور اُن کا سنجوگ بن جائے تو عین ممکن تھا کہ وہ بالے شاہ سے بڑے سمگلر بن جاتے۔

لیکن ــــ

ابھی نہیں ــــ میاں بڑا کائیاں تھا۔ موری ممبر سے ایم این اے تک کا سفر اس نے حرام کاری کی آخری قدروں کو چھوتے ہوئے طے کیا تھا۔ وہ جانتا تھا فی الوقت وہ سانپ کے بل میں ہاتھ نہیں دے سکتا تھا۔

پہلے طالب کمہار ــــ پھر بالے شاہ ــــ

اس نے بالآخر فیصلہ کر ہی لیا۔

ایک نتیجے پر پہنچ کر اُس نے کچھ سوچتے ہوئے امیر کیانی کا نمبر ملایا۔ اس بات کا تو اُسے بخوبی علم تھا کہ امیر کیانی بھی طالب کمہار کا ڈسا ہوا ہے اور گزشتہ حادثے کے بعد سے تو وہ انتقام کی آگ میں سُلگ رہا ہے۔ طالب کمہار نے اُس بے چارے کی ہڈیاں بھی تڑوائیں اور یقیناً اُسے دیا بھی کچھ نہیں ہو گا۔

میاں چونکہ طالب کی رگ رگ سے آشنا تھا اس لیے جانتا تھا کہ وہ مردار خود اپنے ساتھیوں سے بھی اپنا اُلو سیدھا رکھنے کی حد تک ہی تعلق رکھتا ہے۔

امیر کیانی نے خود فون ریسیو کیا تھا۔

"کون ہے؟"

نیلم نے جو اس کے نزدیک ہی موجود تھی ہاتھ کے اشارے سے پوچھا

"ایم این اے میاں صاحب"

امیر کیانی نے فون پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

نیلم کا ماتھا ٹھنکا۔

وہ امیر کیانی کو نارمل رہنے کا اشارہ کر کے دوسرے کمرے میں چلی گئی، جہاں سے اُس نے دوسرا ایکسٹینشن فون اپنے کان سے لگا لیا تھا۔ دوسری طرف عقل کے اندھے میاں کو احساس ہی نہ ہو سکا۔

"کیا حال ہے کیانی صاحب ــــ بھئی آج کل تو بڑے اونچے اُڑ رہے ہو ــــ تمہارا یار بڑے لمبے ہاتھ مار رہا ہے ــــ کمال کر دیا تم نے تو ــــ کیسے مکھن سے بال کی طرح نکلوایا ہے باجوہ کو ــــ بڑا لمبا مال کمایا ہو گا؟"

میاں نے بظاہر فون پر بڑے "جولی موڈ" میں کریدنے کے سے انداز سے پوچھا اور امیر کیانی پھٹ پڑا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میاں صاحب کیوں ہم غریبوں کا مذاق اُڑاتے ہو۔ ہماری حیثیت تو آپ لوگوں کے نزدیک بھاڑے کے ٹٹو جیسی بھی نہیں۔ اپنی ہڈیاں تڑوانے کا معاوضہ طالب صاحب کی طرف سے اتنا بھی نہیں ملا کہ ہم ڈھنگ کا علاج ہی کروا سکتا ——— میاں صاحب میں تو اپنی بیوی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا ———"

امیر کیانی نے روہانسی آواز میں کہا۔

"یار بڑے افسوس اور دُکھ کی بات ہے۔ یہ تو زیادتی ہے۔ اس نے خود اس کام کے دو لاکھ سے زیادہ اینٹھ لیے اور تمہیں ....." میاں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا پھر خود ہی کہا۔

"خیر ——— تم فکر نہ کرو، میں کسر نکال دوں گا۔ اگر کہو تو اس سے بات کر کے دیکھ لوں؟"

اس نے اپنی دانست میں یہ فقرہ کہہ کر امیر کیانی کو بھی کریدنا چاہا تھا کہ وہ ایم این اے کی شکایت کہیں طالب سے نہ کر دے۔

"نہ نہ میاں صاحب خدا کے لیے یہ غضب نہ کیجیے ——— آپ اس کمینے کو نہیں جانتے۔ وہ تو میرا جینا دوبھر کر دے گا ———"

امیر کیانی کے جواب نے میاں کو مطمئن کر دیا۔

"تم میری طرف آؤ آج شام کو فون پر ایسی باتیں مناسب نہیں ہوتیں ———"

میاں صاحب نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

"ڈبل ڈن ———"

نیلم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اب اصلی کھیل شروع ہوگا اور اس گدھے کو ہم اس کی اصلیت بتائیں گے۔ دیکھو کیانی تم ہر وقت گھگیاتے ہی نہ رہا کرو۔ کبھی کبھی ڈھنگ سے بھی

بات کر لیا کرو ——— کوئی تمہیں منہ میں نہیں ڈال سکتا ——— میں تمہارے ساتھ چلوں گی ———"

اُس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

کیانی کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ بے چارہ شاید زندگی بھر اس پوزیشن میں نہیں آ سکتا تھا کہ کسی سے آنکھ ملا کر بات ہی کر سکے۔ ساری زندگی تو اس نے طالب کمہار اور اس قماش کے دوسرے لوگوں کو لڑکیاں سپلائی کرتے گزار دی تھی۔ اب تو وہ اپنی نظروں ہی میں اتنا حقیر ہو کر رہ گیا تھا کہ اس کی شخصیت ہی تباہ ہو رہی تھی۔

○

شام ڈھلے جب وہ ایم این اے میاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو ان کے استقبال کے لیے میاں خود برآمدے میں موجود تھا۔

اس سے پہلے میاں نے امیر کیانی کو صرف ایک "سپلائر" کے روپ ہی میں دیکھا تھا۔

لیکن ———

آج اُس کے ساتھ ایک خوبصورت جنسی بلی کو دیکھ کر میاں صاحب کی رال ابھی سے ٹپک پڑی تھی۔

اگر یہ عورت واقعی اس کی بیوی تھی تو ایم این اے میاں صاحب اس کی "عزت" کرنے کا پابند تھا۔

"آئیے آئیے جناب کیانی صاحب ——— بڑی دیر کر دی آپ نے ———"

اُس نے دور ہی سے اس طرح بانہیں پھیلا کر اُن کا استقبال کیا جیسے واقعی اُن کے بغیر مرا جا رہا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میاں صاحب بیگم صاحبہ کی وجہ سے دیر ہوگئی آپ تو جانتے ہیں کہ خواتین تیار ہونے میں کتنی دیر لگاتی ہیں۔"

امیر کیانی نے ایم این اے میاں صاحب کی آنکھوں میں نیلم کی شکل پر نظر پڑتے ہی ابھرتے ہوئے ہوس کے ڈورے دیکھتے ہوئے اس کا تعارف کروانا ضروری جانا۔

"ہاں بھئی ـــ ان جیسی بیگمات کو تو حق بھی ہے دیر لگانے کا ـــ"

میاں نے نیلم کے سراپے کو کھا جانے والی نظروں سے تاڑتے ہوئے کہا۔

"جی ذرہ نوازی ہے آپ کی ـــ میرا نام نیلم ہے ـــ"

نیلم نے بھی ایک ہی نظر میں اندازہ کر لیا تھا کہ وہ اس گدھے کو اپنی انگلیوں پہ نچا سکتی ہے۔

"کیانی صاحب نیلم تو سب سے مہنگا ہیرا ہوتا ہے۔"

ایم این اے میاں کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"جی ہاں ـــ لیکن آپ جیسے قدر دان ہی یہ بات جان سکتے ہیں، ان کے لیے تو گدھا گھوڑا ایک برابر ہے ـــ"

نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا اور میاں صاحب کے ساتھ ہی امیر کیانی بے غیرتی سے ہنس دیا۔

تینوں اب میاں کے پرتکلف ڈرائنگ روم میں چلے آئے تھے یہ کوٹھی میاں صاحب نے صرف "موج میلہ" کرنے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ ان کی دو کوٹھیاں اور بھی اس شہر میں موجود تھیں جہاں ان کی بیگمات اور بچے فروکش تھے۔ بظاہر اس کوٹھی میں میاں صاحب نے اپنا سیاسی دھندہ چلا رکھا تھا۔

لیکن ـــ

اصل میں یہاں کیا گورکھ دھندہ چل رہا تھا۔ اس کا علم چیدہ چیدہ ہستیوں ہی کو تھا۔

امیر کیانی جانتا تھا کہ اسے اتنی عزت نیلم ہی کی وجہ سے دی جا رہی ہے ورنہ وہ اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ طالب کمہار کی موجودگی میں میاں صاحب سے مل چکا ہے لیکن انہوں نے آج تک اسے منہ نہیں لگایا بلکہ جھوٹے منہ سے گھر آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اس نے درجنوں لڑکیاں گزشتہ دو تین سال میں میاں صاحب کی اس کوٹھی میں پہنچائی تھیں۔

لیکن ـــ

اس کوٹھی کے دروازے صرف اس کے ساتھ آنے والی لڑکی پر ہی کھلتے تھے، اسے باہر ہی سے واپس لوٹا دیا جاتا تھا۔

"اگر نیلم قابو آ جائے تو اس کا خواب پورا ہو سکتا ہے ـــ"

میاں کے شیطانی ذہن نے رائے دی۔ اس عورت کے ذریعے وہ بہت کچھ کر سکتا ہے ـــ بہت کچھ ـــ

اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ ایک مرتبہ اپنے جال میں پھنس جانے والی اس چڑیا کو اب اڑ کر واپس نہیں جانے دے گا۔ یہی سوچ کر وہ ان دونوں کی خاطر مدارت اس طرح کر رہا تھا جیسے وہ اس کے سگے رشتہ دار ہوں۔

اس دوران امیر کیانی نے اس کے سامنے طالب کمہار کے ظلم و ستم کی الف لیلیٰ کھول دی تھی اور اسے طالب کی ایک ایک زیادتی سے آگاہ کر رہا تھا۔

"دیکھئے نا میاں صاحب یہ ہے تو زیادتی والی بات۔ جب آپ ایک بزنس میں پارٹنر بن جائیں اچھے یا برے۔ پھر دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے طالب کمہار کے لیے کچھ نہیں کیا ـــ خود میں نے ـــ ان کے مجبور کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہر اس ڈرامے میں حصہ لیا حالانکہ ہماری اس بے چارے پولیس آفیسر سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی اور یہ بھی تو ممکن تھا کہ ہم اُسے ہی اس ساری سازش سے آگاہ کر کے کئی گنا زیادہ رقم انعام میں لے لیتے جو طالب کمہار نے کیانی صاحب کو دی ہے۔"

نیلم نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"مس نیلم ـــــ میں آپ کے جذبات کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ وہ شخص کتنا احسان فراموش ہے اس کا اندازہ مجھ سے زیادہ اور کس کو ہو گا۔ میں نے ہی اس نالی کے کیڑے کو آسمان کی بلندیوں پہ اُڑنا سکھایا ـــــ لیکن اب اس کے پر کترنے ہوں گے۔ کیونکہ یہ اپنی اوقات بالکل بھلا چکا ہے۔ صغراں کے ساتھ اس نے جو زیادتی کی اس کا تو آپ کو علم ہو گا ہی ـــــ"!

ایم این اے میاں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔

"مجھے علم ہے میاں صاحب لیکن اس میں آپ جیسے لوگ ہی قصوروار ہیں۔ آپ کی پُشت پناہی کی وجہ سے ہی یہ شخص اتنا اونچا اُڑ رہا ہے۔"

نیلم نے اس ادا سے گردن کو بل دیا تھا کہ میاں صاحب کا دل دھک سے رہ گیا۔

"دیکھیے مس نیلم ـــــ ہم تو کاروباری لوگ ہیں۔ ہماری مجبوریاں آپ سمجھتی ہیں۔ ہم تو قدم قدم پر ایسے لوگوں کے محتاج رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اب سانپ کو دودھ ہی پلاتے رہیں ـــــ میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور اس میں مجھے آپ کی مدد بطورِ خاص درکار ہو گی۔"

میاں نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم تو دل و جان سے حاضر ہیں میاں صاحب۔ آپ آزما کر تو دیکھیں ـــ"

نیلم تو بکرا ذبح کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

آپ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ تو ممکن نہیں لیکن یہ کام چونکہ میرا تھا اور میں نے ہی طالب کو ایس پی کے تبادلے کے لیے کہا تھا۔ اس لیے میری طرف سے یہ حقیر سا نذرانہ حاضر ہے۔ اسے آپ اپنا اور میری دوستی کا آغاز سمجھئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم نے مل کر کام کیا تو ایسے کتنے طالب کمہار آپ کے دروازے پر ناک رگڑیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد یہ کہتے ہوئے ایم این اے میاں صاحب نے اپنے بریف کیس سے نوٹوں کے دو بنڈل نکال کر نیلم کی طرف بڑھا دیے۔

امیر کیانی کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ تو آنکھیں بند کر کے اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی مالیت ۲۰ ہزار سے کم کیا ہو گی۔

"شکریہ میاں صاحب ـــــ ہم بھی انکار کر کے کوئی بدشگونی پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ میرے خیال سے پہلے آپ کا بزنس بہتر ہونا چاہیے۔ اس کے بعد پھر ہم دوسرے معاملے میں ہاتھ ڈالیں گے۔"

نیلم نے کہتے ہوئے بنڈل پکڑ کر اپنے داہنے ہاتھ رکھے بڑے سے بیگ میں ڈال لیے۔

دونوں ایک دوسرے کو شکار اور شکاری کی حیثیت میں دیکھ رہے تھے۔ جہاں ایم این اے میاں صاحب نے اس کے متعلق بہت کچھ سوچ رکھا تھا وہاں نیلم نے بھی اپنے ذہن میں بڑے منصوبے طے کر لیے تھے اور اب وہ انہی عزائم کے ساتھ اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔

امیر کیانی نوکروں کی طرح دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا جبکہ میاں صاحب اور نیلم ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملائے آگے آگے جا رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میاں صاحب میری اگلی ملاقات آپ کے ساتھ سرپرائز کی صورت میں ہو گی۔ آپ کے لیے بڑا زبردست تحفہ لاؤں گی۔ آپ کی توقع سے بڑھ کر ۔۔۔"

اس نے میاں کی رال ٹپکاتے ہوئے کہا۔

"مس نیلم ہمارے لیے آپ کی آمد ہی بڑا نیک شگون ہے ۔۔۔"

میاں نے بھی بے شرمی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

نیلم اور کیانی کو وہ کوٹھی کے گیٹ تک رخصت کرنے آیا تھا۔ جہاں اس نے اپنی پجارو میں انہیں گھر کی طرف روانہ کیا تھا۔ میاں صاحب کا ڈرائیور انہیں چھوڑنے جا رہا تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

بے چارہ منسٹر!

بالے شاہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ باجوہ کو پھاڑ کھاتا۔ زخمی شیر کی طرح وہ بے بسی سے اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ اس کا بہت مالی نقصان ہوا تھا۔

لیکن ۔۔۔

مالی نقصان سے زیادہ اسے اپنی ساکھ عزیز تھی۔

ایسے کبھی نہیں ہوا تھا کہ سردار زئی کی مدد سے اس نے کوئی آپریشن کیا ہو اور وہ ناکام رہا ہو ۔۔۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ باجوہ اس تک کیسے پہنچ گیا۔

"کیا پھر اس نے ریاض جیسا کوئی آستین کا سانپ اُن کی صفوں میں داخل کر دیا ہے" ۔۔۔ اس نے سوچا ۔۔۔ "اگر کوئی مخبری ہوئی تھی تو وہ سردار زئی کے علاقے سے ہوئی تھی ۔۔۔ لیکن اس بات کا بھی بالے شاہ کو علم تھا کہ سردار زئی کا کوئی کارندہ اپنے ہاتھ سے اپنی گردن تو الگ کر سکتا ہے اس کے خلاف بغاوت کی جرأت نہیں کر سکتا ۔۔۔"

پھر کون ہے وہ غدار؟ کون ہے؟

یہ تھا وہ سوال جس نے بالے شاہ ہی کی نہیں سردار زئی کی بھی راتوں کی نیند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرام کر رکھی تھی۔ سردار زئی کے لیے تو یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ اُس کے زیرِ نگرانی جانے والا مال پکڑا جائے۔

اُس نے اگلے ہی روز مقامی وزیر کاکڑ کو اپنے ہاں طلب کیا تھا۔

"مجھے امید ہے کہ آپ تو اپنی پولیس کے تازہ کارنامے پر خاصی مبارکباد بھی وصول کر رہے ہوں گے۔"

اُس نے کاکڑ سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"سردار زئی مجھے بے حد افسوس ہے۔۔۔"

"کیا بکتے ہو ــــ تمہیں افسوس ہے۔ تمہیں تو شرم سے مر جانا چاہیے تھا۔ ارے تم میرے ٹکڑوں پر پلنے والے ــــ میری بیساکھیوں کے سہارے اسمبلیوں میں جانے والے۔ میں نے تمہیں زمین سے آسمان پر اس لیے نہیں بٹھایا تھا کہ تم مجھے ہی ڈسنے لگو گے ــــ کاکڑ! مجھے اپنے مجرم چاہئیں۔ میں اُنہیں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔ اپنے ہاتھ سے ان کے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑنا چاہتا ہوں ــــ تم میری بات سمجھ گئے ہو کاکڑ ــــ صرف افسوس سے بات نہیں بنے گی۔"

سردار زئی نے غصے سے اُس کی بات اس طرح کاٹی تھی کہ ایک مرتبہ تو کاکڑ سہم کر ہی رہ گیا۔

"سردار زئی لالہ! ــــ بات سمجھنے کی کوشش کرو ــــ یہ پولیس کا کام نہیں ہے" ــــ کاکڑ نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

"مجھے اس بات سے کچھ غرض نہیں یہ کس کا کام ہے۔ مجھے میرا مال چاہیے اور اپنے مجرم ــــ سمجھے تم ــــ ورنہ یاد رکھنا تم سب کی چھٹی کروا دوں گا۔"

سردار زئی نے اُسے پھر ڈانٹ دیا۔

اس وقت وہاں سردار زئی کے دو تین اور ساتھی بھی موجود تھے اور ان لوگوں کے سامنے اپنی سُبکی کا منسٹر کاکڑ نے بہت سخت نوٹس لیا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کچھ کر گزرے۔

لیکن ــــ

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہُوا تھا ــــ

کاکڑ نے ابھی سیاست کرنی تھی۔ اس نے تو پرائم منسٹر کی گدی پر نظر رکھی ہوئی تھی اور یہاں تو ابھی سے معاملہ بگڑنے لگا تھا۔ اگر یہ شخص اس طرح اس کے اعصاب پر سوار رہا تو جانے کیا کر گزرے۔

"اسے لگام ڈالنی ہوگی ــــ"

کاکڑ نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ اسمبلی میں سردار زئی کی مدد سے ہی پہنچا تھا۔ سردار زئی اُس کی تب سے مدد کر رہا تھا جب وہ بے ایمانی کے ایک الزام کے تحت اپنی ملازمت سے سبکدوش ہُوا تھا۔

سردار زئی تب اس کے محکمے میں ٹھیکیداری کیا کرتا تھا اور سردار زئی اس کو باقاعدگی سے اپنی بے ایمانی سے حصہ دیا کرتا تھا۔ یہ سردار زئی ہی تھا، جس کے کہنے پر اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا اور وہاں سے ترقی کرتا کرتا پھر یونین کونسل اور اب منسٹری تک پہنچا تھا۔

کاکڑ سے متعلق اس کے حلقۂ انتخاب کے لوگوں کو علم تھا کہ اس سے زیادہ کرپٹ اور بے ایمان شخص اس صوبے میں اور کوئی نہیں ہے۔ وہ اس سے نفرت کرتے تھے۔

اس کے خلاف جا بجا زہر اُگلتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن ——

حیرت انگیز طور پر جب الیکشن کا نتیجہ برآمد ہوتا تو کاکڑ ہی اپنے حلقے سے منتخب ہوتا تھا اس کی وجہ تھی سردار زئی کی دولت اور بدمعاشی ——!

سردار زئی نے جس کی پشت پر ہاتھ رکھا اسے ایوانِ اقتدار تک پہنچا کر ہی دم لیا اور جس کے سر سے ہاتھ اُٹھا لیا اُسے جہنم رسید کر دیا۔

اس بات میں کیا شک تھا کہ اس نے کاکڑ کے مخالف اُمیدوار کو بھرے بازار میں قتل کروا دیا —— اور اس کی راہ کا کانٹا مستقل ختم کر دیا تھا۔

لیکن ——

اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ ہیروئن کے مذموم دھندے میں بھی اُس کا ہاتھ بٹائے۔

جب ایک روز کاکڑ نے اشارے کنایے سے سردار زئی کو بتایا کہ اُس کی پوزیشن بہت خراب ہو رہی ہے اور حکومت اور اپوزیشن دونوں میں اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے سردار زئی کی پشت پناہی حاصل ہے اور سردار زئی کے ڈرگ کے کاروبار کو کاکڑ کی مدد حاصل ہے۔ اس لیے وہ کچھ احتیاط کرے۔

تو سردار زئی نے لاپرواہی سے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا تھا۔

"پھر میں کیا کروں —— اس میں جھوٹ تو نہیں۔ میں نے تمہیں حکمانہ سزا سے بچا کر وزیر بنا دیا۔ یہ کام مفت تو نہیں ہوتے۔ تمہارے مخالف امیدواروں کو قتل کروایا، تمہارے مخالفین کے جلسے اُلٹا دیے —— لوگوں کے ووٹ خریدے پولنگ سٹیشن کے اندر ہنگامہ آرائی کروائی۔ ان کاموں پر کیا پیسہ نہیں اُٹھا میرے باپ نے کوئی زرعی مربعے تو میرے لیے نہیں چھوڑے کہ جن کو فروخت کر کے میں تمہیں وزیر بنواتا۔ ڈرگ کے پیسے سے ہی آخر ایسا کرنا ممکن تھا۔ اگر یہ ڈرگ کا

پیسہ نہ ہوتا تو تم اب کسی جیل کی کوٹھڑی میں سڑ رہے ہوتے۔ تمہاری تو ملاقات کو تمہاری بیوی بھی نہ آتی۔ اس بے چاری کے پاس کیا تھا —— اور تمہاری جوان بیٹیوں کو کیا بنتا؛ تمہیں کچھ علم ہے —— تم کیا کہہ رہے ہو —— بے وقوف انسان آئندہ کبھی بھولے سے بھی یہ الفاظ اپنی زبان پر نہ لانا۔ تمہاری خیریت اس میں ہے کہ چپ چاپ اپنا اور میرا کام کرتے رہو —— اگر زیادہ چوں چراں کی تو اپنی اوقات پر واپس چلے جاؤ گے تمہارے خلاف کرپشن کے جتنے کیس دبے ہوئے ہیں وہ ساری فائلیں ایک ایک کر کے کھل جائیں گی اور تم .... تم مرنا چاہو گے اور مر نہیں سکو گے۔"

ایک ایک لفظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح کاکڑ کے کانوں میں اُتر رہا تھا۔!

○

سردار زئی کتنا خطرناک اور وحشی انسان ہے اس سے زیادہ کسے اس بات کا علم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پالتو کتے کی طرح اس کے اشارے پر دُم ہلانے لگتا تھا۔ اُسے اس بات کا علم تھا کہ اس صوبے کی حکومت میں اُس کے دشمن جانے کب سے اس سنہری موقع کے منتظر ہیں کہ جیسے ہی اس کی پشت سے سردار زئی کا ہاتھ ہٹے وہ اس کا بُرج اُلٹا کر رکھ دیں۔

وہ لوگ سردار زئی کی معاونت حاصل کرنے کے لیے کس حد تک گر سکتے تھے؛ اُن کا ایک ساتھی ہونے کی حیثیت سے کاکڑ سے زیادہ اس بات کو کون جان سکتا تھا۔

وہ تو جانے کب سے اس سنہری موقع کے منتظر تھے کہ سردار زئی اور اس کے درمیان ناراضگی کا کوئی اشارہ انہیں ملے اور وہ اپنا کام دکھائیں۔

یہاں ہر تیسرا ممبر اسمبلی تو کسی قبیلے کا سردار یا اُس کا کوئی رشتہ دار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتا ہے۔ حالیہ الیکشن میں اس کے اشارے پر سردار زئی نے اُس کے جس مخالف امیدوار کو قتل کروایا تھا وہ جانے کب سے کاکڑ کی کمزوری کے منتظر تھے۔ اگر ان لوگوں کو اس بات کی بھنک ہی پڑ گئی کہ سردار زئی اور کاکڑ کے تعلقات کشیدہ ہو رہے ہیں تو وہ کاکڑ کو اُس کے پورے خاندان سمیت نیست و نابود کر کے رکھ دیتے۔

کاکڑ کی چار بیویاں اور بیس بچے تھے ــــــ!

یہ تمام لوگ اُسے بے حد عزیز تھے۔

اُن سب کی کفالت اس کے ذمے تھی اور سب کی عادتیں اُس کی دولت نے بگاڑ کر رکھ دی تھیں۔

اس منسٹری سے اُسے ملتا کیا تھا۔ اس سے تو وہ اپنے گھر کا خرچ نہیں چلا سکتا تھا۔ یہ تو سردار زئی تھا جو ہر ماہ باقاعدگی سے ایک خطیر رقم اُسے پہنچا دیا کرتا تھا اور اُس کے بچے شاہانہ زندگی بسر کر رہے تھے ــــ اپنے گھر بار کی حفاظت کے لیے اُس نے جو "پرائیویٹ آرمی" پال رکھی تھی یہ کس نے فراہم کی تھی؟

سردار زئی نے ــــ اگر وہ اپنا حفاظتی دستہ ہی ہٹا لیتا تو اس کے دشمن کاکڑ کو عالی شان محلات سمیت اڑا کر رکھ دیتے۔

یہ تھیں وہ مجبوریاں جو کاکڑ کو سردار زئی سے باندھ کر رکھے ہوئے تھیں۔

جن کی وجہ سے وہ سردار زئی کے ہر غلط کام میں اس کا مددگار بنا ہوا تھا۔

لیکن ــــــ

اب ایک ایسی قباحت آن پڑی تھی جس نے اُسے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عالمی سطح پر سردار زئی کی ڈرگ سمگلنگ کا بڑی سختی سے نوٹس لیا جا رہا تھا اور کاکڑ کو اپنے انتہائی اہم ذرائع سے یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ ایک

غیر ملکی ایجنسی نے سردار زئی پر بڑی کڑی نگرانی رکھی ہوئی تھی۔ اُس کی حرکات کو سختی سے "مانیٹر" کیا جا رہا تھا جبکہ حکومتی ایجنسیاں بڑی تگ و دو سے اس بات کا پتہ چلانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ سردار زئی کو حکومتی حلقوں میں کس کس کی پشت پناہی حاصل ہے۔

اگر وہ اس مرحلے پر بھی سردار زئی سے چپکا رہا تو عین ممکن تھا کہ ان میں سے کسی بھی ایجنسی کے قابو آ جاتا جہاں سے پھر بچ نکلنے کی کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

حال ہی میں اُس کا جو مال پکڑا گیا تھا گو کہ اس صوبے کی حدود ہی میں پکڑا گیا تھا۔

لیکن ــــــ

یہ "آپریشن" بڑے اعلیٰ پیمانے پر اور اتنے خفیہ طریقے سے پلان کیا گیا تھا کہ یہاں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

"کیوں نہ اپنی راہ کا یہ کانٹا ہی نکال دیا جائے!"

اچانک کاکڑ کے دماغ میں بغاوت نے انگڑائی لی۔ اُس نے سوچا اس سے زیادہ وہ سردار زئی سے کیا فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ اب یہاں کی سیاست پر وہ اپنی حرام کی دولت کے ذریعے ہی گرفت کر سکتا تھا، لیکن اس کے لیے سردار زئی کا مرنا ضروری تھا۔ اگر سردار زئی زندہ رہتا ہے تو لینے کے دینے پڑ جاتے اور وہ کچھ ہوتا جس کا تصور بھی اتنا بھیانک تھا کہ کاکڑ کو سوچتے ہوئے خوف آ رہا تھا۔

سردار زئی کے آدمیوں سے برآمد ہونے والے مال کی نمائش دنیا بھر کے اخباری نمائندوں کے سامنے کی گئی۔ ملک کے ٹی۔وی اخبارات میں ان کی تشہیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی گئی۔ گرفتار شدگان میں سے اکثر کو صحافیوں کے سامنے پیش کیا گیا۔

لیکن ———

حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کسی کی زبان سے سردار زئی یا بالے شاہ کا نام نہیں نکلا۔

مختلف ایجنسیوں نے اُن کی تفتیش کی تھی۔ اُن کے جسموں سے چمڑی ادھیڑ دی گئی تھی لیکن کیا مجال جو اُن کی زبان سے ایک بھی نام اُگلوایا جاسکا ہو۔

اس بات کا بچے بچے کو علم تھا کہ یہ کس کا کام ہے؟

اس علاقے کے اینٹ پتھر جانتے تھے کہ سردار زئی اور بالے شاہ کے علاوہ کوئی یہاں سے گذرنے کی ہمت نہیں رکھتا، لیکن کوئی پولیس کے سامنے نام لینے کو تیار نہیں تھا۔

گرفتار ہونے والوں سے جدید سائنسی انداز میں تفتیش کی گئی تھی۔ اُن پر صرف تھرڈ ڈگری طریقے ہی نہیں آزمائے گئے۔ نفسیاتی طور پر انہیں ہر ممکن طریقے سے قابو کرنے کی کوشش کی گئی۔ انہیں الگ الگ رکھ کر کبھی ایک جیسے اور کبھی گھما پھرا کر سوالات کیے گئے۔ ہر ممکن طریقے سے کوشش کی گئی کہ جیسے بھی ممکن ہو ان میں سے کوئی بالے شاہ یا سردار زئی کے خلاف گواہ بن جائے۔ انہیں بڑی بڑی رقم کا، خاندان کے تحفظ کا، اچھے مستقبل کا لالچ دیا گیا۔ ایک غیر ملکی ایجنسی نے جس کے افسران امریکہ سے بطور خاص تفتیش میں حصہ لینے آئے تھے اُن میں سے دو تین مجرموں کو اعتماد میں لے کر یہاں تک پیشکش کی کہ وہ کسی بھی طرح ان دونوں کے خلاف گواہی دینے پر تیار ہو جائیں تو انہیں اُن کی مرضی کے ملک میں پہنچا دیا جائے گا جہاں وہ بالکل محفوظ ہوں گے۔

لیکن ———

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

ان لوگوں کا ایک ہی جواب تھا کہ یہ مال اُن کا اپنا ہے۔ انہوں نے اپنی مرضی سے سمگل کرنے کی کوشش کی تھی اور انہیں کسی کی پشت پناہی حاصل نہیں ہے۔

کیا مجال جو اس کے علاوہ کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نکلا ہو۔

مختلف ایجنسیوں کے لوگ بے بسی سے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ انہوں نے گرفتار شدگان پر اتنا تشدد کیا تھا کہ اُن میں سے دو کی دورانِ تفتیش موت واقع ہو گئی تھی۔

"سردار زئی کو اب ختم ہو جانا چاہیے۔"

اس نے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

○

کاکڑ کو اس بات کا علم تھا کہ سردار خان اور سردار زئی میں گزشتہ چند ماہ سے ٹھنی ہوئی تھی۔ سردار خان بھی صوبے کا ایک سابق وزیر تھا۔ اُسے اپنے عہدے سے کبھی الگ نہ کیا جاتا اگر سردار زئی نے اُس کے پیچھے ہی ٹانگ نہ اڑائی ہوتی۔

سردار خان نے سردار زئی کے ایک ٹیلی فون پر اس کے ناجائز کام سے انکار کیا تو اس بے چارے کے خلاف طوفان کھڑا ہو گیا۔

دو تین ہفتوں میں حالات ایسے بگاڑ دیئے گئے کہ اُسے اپنے عہدے سے محض اپنی عزت بچانے کے لیے بادلِ نخواستہ استعفیٰ دینا پڑا۔

سردار خان بڑا باعزت مند ممبر اسمبلی تھا۔ اس نے اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ وقت آنے پر وہ سردار زئی کو اس حرکت کا مزہ ضرور چکھائے گا۔ فی الوقت الیکشن کے راستے کی رکاوٹ بھی کاکڑ بنا ہوا تھا۔

اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاکڑ ہی نے دراصل سردارزئی کے اشارے پر اُس کے خلاف ساری مہم منظم کی تھی اور دوسرے ممبران اسمبلی کی طرح سردار خان کو بھی اس بات کا بخوبی علم تھا کہ کاکڑ کو منسٹری تک پہنچانے والا اور کوئی نہیں سردارزئی ہے جس نے اس کی کامیابی کے لیے ڈرگ کا روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا۔

سردار خان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ سردارزئی کو اس ذلالت کا مزہ چکھاتا۔ وہ دو محاذوں پر ایک ساتھ نہیں لڑ سکتا تھا ـــــ اُسے کسی ایک محاذ کے کمزور ہونے کا انتظار تھا۔

O

اُس روز جب سردار خان کو کاکڑ کا فون آیا کہ وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"کوئی نئی چال ـــــ؟" اُس نے سوچا۔

لیکن ـــــ

"کاکڑ کو اس کی ضرورت کیا ہے؟ اب تو وہ منسٹر بھی نہیں رہا اور یوں بھی کاکڑ ہر طرح اس پر بھاری ہے۔" اُسے جواب ملا۔

"ٹھیک ہے تم جانتے ہو کہ مہمان نوازی ہماری روایت ہے ـــــ ہم دُشمن کو بھی جب وہ مہمان بن کر آئے دوست شمار کرتے ہیں ـــــ میرے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں ـــــ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ اب میں کسی چال میں نہیں پھنسوں گا اور نہ ہی تم دھوکے سے مجھ پر وار کر سکو گے؟"

اُس نے بڑی ہمت سے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کاکڑ سے کہا۔

"سردار خان ـــــ میں جانتا ہوں تم یہی سوچ سکتے ہو ـــــ اس لیے میں اکیلا صرف اپنے ڈرائیور کے ساتھ تم سے کسی بھی پرائیویٹ جگہ ملاقات کو تیار ہوں۔ میرے

اور تمہارے درمیان جو بات ہو۔ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے لیکن کسی کو علم نہیں ہونا چاہیئے۔"

کاکڑ نے بڑے ملتجی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔ تم کب آنا چاہتے ہو ـــــ"

سردار خاں نے چاہا کہ تیل اور اس کی دھار کو دیکھ تو لے۔

"آج رات ـــــ"

دوسری طرف سے جواب ملا۔

"میرے بنگلے پر آجاؤ ـــــ رات دس بجے کے بعد کسی بھی وقت مکمل رازداری اور اطمینان سے ـــــ"

دوسری طرف سے سردار خان نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا وہ ٹیلی فون پر کاکڑ سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کاکڑ نے فون رکھ دیا۔

اُس نے اپنی دانست میں سردار خان کا بیڑا غرق کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں نہیں چھوڑی تھی لیکن اُسے اُمید تھی کہ سردار خان دھوکے کی چال نہیں چلے گا اور اسے گھر بلا کر کبھی اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں کرے گا۔ گو کہ ایک خدشہ اُس کے دل کے کسی کونے میں ابھی تک سر اٹھائے ہوئے تھا۔

لیکن ـــــ

اتنا خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ورنہ ڈرامے میں کبھی حقیقت کا رنگ نہ بھرتا۔

O

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب سردار خان کے بنگلے کے دروازے پر موجود چوکیدار نے اُسے کاکڑ کی آمد سے مطلع کیا۔ کاکڑ ایک پرائیویٹ کار میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چور دونوں کے دل میں موجود تھا اس لیے دونوں نے ہی تیاری مکمل کی ہوئی تھی اور ڈرائیور کے روپ میں کاکڑ کے ساتھ ایک ماہر نشانہ باز اور مفرور مجرم موجود تھا جبکہ سردار خان نے اس کے لیے کسی اور ہی طرح کا اہتمام کر رکھا تھا۔

وہ اُسے اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں آیا اور اُس صوفے پر بٹھا دیا۔ جس میں اس کے تباہی کا سارا سامان اتنی مہارت سے نصب کیا گیا تھا کہ کاکڑ کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہ ہو پاتا۔

ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد جب کاکڑ نے مطلب کی بات شروع کی تو سردار نے کمرے میں موجود باقی تمام لوگوں کو باہر جانے کی ہدایت کر دی۔ اب دونوں چائے کی پیالیاں سامنے رکھے ایک دوسرے سے معروفِ گفتگو تھے۔

"سردار خان جو بات میں تم سے کرنے جا رہا ہوں یقیناً تمہارے لیے حیرانگی کا باعث ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم میری نیت پر کوئی اور ہی شک کرو یا اسے بھی کوئی چال سمجھو لیکن میں صرف تمہارا اعتماد حاصل کرنے اور تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ میرے دل میں کوئی چور نہیں اکیلا یہاں چلا آیا ہوں ——— یہی میری نیک نیتی اور خلوص کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ عین ممکن ہے کہ ہمارے درمیان کوئی معاملہ طے پا جائے یا ایسا ممکن نہ ہو لیکن یہ ملاقات خفیہ رہے گی۔ میری یہاں آمد کا علم سوائے میرے ڈرائیور اور خدا کی ذات کے اور کسی کو علم نہیں۔"

"کاکڑ! میرے خیال سے اپنی صفائی پیش کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ تم مطلب کی بات پر آ جاؤ ——"

سردار خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سردار خان میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ماضی میں مجھ

سے بڑی غلطی ہوئی کہ میں نے سردار زئی کے لیے اپنے ایک قابلِ عزت ساتھی کو ناراض کر لیا۔ اب میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں ——"

اس نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے ——؟"

سردار خان نے بڑے پرسکون لہجے میں دریافت کیا۔

"سردار زئی کو قتل کروا کے۔ —— اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم دونوں اس موذی سے چھٹکارہ حاصل کر سکتے ہیں —— تمہارا بدلہ پورا ہو جائے گا اور میرا مستقبل محفوظ۔ میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ اس کارِ خیر کے انجام پاتے ہی تمہاری منسٹری بحال کروا دوں گا —— تم جانتے ہو کہ میں اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنا وعدہ پورا کر سکوں۔"

"ہوں ں ں ——"

سردار خان نے اس کی بات پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کی روز روز کی فرمائشوں سے تنگ آ گئے ہو۔"

سردار خان نے دوبارہ کریدنے کے انداز میں کہا۔

"چلو یہی سمجھ لو ——"

کاکڑ نہیں چاہتا تھا کہ بات کو بحث میں اُلجھا لے —— اُسے بہر صورت اپنا مطلب حاصل کرنا تھا۔

سردار خان چند ثانیے کے لیے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا پھر اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔

وہ ایک خطرناک کھیل کھیلنے جا رہا تھا ——

"دیکھو کاکڑ —— فرض کیا میں تمہاری بات مان بھی لوں اور ایسا ہو بھی جائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو تم اس کے عوض جو کچھ مجھے دے رہے ہو — فی الوقت تو اس کی حیثیت صرف وعدے کی ہے — اگر تم برا نہ مانو تو ماضی کے بارے اور تمہارے تعلقات کے حوالے سے میں یہ بھی سوچنے کا حق رکھتا ہوں کہ عین ممکن ہے تم صرف مجھے استعمال کرنا چاہو اور جب تمہارا کام ہو جائے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لو — یوں بھی اس دھندے میں کسی پر اعتبار کرنے سے بڑی بے وقوفی اور کیا ہو گی — تم یہ بتاؤ کہ فوری طور پر سردار زئی کے قتل کی کیا قیمت ادا کرو گے؟"

"پانچ لاکھ —"

بے ساختہ کاکڑ کے منہ سے نکلا۔

"میں نے سردار زئی کی زندگی کی قیمت پوچھی ہے کاکڑ — عقل کے ناخن لو۔ اتنے پیسے تو یہاں لوگ کسی کتے کو مارنے کے ادا کر دیا کرتے ہیں — دس لاکھ سے کم نہیں ہوں گے — وہ بھی ایڈوانس —"

سردار خان نے لگی لپٹی رکھے بغیر ٹھک سے کہہ دیا۔

"سردار خان — تم زیادتی کر رہے ہو —"

کاکڑ نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

"ٹھیک ہے اگر تم یہ سمجھتے ہو تو ہم یہیں سے لوٹ جاتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کسی کو اس ملاقات کی خبر نہیں ہو گی۔"

سردار خان اس کی بے بسی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے کاکڑ کے ہاتھوں بڑی زک اٹھائی تھی اور اب یہ قرضہ مکمل سود کے ساتھ واپس لوٹانا چاہتا تھا۔

"کچھ کم کرو — میری اتنی پسلی نہیں ہے۔"

کاکڑ نے کہا۔

"کاکڑ — تم کروڑ پتی آدمی ہو — تم نے گزشتہ تین سال میں کروڑوں روپے بنائے ہیں۔ سردار زئی کی طرف سے تمہیں ہمارا حصہ پہنچتا ہے — برابر کا حصہ"۔

سردار خان نے اپنی معلومات کا رعب جماتے ہوئے کہا۔

"چھ لاکھ کر لو —"

کاکڑ نے بدمزگی سے بچنے کے لیے کہا۔ اس نے احساس کر لیا کہ سردار خان اس کی کمزوری کا ہر ممکن فائدہ اٹھائے گا۔

"انسانی جان پر سودے بازی مناسب تو نہیں — پھر بھی میں تمہاری طرف سے تجدید تعلقات کا خیر مقدم کرتے ہوئے سات لاکھ پر معاملہ ختم کرتا ہوں یہ بتاؤ رقم کب ادا کرو گے۔ ایک بات کا خیال رہے کہ مجھے کیش چاہیے۔"

سردار نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تمہیں پرسوں رات اس وقت کیش مل جائے گا۔"

کاکڑ نے کہا۔

"کون لے کر آئے گا؟"

اچانک ہی اس کے سوال نے کاکڑ کو گڑبڑا دیا تھا۔

"میرا کوئی بھی آدمی آ جائے گا۔ تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے، گٹھلیاں گننے سے تو نہیں۔"

کاکڑ نے جواب دیا۔

"نہیں کاکڑ — کیونکہ رازداری ہی میں ہم دونوں کی بقا ہے۔ اس لیے تم خود ہی آنا اور اسی طرح اکیلے۔ جس طرح کسی کو اس ملاقات کا علم نہیں۔ بالکل اسی طرح۔ کسی کو اگلی ملاقات کی خبر بھی نہیں ہونی چاہیے — ہاں سردار زئی کی موت کا جشن ہم دونوں ضرور اکٹھے منائیں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردار خان نے کہا۔

کاکڑ کے لیے اس وقت سوائے اُس کی ہاں میں ہاں ملانے کے اور کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔

سردار خان نے کھڑے ہو کر اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دونوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کر کے اپنی دانست میں یہ "ڈیل" کر لی تھی۔

کاکڑ کو اپنے گھر کے مین گیٹ تک وہ خود رُخصت کرنے آیا تھا اسی طرح خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔ اس کے سر سے بڑا بوجھ اُتر گیا ہے۔

"لو بیٹا تم بھی کیا یاد کرو گے۔ ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں" —— اُس نے دل ہی دل میں کہا۔

○

سردار خان نے اپنی دانست میں صرف حفاظتی اقدام کیا تھا اور جس کمرے میں دونوں بیٹھے تھے وہاں موجود لوگوں کی گفتگو ریکارڈ کرنے کا مکمل انتظام موجود تھا۔ یہ حساس نظام اس کے کارندوں نے اس خوبی سے یہاں چھپایا تھا کہ کاکڑ کو اس کی خبر ہی نہ ہو پائی۔

اب اس نے یہ "بم شیل" چلانا تھا ——!

یہ بم کس کے سر پہ پھٹنا چاہیے؟ اُسے یہی فیصلہ کرنا تھا۔ اُس نے ابھی صوبے میں سیاست بھی کرنی تھی جو تب ہی ممکن تھی جب وہ زندہ رہتا۔ یہ ساری بہاریں زندگی سے تھیں اگر زندگی ہی سے ہاتھ دھو لیے تو پھر یہ سارا تماشہ اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا۔

سردار خان جانتا تھا کہ سردار زئی کو مارنے کے لیے باقاعدہ فوج کی ضرورت ہے۔ اُس کے پاس کچھ غنڈے تو ضرور موجود تھے۔

لیکن ——

یہ لوگ اتنے طاقتور ہرگز نہیں تھے کہ سردار زئی کو مار ڈالتے۔

اگر یہ معجزہ رونما ہو جاتا تو بھی سردار خان کبھی نہ بچ پاتا۔ اوّل تو سردار زئی کے قبیلے کے لوگ ہی اس کی بوٹیاں نوچ لیتے پھر بالے شاہ جیسا بین الاقوامی شہرت کا حامل سمگلر —— کیا وہ اس کے انتقام کی آگ سے بچ پاتا ——؟

اس نے سوچا اور دوسرا فیصلہ کر لیا۔

کیوں نہ وہ خود کاکڑ کی جگہ لے —— اگر اُسے سردار زئی کی پشت پناہی حاصل ہو جاتی تو جیتے جی کسی الیکشن میں بھی شکست کا سامنا کرنا پڑتا۔

اس علاقے کے جس سینٹر یا اسمبلی ممبر کے پیچھے اس کا ہاتھ ہوتا وہ بہر صورت کامیاب ہوتا۔

سردار خان کو علم تھا کہ اگلا الیکشن وہ کبھی نہیں جیت پائے گا۔ کیونکہ اس نے شہری علاقے سے الیکشن لڑا تھا اور ترقیاتی فنڈ کا بمشکل دس فیصد ہی یہاں استعمال ہوا تھا باقی سب کچھ وہ ہڑپ کر گیا تھا اور اس کے مقابلے پر جو شخص الیکشن کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے پاس گو کہ سردار خان جتنا پیسہ نہیں تھا لیکن عزت، نیک نامی اور جذبہ خدمتِ خلق اُس سے کئی گنا زیادہ موجود تھا۔

اور اُس نے ابھی سے اپنی انتخابی مہم کا آغاز بھی کر دیا تھا ——!

وہ جانتا تھا کہ اس کے مخالف کو اس بات کا علم ہی ہو گیا کہ سردار خان کو سردار زئی کی پشت پناہی حاصل ہے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

وہ صوبے سے آگے نکلنے کی سوچ رہا تھا۔

اگر بالے شاہ اور سردار زئی اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیتے تو مرکز میں کوئی بھی منسٹری حاصل کرنا اس کے لیے بہر طور ممکن ہوتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات کے اس پہر جب سردار زئی کے خصوصی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو قدرے حیران ہو کر اُس نے فون اُٹھایا تھا۔

"ہاں ــــ"

اُس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"سردار زئی تمہارے لیے حیرانی کی بات ہو گی کہ میں سردار خان بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔

"تمہاری یہ مجال کہ تم پہلے فون۔۔۔۔"

"غصہ تھوک دو سردار زئی ــــ کبھی کبھی دشمن آستین کے سانپوں سے زیادہ وفادار ثابت ہوا کرتے ہیں ــــ میں جانتا ہوں کہ تمہیں اس وقت اور ان حالات میں فون کرنا اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف ہے لیکن یہ بہت ضروری تھا ــــ تم یقین کر لو گے کہ تمہارا یار غار منشر کا کرٹر تمہارے قتل کی قیمت ادا کر چکا ہے ــــ"

سردار خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے یا تم نے کوئی نشہ کر رکھا ہے۔ تمہارے خیال سے کیا میں اتنا گدھا ہوں کہ تمہاری باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر جاؤں گا۔"

اس نے کہا۔

"نہیں ــــ سردار زئی تم بہت عقل مند ہو ــــ اس لیے تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ میں تمہیں ناراض کر کے کسی بیوقوفی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا ــــ اگر تم اجازت دو تو میں اس وقت تم سے انتہائی ضروری ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

سردار خان نے جواب دیا۔

"میری بہادری آزمانا چاہتے ہو یا مجھے کسی امتحان میں ڈال رہے ہو۔"

سردار زئی کو شاید ابھی تک اس کی کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

"دوسرا مفروضہ کسی حد تک صحیح ہے لیکن میرے خیال سے یہ زیادہ مناسب رہے گا کہ ہم اب فون پر گفتگو کرنے کے بجائے بالمشافہ بات کر لیں۔"

سردار خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم کہاں آنا چاہو گے۔"

سردار زئی کو اب یقین ہو چلا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

"جہاں تم کہو ــــ"

"میرے گھر چلے آؤ ــــ خدا حافظ"

دوسری طرف سے سید زئی نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کی نیند اُڑ گئی تھی اور اب وہ بڑی بے چینی سے سردار خان کا منتظر تھا کہ وہ بوڑھا اس کے لیے کیا تحفہ لے کر آ رہا ہے۔ اپنی خواب گاہ میں بے چینی سے چکر کاٹتے سردار زئی کو قریباً آدھا گھنٹہ بعد اطلاع مل گئی کہ گھر کے دروازے پر سردار خان اس سے ملاقات کا منتظر ہے۔ وہ اکیلا کار میں آیا تھا اپنے ساتھ ڈرائیور بھی نہیں لایا تھا۔

"تلاشی لے کر اندر لے آؤ ــــ"

سردار زئی اب بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ رہا تھا۔

اگلے تین چار منٹ بعد سردار خان ایک چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر سمیت وہاں موجود تھا۔

یہ ٹیپ ریکارڈر اس کے ایک محافظ کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور انہوں نے سردار خان کو بندوق کی زد میں لیا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ اُس سے برآمد ہوا ہے۔"

محافظ نے ٹیپ ریکارڈر سردار زئی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ۔"

اُس نے ٹیپ ریکارڈر کو اچھی طرح چیک کر لیا تھا۔ اس میں کسی بم کا خطرہ نہیں تھا۔

"سردار خان کام کی بات کرو۔ تم بھی جانتے ہو کہ ہم لوگ اپنے دشمن کو بھی مہمان بنانے سے انکار نہیں کیا کرتے۔"

سردار زئی نے سامنے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

سردار خان نے اُس سے دو تین روایتی قسم کے جملوں کے تبادلے کے بعد اصل واقعہ من و عن بیان کرنے کے بعد اُس سے درخواست کی کہ وہ اُس کیسٹ کو سُن لے جو اُس نے بطورِ خاص اس کے لیے ریکارڈ کی ہے۔

سردار زئی نے اُس کی کسی بات پر تبصرہ کیے بغیر کیسٹ چلا دی جس میں کاکڑ اور سردار خان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ موجود تھا۔ اُس کی گھاگ نظروں نے سردار زئی کے چہرے کی بدلتی کیفیات کا بنظرِ عمیق جائزہ لے لیا تھا۔

"تو تم مجھے قتل کرنے آئے ہو۔؟"

آخر میں سردار زئی نے طنزیہ مسکراہٹ اُس کی طرف اُچھالی۔

"نہیں سردار زئی ـــــ میں تمہیں شروع سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کاکڑ دو نمبر ناقابلِ اعتبار آدمی ہے۔ یہ کاکڑ ہی تھا جس نے میرے اور تمہارے درمیان شکوک کی دیوار کھڑی کر کے تمہاری دوستی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اب تمہارا مال پکڑوا کر سرکار دربار میں اور غیر ملکیوں کے پاس اپنے نمبر بنا رہا ہے ـــــ سردار زئی! یہ احسان فراموش شخص ہے جس کا مقصد سوائے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے اور کچھ نہیں

ہے اور اپنا مطلب نکالنے کے لیے یہ شخص کس حد تک گِر سکتا ہے اس کا اندازہ تمہیں ہو چکا ہو گا ـــــ ٹھیک ہے یہاں سب اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ بلا کی طرح انسان اپنے بچے ہی کھانے شروع کر دے۔ میں تمہارے پاس کوئی نمبر بنانے کے لیے نہیں آیا۔ میں تو صرف اس لیے آیا ہوں کہ آج یہ شخص جو سلوک تمہارے ساتھ کروانے جا رہا ہے مطلب نکلنے کے بعد وہ یہی سلوک میرے ساتھ بھی کر سکتا ہے۔ سردار زئی میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے ـــــ ٹھیک ہے اس میں میرا اپنا بھی کچھ مطلب ہو گا لیکن یہ بات تمہیں سمجھ آ جانی چاہیے کہ میں کاکڑ سے بہرحال بہتر دوست ثابت ہو سکتا ہوں۔"

ابھی بات کے ختم ہونے پر اُس نے اپنی نظریں سردار زئی کے چہرے پر جما دی جہاں دُور دُور تک کاکڑ کے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ٹھیک ہے سردار خان میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے ایک آستین کے سانپ کا تعارف مجھ سے کروا دیا۔ سردار زئی کسی کی دوستی کا محتاج نہیں۔ میں ساری حکومت خرید سکتا ہوں ان لوگوں کی قیمت ہی کیا ہے۔ میں اگر کاکڑ کو اس مقام تک پہنچا سکتا ہوں تو......"

اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میرے لیے کیا حکم ہے۔"

سردار خان نے پالتو کتے کی طرح زبان ہلائی۔

جواب میں سردار زئی اُس سے کچھ کہنے لگا اور دونوں کے درمیان ایک منصوبہ طے پا گیا ہے۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ سردار خان اتنا زیادہ مطمئن ہو کر اپنے گھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپس لوٹ رہا تھا۔

اپنے ساتھ ہونے والی کاکڑ کی گفتگو کو ٹیپ کرنے کا اہتمام تو اس نے اپنے تحفظ کے لیے کیا تھا۔

لیکن ـــــ

اندھیرے میں چلنے والا یہ تیر عین نشانے پر لگا تھا۔

○

کاکڑ فتح کے نشے سے چور ساری رات شراب و شباب کے نشے میں بدمست رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے حلقۂ احباب میں سردار خان ہی ایک ایسا شخص تھا جس سے اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ سردار زئی کو قتل کروا سکے۔ ورنہ تو بڑے بڑے سرداروں پر سید زئی کے نام ہی سے خوف طاری ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے سات لاکھ کی کیا حیثیت تھی۔ ایسے کئی سات لاکھ آئے اور گئے۔

"تم بڑے گھٹیا انسان ہو سردار زئی تمہاری جان کی قیمت واقعی اتنی کم ہی ہونی چاہیے تھی۔"

اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

آج رات وہ فتح کے نشے میں جھومتا خود ہی اپنی جیپ چلاتا سردار خان کے بنگلے پر پہنچا تھا۔ راز داری کا اہتمام دونوں طرف سے کیا گیا تھا کیونکہ فی الوقت دونوں ہی ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اپنی جیپ اس نے قلعہ نما کوٹھی کے لان کے اندر پارک کی تھی اور سردار خان کے ایک محافظ کے ساتھ اس کمرے کی طرف جا رہا تھا جہاں سردار خان اس کا منتظر تھا۔

دونوں بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہوئے اور بیٹھتے ہی اپنے ہاتھ میں پکڑا بریف کیس کاکڑ نے کھول کر سردار خان کے سامنے رکھ دیا۔

"گن لو سردار خان ـــــ"

"مجھے تمہاری زبان پر کم از کم اتنا اعتبار ضرور ہے کہ تم اتنی کمینگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔"

سردار خان نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا اور کاکڑ نے بے شرمی سے دانت نکال دیے۔

"سردار خان کام ایک دو روز کے اندر ہو جانا چاہیے۔ آج کل غیر ملکی ایجنسیاں ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ گئی ہیں اگر انہوں نے سردار زئی کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے شروع کر دیے تو خیال رکھنا کہ ماضی میں تمہارا ابھی اُس سے بہت قریبی رابطہ رہا ہے۔ ہم دونوں کی بقا اسی میں ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو اُسے قتل کروا دیں۔"

اُس نے اپنی دانست میں سردار خان کو سمجھانا چاہا تھا۔

اچانک ہی اس کے پہلو میں موجود دروازے سے لٹکے بھاری پردے کے پیچھے ہونے والی سرسراہٹ نے کاکڑ کو چونکا دیا۔ اس نے گردن گھمائی اور اُسے یوں لگا جیسے کائنات کی گردش رک گئی ہو۔ سردار زئی پردے کے پیچھے سے برآمد ہوا اور بڑے اطمینان سے چلتا ہوا اس کے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

"سردار زئی تم ـــــ"

گھبراہٹ میں ان کے منہ سے بمشکل تین الفاظ نکلے تھے۔

"ہاں میں۔ کیوں مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بھئی میں نے سوچا تم مجھے قتل کرنے کا کیا تکلف کرو گے میں خود ہی قتل ہونے آ جاؤں۔ یہ لو اور خود مجھے مار ڈالو۔"

بہکتے ہوئے اس نے ایک پستول کپکپاتے کاکڑ کی گود میں پھینک دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم نے غدّاری کی ہے۔ یہ غلط ہے سردار خان ـــــ تم نے گھٹیا حرکت کی۔ اپنے گھر بلا کر مجھے.....؟"

اُس نے پستول جھپٹ کر اُٹھایا اور پاگلوں کی طرح اُسے ہاتھ میں پکڑ کر سردار خان کی طرف لہراتے ہوئے کہا۔

"میں نے کوئی غدّاری نہیں کی کاکڑ ـــــ تم شاید اس بات کو نہ سمجھو۔ یہ کوئی بے اصولی بھی نہیں ہے۔ میں نے تو بڑی عقلمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تم نے مجھے بے وقوف بنانا چاہا۔ میں بن گیا۔ اب تمہاری باری ہے۔"

سردار خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سردار خان تم نے بہت غلط روایت قائم کی ہے ـــــ تم....."

"بکواس کرتے ہو تم ـــــ" سردار خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مروجہ سیاست میں اس سے بہترین روایت قائم ہی نہیں کی جاسکتی۔ میں نے ثابت کیا ہے کہ میں تم سے بڑا اداکار ہوں۔ تم سے بڑا سیاست دان۔ جو سیاست دان بن بیٹھے ہوئے اپنے دُشمن سے حُسنِ سلوک سیاست کے بجائے جہالت ہے۔ تم گدھے اور جاہل انسان ہو۔ تم جیسے نااہل کو تو زندہ رہنے کا حق نہیں ملنا چاہیے۔ تم منسٹر بنے پھرتے ہو ـــــ تم سے تو میرے منشی زیادہ عقل مند ہیں ـــــ تمہیں تو سیاست کی الف بے کا علم نہیں ـــــ تم جتنی جلدی مر جاؤ اچھا ہے ـــــ خس کم جہاں پاک۔"

سردار خان نے طنزیہ انداز میں اس کی اچھی خبر لے لی۔

"کمینے ـــــ غدّار ـــــ"

یہ کہتے ہوئے غصّے اور خوف سے کپکپاتے ہاتھوں سے کاکڑ نے اس کی طرف پستول سیدھی کی اور اس کا ٹریگر دباتا چلا گیا۔

لیکن ـــــ

پستول تو خالی تھا۔ وہ تو اذیت پسند درندے تھے۔ انہوں نے تو سیاست اور سرداریوں کی آڑ میں اپنی وحشت چھپا رکھی تھی۔ جب کبھی انہیں ایسا موقع ملتا تو جی بھر کے اپنی اس جنونی جبلّت سے لُطف اندوز ہُوا کرتے تھے۔

"اب تو بالکل ثابت ہو گیا کہ تم گدھے ہو۔ پرلے درجے کے احمق۔ بیوقوف انسان کیا سردار زئی یا میں تمہاری طرح پاگل ہیں کہ بھرا ہوا پستول تمہارے ہاتھ میں تھما دیں گے۔ اسے فوراً مار ڈالو سردار زئی ـــــ فوراً ـــــ بے وقوف لوگ جانے کہاں سے سیاست میں منہ مارنے چلے آتے ہیں۔"

سردار خان نے جنونیوں کی طرح قہقہہ لگاتے ہوئے سردار زئی سے کہا جس نے اس سے بھی زیادہ بلند قہقہہ لگایا تھا۔

"تم مجھے معاف کر دو سردار زئی ـــــ تم جو کہو گے وہی ہوگا۔ وہی ہوگا۔"

اچانک ہی منسٹر کاکڑ اپنی جگہ سے اُٹھا اور پالتو کتے کی طرح ڈرگ سمگلر سردار زئی کے قدموں سے لپٹ گیا۔

"ٹھیک ہے ـــــ تمہیں معاف کر دوں ـــــ سانپ کو چھوڑ دوں تاکہ دوبارہ وہ زیادہ تیاری کے ساتھ ڈنک مار سکے۔ ٹھیک ہے کاکڑ میں سیاست دان نہیں سمگلر ہوں سمگلر ـــــ یہ بے وقوفیاں تم لوگوں کو راس آسکتی ہیں مجھے نہیں۔ ہمارے بزنس کا تو سیدھا سا اصول ہے کہ سانپ کو سر اُٹھانے سے پہلے ہی کچل دو ـــــ"

اُس نے کاکڑ کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"ہمارا بھی یہی اصول ہے۔ دیکھ لو میں نے اس پر عمل کیا ہے ـــــ منسٹر تو مجھے ہونا چاہیے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردار خان پر دحشت سوار تھی۔

کاکڑ بے بس اور خوف کے مارے بچّوں کی طرح روتے اور گھگیاتے ہوئے کبھی سردار زئی اور کبھی سردار خان کے قدموں سے لپٹ رہا تھا اور وہ دونوں بھی اُسے مرنے سے پہلے اچھی طرح ذلیل کرنا چاہتے تھے تاکہ اپنی اپنی حیوانی حس کو تسکین دے سکیں۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے بندروں کے ہاتھ میں گڑیا آگئی ہو اور وہ اُسے بُری طرح ادھیڑنے پر تُلے ہوئے تھے۔

"بس زئی ــــ بہت ہو چکا۔ اتنی مہلت تو حکومت پھانسی کے مجرم کو نہیں دیا کرتی جتنی ہم اُسے دے رہے ہیں۔"

سردار خان نے اچانک ہاتھ اُٹھاکر کہا۔

"ٹھیک ہے سردار خان ختم کرو یہ قصہ ــــ"

سردار زئی نے کہا اور سردار خان نے تالی بجائی۔ پلک جھپکتے میں وہاں تین دیو موجود تھے۔ جنہوں نے روتے چلّاتے کاکڑ کو اُٹھایا اور زندہ ڈولی کر کے باہر لے گئے۔

اگلے روز کاکڑ کی لاش اس کی تباہ شدہ کار سمیت شہر سے دس بارہ میل دُور ایک شاہراہ سے برآمد ہوئی تھی۔ اُس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے شراب کے نشے نے اُسے بدحواس کر دیا ہو اور وہ ایک پتھریلی چٹان سے جا ٹکرایا۔

کار میں ایک شراب کی بوتل اُس کے نزدیک ہی گری پڑی تھی۔ میڈیکل رپورٹ نے بھی یہی ثابت کیا کہ مرحوم نے بہت زیادہ شراب پی رکھی تھی اور نشے کی حالت میں کار پر قابو نہ رکھ سکا۔ اُس کی موت پر سردار خان نے بڑا جذباتی بیان دیا تھا اور کہا تھا کہ سیاسی اختلافات کے باوجود مرحوم ایک عظیم انسان تھے جن کی ساری زندگی جدّوجہد سے عبارت تھی اُن کی موت سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے وہ شاید کبھی نہ پُر ہو سکے۔

سردار زئی نے اپنے محافظوں سمیت اُس کی موت کی تمام تقریبات میں آگے سے شرکت کی تھی ــــ اس نے اخباری نمائندوں کے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اپنے عزیز دوست کی موت کے صدمے سے اتنا نڈھال ہو چکا ہے کہ اُسے کوئی ڈھنگ کی بات ہی نہیں سوجھ رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سازش

نیلم کی اگلی ملاقات واقعی بڑی بھرپور تھی۔

اُس نے میاں صاحب کو آٹے دال کا بھاؤ سمجھا دیا تھا اور میاں کی گھاگ اور زمانہ ساز آنکھوں نے نیلم کے بہت اندر تک جھانک کر دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس عورت کی مدد سے بہت آگے نکل سکتا ہے۔

اُس نے دیکھا تھا کہ بابے شاہ نے ایسی ہی عورتوں کو ہمیشہ بطور "کوریئر" (مال لے جانے والی) استعمال کیا تھا۔ یورپی ممالک کی اکثر جیلوں میں اس ملک کی بڑی بڑی بیگمات یا اُن کی صاحبزادیاں جو آج اپنے کیے کی سزا بھگت رہی تھیں انہیں بابے شاہ نے ہی گھر سے یہاں تک پہنچایا تھا۔

کچھ عرصے سے سختی ہونے لگی تھی۔

لیکن ــــ

کام تو بند نہیں ہوا تھا اور پھر میاں تو ساری زندگی اس مقولے پر عمل پیرا رہا کہ ایک در بند تو سو در کھلے۔

اُس نے کبھی کسی ایک پر تکیہ کیا ہی نہیں تھا۔

جب سے وہ بابے شاہ کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اُس روز سے اُس کے اندر یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی تھی کہ وہ بھی بابے شاہ کی طرح اس ملک کے گنے

چنے امیر آدمیوں میں شمار ہو سکتا ہے۔

جہان خان کی صورت میں اُسے ایک مضبوط ساتھی پہلے ہی سے مل چکا تھا جس کے ذریعے وہ کم از کم اپنے ملک کے کسی بھی حصے میں جتنا مال چاہے وصول کر سکتا تھا۔

کیا نیلم کو آمادہ کیا جا سکے گا؟

یہ تھا وہ اہم سوال جو آج کل ایم این اے میاں صاحب کے سر پہ، ذہن پہ سوار رہتا تھا۔

اُس کا دل کہتا تھا کہ اگر اُس نے سلیقے سے اس عورت پر سرمایہ کاری کی تو وہ وقت بہت جلد آ جائے گا جب وہ اس کے ذریعے یورپی ممالک کے دو تین کامیاب پھیرے لگا لے گا۔ جس کا مطلب تھا کہ ساری زندگی عزت کی روٹیاں ــــ اور اُسے چاہیے بھی کیا تھا۔

اگر نیلم کے ذریعے دو تین کامیاب چکر لگ جاتے تو عین ممکن تھا کہ ایم این اے میاں صاحب کوئی بڑی منسٹری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ فی الوقت ان کے پاس اس کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ گزشتہ دو سالوں میں مہنگائی کے ساتھ ساتھ اراکین اسمبلی کی قیمت بھی بانس کے درخت کی طرح بڑھی تھی اور "ہارس ٹریڈنگ" نے اب باقاعدہ صنعت کی شکل اختیار کر لی تھی۔

نیلم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

انسانی خرید و فروخت کا جو دھندہ ایم این اے میاں صاحب نے گزشتہ چند سال سے اختیار کیا تھا۔ نیلم نے شعور کی آنکھ کھلتے ہی اُس کے مظاہر دیکھنے شروع کر دیے تھے۔

اس کی یہی کوشش تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہے میاں صاحب کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرے۔ اُن سے زیادہ سے زیادہ رقم اینٹھ لے اور وقت پڑنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر اُسے طالب کمہار سے ٹکرا کر اپنے انتقام کی آگ بھی ٹھنڈی کر لے۔

نئے انتخاب سر پر آ رہے تھے اور میاں صاحب کو اس کے لیے نوٹوں کی بوریاں درکار تھیں۔

جب سے بابے شاہ کا مال پکڑا گیا تھا اُس کی حالت باؤلے کتے کی سی ہو رہی تھی جو غصہ آنے پر اپنے مالک کو بھی کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

اس نے میاں سے اگلی کھیپ اُٹھانے کے لیے لمبی رقم کا مطالبہ داغ دیا تھا اور بظاہر یہ کہہ کر اس کی تشفی کروا دی تھی کہ مال غیر ملکی منڈی میں پہنچنے کے بعد وہ یہ رقم میاں صاحب کے حصے کے منافع سمیت واپس لوٹا دے گا۔

میاں صاحب کے پاس "ناں" کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔

وہ جانتے تھے کہ بابے شاہ کی "درخواست" بھی حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ دوسری طرف طالب کمہار تھا جس کے ذریعے انہوں نے ملک کے ایک مقتدر اخبار کے رنگین صفحات تک رسائی حاصل کر رکھی تھی تاکہ الیکشن کے دوران تشہیری مہم جاری رکھ سکیں۔ طالب کمہار عموماً انہی مواقع پر اُن کے کام آیا کرتا تھا۔

آج انہوں نے حسبِ سابق طالب کمہار کو اسی مقصد کے لیے رات کے کھانے پر بلایا تھا ——!

"الیکشن آ رہے ہیں طالب صاحب اور اس مرتبہ میں وزارت کا اُمیدوار ہوں۔"

میاں صاحب نے بالآخر آمدم برسرِ مطلب پر آتے ہوئے کہا۔

"اچھا ——"

طالب کمہار نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"طالبے! اس بات کو نہ بھولا کرو کہ ہم پرانے وقتوں کے یار ہیں۔ ٹھیک ہے تم نے اپنی مجرمانہ سرگرمیاں چھپانے کے لیے مجھ سے زیادہ مضبوط حصار اپنے گرد

باندھا ہے۔ کیونکہ حکومتیں آنی جانی چیز ہیں لیکن تمہاری نوکری پکی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ مت بھولنا کہ زندگی کے اس حمام میں ہم دونوں ننگے ہیں۔"

زندگی میں پہلی مرتبہ میاں صاحب کو طالب کمہار پر اس کے سامنے غصہ آیا تھا۔

"اچھا —— مجھے دھمکانے کے لیے تم نے یہاں بلایا تھا شاید —— ماضی کے حوالے سے مجھے تم بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔" ——

طالب کمہار کا طنز برقرار تھا۔

"تم کچھ بھی سمجھ لو —— لیکن میں یہی چاہتا ہوں کہ ماضی کی طرح ہم مستقبل میں بھی اچھے دوست ثابت ہوں اور ایک دوسرے کے خلاف مشکلات کی بجائے آسانیاں پیدا کریں۔"

ایم این اے میاں صاحب نے لہجے کی کرختگی پر قدرے قابو پاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میاں صاحب میرے اور تمہارے درمیان مفادات کا رشتہ ہے۔ اگر سیاست میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد بھی تمہیں اس بات کی سمجھ نہیں آئی تو آج یہ بات جان لو کہ یہ رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے اتنا ہی نازک بھی —— جب تک ہمارے مفادات مشترکہ ہیں ہماری دوستی قائم ہے اور ....."

اُس نے فقرہ اُدھورا چھوڑ کر سگریٹ سلگانا شروع کر دیا۔

"طالب میں نے کبھی تمہارے حصے میں ڈنڈی نہیں ماری۔ تمہیں جو کام کہا اس کا مناسب معاوضہ ادا کیا ہے۔"

میاں صاحب نے قدرے کنفیوز ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا —— آپ اسے حصہ سمجھتے ہیں۔ ایس پی سے دشمنی میں مول لوں۔ لاکھوں کا منافع آپ کو پہنچے اور میرے حصے میں چند ہزار آئیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طالب کمہار نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"دیکھو طالب! کسی بزنس میں حصہ دار ہونا اور بات ہے اور کسی بزنس مین کی مدد کرنا اور بات ——— میں نے تمہیں اس بات کا اتنا ہی معاوضہ ادا کیا ہے جتنا کوئی بھی بزنس مین اس کام کے لیے دے سکتا ہے۔"

میاں نے کہا۔

"یہ تمہارا حسنِ ظن ہے اور تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ ڈی سلیم باجوہ اے ایس پی اب ایس پی بن کر اس شہر میں وارد ہونے والا ہے۔ تم اس سے دوگنا رقم دے کر کسی اور سے کہنا کہ اس کا تبادلہ کروا دے۔"

طالب کمہار نے اس کے سر پہ بم پھینکتے ہوئے کہا۔

ایک مرتبہ تو باجوہ کی دوبارہ آمد کی خبر نے ایم این اے میاں کے ہاتھ پاؤں ہی پھلا کر رکھ دیے۔

لیکن ———

دوسرے ہی لمحے وہ مطمئن ہو گیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ حکومت اس کی پارٹی کی ہو اور اس کی مرضی کے بغیر باجوہ واپس آ جائے۔ ان حالات میں تو خصوصاً ایسا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کیونکہ نئے الیکشن نزدیک آنے کی وجہ سے "ہارس ٹریڈنگ" زوروں پر تھی اور وزارتِ عظمیٰ کے امیدوار مخالف پارٹیوں کے ممبران کو ابھی سے اگلے الیکشن میں اپنی پارٹی میں شامل کرنے کی دوڑ میں شامل ہو چکے تھے۔

وہ طالب کمہار کی رگ رگ کو سمجھتا اور جانتا تھا کہ طالب کو اس طرح کی "ذہنی بلیک میلنگ" پر کمال حاصل ہے۔ اس نے ہوا میں یہ تیر میاں صاحب کو پریشان کرنے کے لیے چلایا تھا۔

"دیکھ لیں گے اسے بھی ——— فی الوقت تو ہم جس موضوع پر بات کر رہے ہیں وہ زیادہ ضروری ہے۔"

میاں صاحب نے بظاہر خود کو مطمئن ظاہر کرنے کی شاندار اداکاری کی تھی لیکن طالب کمہار بھی پورا ماہرِ نفسیات تھا اور جان گیا کہ میاں صاحب اندر سے دہل کر رہ گئے ہیں۔

"میاں صاحب! اس میں بات کیا کرنی اور کہنی ہے ——— سیدھی سی بات ہے اگر آپ نے پوری "الیکشن کمپین" کا ٹھیکہ دینا ہے تو وہ کہہ لیں یا پھر وقتاً فوقتاً آپ کی تشہیر ہوتی رہے گی اور آپ اسی حساب سے ادائیگی کرتے رہیں۔"

طالب کمہار نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

"ہمارے لیے کوئی خصوصی چکر نہیں چلاؤ گے۔"

میاں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اس میں خاص عام والی تو کوئی بحث ہی نہیں اٹھتی میاں صاحب جتنا آپ گڑ ڈالیں گے اتنا ہی میٹھا ہوگا ———"

طالب کمہار اپنی اوقات دکھانے لگا۔

"ٹھیک ہے ———"

میاں نے دل ہی دل میں کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اس مرحلے پر وہ بھڑوں کے اس چھتے کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

دونوں تھوڑی دیر ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایم این اے میاں صاحب کے دل میں طالب کمہار کے خلاف ایک مستقل گرہ بندھ گئی تھی۔ وہ طالب کمہار سے کم منافق نہیں تھا۔

اب اسے انتظار تھا اس لمحے کا جب وہ طالب کمہار کو اس کی اوقات یاد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلا سکے۔

O

مین ہیٹن کے چائنا ٹاؤن کا یہ علاقہ ایسا خطرناک تھا کہ دن کو بھی اس طرف سے عام لوگ کنی کترا کر گزرتے تھے۔

یوں تو نیویارک میں اور بھی ایسے علاقے تھے جو جرائم کا مخصوص ریکارڈ رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ دہشت کی علامت بنے رہتے۔

لیکن ——

مین ہیٹن کے اس چائنا ٹاؤن کی بات ذرا مختلف تھی۔ اس علاقے میں چینی نژاد غنڈوں کا مکمل کنٹرول تھا اور یہاں سے بروک لین تک جتنی بھی منشیات سپلائی ہوتی تھیں اس کا مرکز یہی علاقہ تھا۔

اس علاقے پر "مافیا" کے مضبوط گروپ "ناپل" کا قبضہ تھا۔ بروک لین سے پھر دوسرے گروپ "کامورا" کی بادشاہت شروع ہوتی تھی جبکہ کوئینز پر "انسٹاریکا" کا قبضہ تھا۔

ان تینوں گروپوں کا تعلق بین الاقوامی ڈرگ مافیا سے تھا لیکن تینوں نے اپنی سرگرمیوں کے لیے الگ الگ علاقے منتخب کر رکھے تھے گویا کہ ایک مجرمانہ معاہدے کے تحت یہ لوگ ایک دوسرے کے کام میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

لیکن ——

ایسا اکثر ہوتا کہ ایک گروہ کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی اور دونوں کے درمیان مہینوں گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ یوں تو امریکہ میں درجنوں سرکاری ایجنسیاں ڈرگ کے خاتمے کے لیے سرگرم عمل ہیں لیکن (ڈی ای اے) ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن کو ہمیشہ سے خصوصی حیثیت حاصل رہی ہے

ڈی ای اے کے سینکڑوں ملازمین اس علاقے میں مختلف سوانگ رچا کر گھومتے رہتے تھے لیکن ان کا مقابلہ "ناپل" سے تھا جو اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ یہ لوگ بڑی صفائی سے ایف بی آئی، ڈی ای اے اور دیگر ایجنسیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جاتے تھے۔

"مافیا" کے تینوں گروپوں کے روابط دنیا بھر میں موجود ڈرگ سمگلروں سے تھے۔

لیکن ——

چینی نژاد "ناپل" سے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ لوگ کراچی، بمبئی، بنکاک، وین تان، ماکاؤ اور ہانگ کانگ کے راستے امریکہ تک ڈرگ پہنچاتے تھے۔ تھائی لینڈ، لاؤس، برما، جنوبی چین، بھارت اور پاکستان کے سمگلروں سے ان کے روابط تھے اور دنیا کی خطرناک "گولڈن ٹرائی اینگل" پر ان کو دسترس حاصل ہونے کے سبب "مافیا" کے باقی دونوں گروپوں کے مقابلے میں "ناپل" کی سرگرمیوں پر امریکن زیادہ کڑی نگاہ رکھتے تھے۔

چائنا ٹاؤن کے اس "گرل" میں حسبِ سابق رونق لگی تھی جہاں چند سکوں کے عوض گھٹیا قسم کی جنسی تماش بینی کی جا سکتی ہے۔

ہیری اسی "گرل" کے ایک کونے میں لگے کوائن بکس میں دو "نِکل" ڈالنے کے بعد بظاہر تیسرے درجے کے جنسی ذہنی مریضوں کی طرح ایک برہنہ لڑکی سے مصروفِ گفتگو تھا جب اس نے ناٹے قد کے دکٹر کو اندر داخل ہوتے دیکھا جو اس پر ایک چھچلتی ہوئی نظر ڈال کر میگزینوں والے حصے کی طرف چلا گیا تھا اور اب ہوسناک نظروں سے وہاں موجود گندے میگزینوں پر نظر دوڑا رہا تھا۔

جب تک ہیری اس کے نزدیک پہنچتا دکٹر نے ایک میگزین خریدنے کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پسند کر لیا تھا جس کی ادائیگی کاؤنٹر پر کرنے کے بعد اُس نے "ٹریش" "بن" میں ٹرانسفر کر دیا۔ دونوں نے قریباً دو فرلانگ کا فاصلہ اسی طرح ایک دوسرے کے تعاقب میں طے کیا تھا۔

اس درمیان میں تیسری سٹریٹ پر آگئے تھے اور اب دونوں نے اس بات کا مکمل اطمینان کر لیا تاکہ کوئی اُن کا تعاقب نہیں کر رہا۔

ہیری کی وکٹر کے ساتھ یہ گیارہویں ملاقات تھی۔

لیکن ——

ہر ملاقات کے لیے وہ مختلف طریقے اختیار کرتا تھا۔ ہیری کو اکثر اُس کی ان حرکات سے اُلجھن ہونے لگتی تھی لیکن معمولی سی خدمات کے عوض وکٹر کی طرف سے اسے جو ادائیگی ہوتی تھی اُس کے سامنے ان اُلجھنوں کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی تھی۔!

وکٹر نے اب اپنی رفتار بڑھالی تھی اور جلد ہی وہ ہیری کو اپنی موجودگی کا احساس دلا کر اُس سے آگے نکل گیا۔

اب ہیری اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔ انہوں نے اس طرح مزید چار فرلانگ کا سفر پیدل طے کیا۔ ہیری دل ہی دل میں اسے کوس رہا تھا کہ اس کم بخت کو کب اپنے محفوظ ہونے کا یقین آئے اور اس کی جان چھوٹے۔ خدا خدا کر کے ہیری کی مشکل آسان ہوئی جب اُس نے وکٹر کو ایک "سب وے" (زیرِ زمین ریلوے سٹیشن) کی طرف گھومتے دیکھا۔ دونوں سیڑھیوں کے راستے زمین کے پیٹ میں اُترتے چلے آرہے تھے۔

وکٹر نے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر ایک ٹکٹ خریدا اور دوسرا ٹکٹ ہیری نے خرید لیا۔ دونوں اس پلیٹ فارم کی طرف آگئے تھے جہاں سے ایف ٹرین چلتی تھی۔

ہیری کو سمجھ آگئی کہ "جمیکا کاؤنٹی" کی طرف چلنے والی ایف ٹرین میں اس وقت رش نہیں ہوتا۔

چند سیکنڈ بعد ہی ٹرین آگئی اور دونوں ایک ہی ڈبے میں سوار ہو گئے جس کے ایک کونے میں موجود خالی سیٹوں میں سے انہوں نے ایک بڑی سیٹ سنبھال لی اور ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ گئے۔

"خدا کا شکر ہے —— تمہارے سفر کا اختتام ہُوا۔ میری تو اب ٹانگیں تھک سی گئی تھیں!" ہیری نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے لمبی سانس لے کر کہا۔

"میں یہ سب کچھ تمہاری حفاظت کے لیے کرتا ہوں —— تم جانتے ہو یہاں قدم قدم پر تمہارے لیے جال بچھے ہیں —— اور دل کا تو ذکر ہی کیا اگر تمہارے "باس" کو ہی اس بات کی بھنک پڑ گئی کہ تمہارا رابطہ ہمارے ساتھ ہے تو جانتے ہو وہ تمہارا کیا حشر کرے گا —— ہیری! ہمارے لیے تمہاری جان سے زیادہ عزیز اور کچھ نہیں ہے۔"

وکٹر نے حسبِ سابق بظاہر بڑے دوستانہ لہجے میں کہا لیکن ہیری سمجھ سکتا تھا کہ اس بھولی بھالی شکل والے درمیانی عمر اور پتلے جسم کے وکٹر کے اندر کتنا خونخوار اور وحشی درندہ موجود ہے۔ وہ پلک جھپکنے میں کسی کی بھی جان لے سکتا تھا۔

ہیری کو اس کی طاقت کا مظاہرہ دیکھنے کا ایک موقعہ تیسری ہی ملاقات میں مل گیا تھا جب اس نے بروک لین کی پندرھویں سٹریٹ پر ساڑھے چھ فٹ لمبے قد کے نیگرو کے پیٹ میں ایک لات اسی طرح گھما کر ماری تھی کہ پھر آئندہ کبھی تک اُسے زمین سے اُٹھنا نصیب نہیں ہُوا۔

اس نیگرو نے یہاں کی روایت کے مطابق اچانک ایک کونے سے برآمد ہو کر ہاتھ میں چاقو لہراتے ہوئے ان سے بٹوے نکالنے کا مطالبہ داغ دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیری کا بھی زیرِ زمین دنیا کا باشندہ تھا اور ایسے کھلونوں سے اُسے بھی خاصی رغبت رہی تھی لیکن اس جن کو اپنے سامنے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو وہ بوکھلا کر ہی رہ گیا تھا۔

ڈکرٹ نے بظاہر خوفزدہ اور مغلوب نسکار کی سی اداکاری کرتے ہوئے اپنی جیکٹ کی جیب میں اس طرح ہاتھ ڈالا تھا جیسے واقعی اپنا "والٹ" نکال کر اس غنڈے کو تھما دے گا۔

لیکن ——

یہ کیا —— ؟

اُس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کا سا کوندا لپکا۔ جب اُس نے دیکھا کہ برق رفتاری سے ڈکرٹ اپنی جگہ کھڑا کھڑا گھوما اور اُس کی گھومتی ہوئی ٹانگ کی ایڑی پوری قوت سے خدا جانے اُس کالے جن کے پیٹ کے کس حصے پر لگی کہ وہ اپنے چاقو سمیت زمین پر گر پڑا اور اُسے دوبارہ اُٹھنا نصیب نہ ہوا۔

ڈکرٹ نے اپنے گرے ہوئے نسکار پر ایک نظر ڈالی اور ——
"HAVE A GOOD DAY" کہہ کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہیری کافی دیر تک ہونقوں کی طرح منہ اُٹھائے اُس کے پیچھے چلتا رہا ——

"کیا رپورٹ ہے؟"

ڈکرٹ نے وقت ضائع کیے بغیر پوچھا۔

"بدھ کو چھ بجے شام کا پروگرام ہے۔"

ہیری نے جواب دیا۔

"مال لینے کون جا رہا ہے؟"

اگلا سوال ہوا۔

"جیفسن اور ہارڈی جائیں گے —— خوش قسمتی سے میں ان میں شامل نہیں ہوں گا۔"

ہیری نے جواب دیا۔

"ویل ڈن —— بہت اچھے —— تم آج ہی کسی کام کے بہانے سے شہر سے کھسک جاؤ تاکہ دو روز بعد ہونے والی کسی بھی کارروائی کے ضمن میں تم پر شک ہی نہ کیا جا سکے۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پہلے سے موجود لفافہ نکال کر اُسے تھما دیا۔

ندیدے بچوں کی طرح لفافہ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے ہیری نے سب سے پہلے اس میں موجود نوٹوں کا جائزہ لیا۔ یہ سو سو ڈالر کے دس نوٹ تھے۔ اُس کی طرف سے اس "معمولی سی اطلاع" کی قیمت —— !

لیکن ——

جسے وہ معمولی سی اطلاع سمجھ رہا تھا۔ وہ ڈکرٹ کے لیے کتنی غیر معمولی خبر تھی اس کا اندازہ اُسے ہو جاتا تو وہ اپنی اطلاع کے لیے ایسے ہزاروں نوٹ بھی ناکافی سمجھتا۔

"کرین ٹرن پائیک" کا اسٹیشن آ گیا تھا۔

"تم یہاں اُتر جاؤ —— خدا حافظ۔"

اچانک ہی ڈکرٹ نے کہا اور ہیری جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ ٹرین قریباً رُک چکی تھی۔

ڈکرٹ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اُس نے ہیری کے الوداعی سلام کی بھی پروا نہیں کی تھی اور بظاہر بالکل لاتعلق سا ہو کر اُس بوڑھی عورت کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ جو ٹرین میں سوار ہو رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابیری کے تو فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں تھی کہ جو اطلاع اُس نے وکٹر کو دی ہے۔ دراصل یہ ایک تصدیق تھی۔ کیونکہ جس شخص نے کراچی سے نیویارک تک سفر کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ اُسے تو وکٹر ہی کے دوسرے ساتھی نے تیار کیا تھا۔ ایسے ڈرامے وہ لوگ بڑی خوبصورتی سے رچایا کرتے تھے ـــــ اس طرح وہ جہاں اپنی ایجنسی "ڈی ای اے" کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے مادرِ وطن اسرائیل اور "موساد" کے لیے بھی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

وکٹر کا جنم تل ابیب میں ہوا تھا ـــــ!

اس کے باپ کا تعلق یہودی تنظیم "ہگانہ" سے تھا۔ اسرائیل کے قیام کے چند سال بعد وہ تجارت کے پیشے سے منسلک ہوا اور امریکہ چلا آیا ـــــ اپنی تجارتی مجبوریوں کے سبب وہ پھر امریکہ ہی میں آباد ہو گیا۔

لیکن ـــــ

روایتی یہودیوں کی طرح اس کی رگ رگ میں بھی اسرائیل سمایا ہوا تھا اور اس نے اپنی اولاد کو بھی وطن پرستی اور صیہونیت کے لیے مر جانے کا یہ جذبہ وراثت میں منتقل کیا تھا۔

وکٹر ہر سال اسرائیل جاتا تھا۔

وہ امریکی شہری تھا۔ امریکی حکومت کا ملازم ـــــ لیکن اسرائیل کے لیے ہر لمحے وہ جان دینے کو بھی تیار رہتا تھا۔

ڈی ای اے میں بھرتی کے بمشکل چند ماہ بعد ہی اس سے "موساد" نے رابطہ کر لیا تھا۔

"موساد" دنیا بھر میں موجود ہر اُس یہودی کی ناک میں رہتی تھی جس کے ذریعے کسی بھی طرح اسرائیل کو فائدہ پہنچ سکتا ـــــ اُسے بتایا گیا تھا کہ یہودی ہونے کے ناطے اُس کی جان و مال پر پہلا حق صیہونی ریاست اسرائیل کا ہے جس کی وفاداری اس کے ایمان کا حصہ ہونا چاہیے اور وکٹر نے اس سچائی کو بلا چون و چراں تسلیم کر لیا تھا۔

اسرائیلی انٹیلی جنس نے بھارتی انٹیلی جنس "را" کے تعاون سے پاکستان کو عالمی سطح پر دہشت گرد قرار دلوانے کے لیے جو گھناؤنا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ اُس کا ایک اہم نقطہ یہ بھی تھا کہ پاکستان کو ڈرگ سمگلنگ کے مسئلے پر دنیا بھر میں بدنام کر دیا جائے۔

تین ماہ پہلے جب وہ تل ابیب گیا تو اُس کی ملاقات "موساد" نے ڈی ای اے کے ایک ایجنٹ سے کروائی تھی جو پاکستان میں خدمات انجام دے رہا تھا۔

"ڈیمل" بھی اس کی طرح ایک یہودی النسل امریکی تھا جس کی رگ رگ میں صیہونیت سمائی ہوئی تھی اور وہ بھی "موساد" کے ایک اشارے پر اپنی جان پر کھیل جانے کے لیے تیار رہتا تھا۔

ڈیمل نے اُسے ایک منصوبہ سمجھاتے ہوئے بتایا تھا کہ اس میں وکٹر کا کردار کیا ہے اور ڈیمل نے کیا کردار ادا کرنا ہے۔ وکٹر نے امریکہ میں معاملات کو سنبھالنا تھا اور ڈیمل نے پاکستان میں ـــــ

دونوں تل ابیب ہی میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ـــــ گو کہ اُن کا تعلق ایک ہی ایجنسی سے تھا۔ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے تھے۔

لیکن ـــــ

ڈیمل کیلی فورنیا کا رہائشی تھا جبکہ وکٹر نیویارک میں رہتا تھا۔ شاید یہی وجہ

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے شناسا نہیں تھے کیونکہ ڈی ای اے کے ہزاروں کارکن امریکہ اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے اور اُن کا آپس میں رابطہ ناگزیر حالات ہی میں کروایا جاتا تھا خصوصاً ڈی ای اے کے فارن سروسز ونگ کے کارکنوں کی شناخت تو ایک دوسرے سے بھی پوشیدہ رکھی جاتی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ مثبت نتائج حاصل کیے جا سکیں۔

دونوں نے رابطے کے لیے ایک خصوصی بندوبست کر لیا تھا۔

O

حاجی صاحب جب گلی محلے کی حد تک ہیروئن فروشی کے دھندے سے منسلک تھے تو کوئی اور بات تھی۔ جوں جوں کاروبار پھیلتا چلا گیا، اُن کی ضروریات بڑھتی گئیں۔ سٹیٹس آف لائف بدلتا چلا گیا۔ پہلے وہ کونسلر منتخب ہوئے اب اُن کا ٹارگٹ ایم پی اے کی سیٹ تھی جس کے لیے اُنہیں خاصا "سوشل" بننا پڑا۔

وہ بھی بلے شاہ کی طرح گھاگ شکاری تھا۔

نام نہاد مذہبی سیاست کی آڑ میں شکار کھیلنے کا فن انہوں نے سیکھ لیا تھا۔

پولیس میں تو اُن کا ریکارڈ تب بھی نہیں بنا تھا جب وہ تیسرے درجے کے سمگلر تھے۔ اب تو وہ شہر کی متمول اور معزز ہستی بن چکے تھے۔ اب تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ انہیں تھانے کچہری کے چکر لگانے پڑیں یا سرکار دربار میں اُن کا نام اس حوالے سے لیا جائے۔

حاجی صاحب نے پہلے وقتوں میں آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں جس کا فائدہ انہوں نے خوب اُٹھایا۔

سیاست میں باقاعدہ داخل ہونے کے لیے انہوں نے "فلاحی راستہ" اپنایا اور فلاح و بہبود کے نام پر بنی نام نہاد تنظیموں کو چندے کی چاٹ لگا کر اپنے گرد اگرد جمع کر لیا جلد ہی وہ وقت آ گیا جب حاجی صاحب اس شہر کے معروف ترین سوشل ورکر بن گئے۔

آج اگر کسی سکول کی تقریب میں شریک ہیں تو اگلے روز کسی کھیل کے میچ کا افتتاح کر رہے ہیں اور اگلے روز بیواؤں کے کسی فلاحی مرکز کے لیے دو تین سلائی مشینیں خیرات کرتے ہوئے اپنی تصاویر اتروا رہے ہیں۔!

شہر کے قریباً سب ہی بڑے اخبارات کی کمزوری یعنی وہاں کے استحصال زدہ اور مالکوں کے ستائے ہوئے چھوٹے چھوٹے رپورٹر، فوٹو گرافر اور "سٹی ڈیسک" کے انچارج اُن کے مستقل گاہک تھے۔

حاجی صاحب کے کارندے اُن کی کوئی تصویر یا خبر کرنسی نوٹوں کے پہیے لگائے بغیر کسی اخبار کے دفتر تک نہیں پہنچایا کرتے تھے ــــ تمام اخبارات کے فوٹو گرافر کو اس بات کا علم تھا کہ حاجی کی کسی تقریب سے وہ خالی ہاتھ واپس نہیں آئیں گے۔ حاجی صاحب کے سیکرٹری اس ضمن میں خاصے ذمہ دار واقع ہوئے تھے۔ وہ تقریب ختم ہونے سے پہلے ہی بڑی ہوشیاری کے ساتھ نوٹوں کے لفافے اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں کی جیبوں تک منتقل کر دیا کرتے تھے جن کی پھر ذمہ داری ہو جاتی تھی کہ وہ "حقِ نمک" ادا کریں۔

یہی وجہ تھی کہ اگلے روز کے تمام اخبارات میں کوئی اہم خبر تو "مس" ہو سکتی تھی

لیکن ــــ

حاجی صاحب کی خبر بمعہ تصویر موجود ہوتی تھی

پولیس، کچہری میں گو کہ حاجی صاحب کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا لیکن زبانِ خلق نقارہ خدا ہے۔ لوگوں کی زبان پکڑنا تو اُن کے بس میں نہیں تھا۔ البتہ ایک کام وہ کر سکتے تھے جس کا مشورہ اُن کے ایک پڑھے لکھے سیکرٹری نے جو مشکل ہی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جرائم پیشہ دکھائی دیتا تھا نہیں دیا۔

"بکنے دیجئے سب کو ـــــ میں آپ کو بتاتا ہوں اس کا حل سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور اللہ کے فضل سے اگلے الیکشن میں نہ صرف آپ کو سرکاری پارٹی کا ٹکٹ ملے گا بلکہ آپ کو اسمبلی میں جانے سے بھی دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

اُس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"اوئے ـــــ وہ کیسے اوئے ـــ؟"

حاجی صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں حیرانگی سے پوچھا۔

"انسدادِ منشیات سوسائٹی ـــــ"

سیکرٹری نے کہا اور حاجی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔

"واہ بھئی واہ ـــــ اوئے تُو نے تو دل خوش کر دیا میرا۔ یہ ہوئی نا بات۔ بالکل ٹھیک ہے۔ میں آج سے ہی شہر سے منشیات ختم کرنے کی مہم کا آغاز کرتا ہوں۔ تم فوراً کچھ نوجوانوں کو جمع کر کے کوئی تنظیم کھڑی کر دو اور مجھے اس کا تاحیات چیئرمین بنا دو ـــــ"

حاجی کا دماغ اور زبان قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔

"حاجی صاحب اس کا بندوبست بھی ہو چکا ہے۔ آپ اگلے ہفتے اسی دن تیار رہیئے گا۔ شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں انسدادِ منشیات سوسائٹی کی تقریب ہو گی جس کی صدارت آپ کریں گے اور جہاں آپ کے تاحیات چیئرمین ہونے کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔"

"اوئے تم تو سچ مچ بڑے کام کے بندے ہو یار ـــــ آج تک کہاں چھپے رہے بھئی واہ ـــــ ذرا گج وج کے سب کچھ ہونا چاہیئے۔

حاجی صاحب کی رال ابھی سے ٹپکنے لگی تھی۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے ـــــ"

سیکرٹری نے حاجی صاحب کو مطمئن کر دیا۔

اُس نے جو کہا تھا وہ کر کے دکھا بھی دیا۔

اگلے ہفتے تک اس نے پندرہ بیس ایسے نوجوان اکٹھے کر لیے جو گزشتہ چھ سات سال سے کسی نہ کسی طرح گریجوایشن کرنے کے بعد اب مستقبل کے سہانے خواب آنکھوں میں سجائے دربدر خاک بسر ہو رہے تھے ـــ!

سیکرٹری نے بڑی مخلوط قسم کی محفل سجائی تھی جس میں لڑکیاں اور لڑکے تقریباً برابر ہی تھے۔ شرکاء میں زیادہ تعداد حاجی صاحب کے گاہکوں اور اُن کے گھر والوں کی تھی اور اخبارات کی حاضری حسبِ روایت بڑی بھرپور تھی۔

بے کار نوجوانوں نے جن کے پیٹ اور جیبیں سیکرٹری نے چرغوں اور نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ حاجی صاحب کی عظمت کے وہ وہ پہلو تلاش کیے کہ خود حاجی جی کئی مرتبہ دل ہی دل میں شرما کر رہ گیا ـــــ انہوں نے شہر کے سب سے بڑے ہیروئن فروش کو نوجوان نسل کا سب سے بڑا مسیحا قرار دیا جس نے نوجوانوں میں پھیلتی ہوئی نشے کی لعنت کو ختم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔

سونے پر سہاگہ حاجی صاحب کا وہ اعلان ثابت ہوا جس میں انہوں نے نشے کی لت میں مبتلا نوجوانوں کو اس لعنت سے چھٹکارہ دلانے کے لیے اپنی تنظیم کی طرف سے ایک فری ڈسپنسری کھولنے کا اعلان کیا جہاں ایک ڈاکٹر روزانہ آٹھ گھنٹے بیٹھ کر ان نوجوانوں کا مفت علاج کیا کرے گا ـــ!

جیسے ہی حاجی صاحب کے منہ سے یہ گل فشانی ہوئی سیکرٹری صاحب کے اشارے پر سامعین نے تالیاں پیٹ پیٹ کر سارا ہال سر پہ اُٹھا لیا۔

"اب دیکھوں گا کون سالا مجھے سمگلر کہتا ہے ـــــ اور میرا دھندہ کیسے ٹھپ

Scanned by Iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلتا ــــــ"

انہوں نے تقریب سے فراغت پر اپنی پجیرو جیپ میں سیکرٹری کے ساتھ بیٹھتے ہوئے قہقہہ لگا کر کہا۔

سیکرٹری نے بڑی بے شرمی سے دانت نکال کر اُن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

تھوڑی دیر بعد حاجی صاحب فتح کے نشے میں جھومتے اپنی پجیرو میں گھر کی طرف جا رہے تھے۔ اپنے سیکرٹری کی اس شاندار کارکردگی کا اعتراف انہوں نے سیکرٹری کو نوٹوں کی ایک گڈی تھماتے ہوئے کر لیا تھا۔

فن اردو ڈاٹ کام

گرفتار ہوئے ہم....

ندیم اُن نوجوانوں میں سے ایک تھا جو اس تنظیم کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ درمیانے درجے کے ایک سرکاری ملازم کا بگڑا ہوا صاحبزادہ تھا جس کی ناک تلے کوئی چھوٹی نوکری جچتی ہی نہیں تھی ــــ اُس کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور مشن تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو وہ راتوں رات کروڑ پتی بن جائے۔ شاید لاشعوری طور پر اُس کی یہی ضرورت اُسے حاجی صاحب کے قریب لے آئی تھی ــــ کیونکہ اُن کا شمار اس ملک کے چند گنے چُنے امیر لوگوں میں ہوتا تھا۔

ندیم کو انگریزی فلمیں دیکھ کر اور پاپ میوزک سُن سُن کر اب کسی یورپی ملک میں جانے کی دُھن بھی سوار ہو گئی تھی ــــ اُس نے اپنے تئیں یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ اس مُلک میں تو اب اُس کے لیے کچھ رہا نہیں ــــ اگر کچھ ہے تو اُس کے شایانِ شان نہیں ہے بہتر یہی ہے کہ وہ کسی یورپی ملک میں چلا جائے۔

لیکن کیسے ــــ؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے وہ دن رات شہر میں موجود تمام یورپی ممالک کی لائبریریوں اور اُن مراکز کے چکر کاٹنے لگا تھا جن کا کوئی بھی تعلق کسی یورپی مُلک سے رہا ہو۔

اس نے دیکھا تھا کہ اس کے ایک دو جاننے والے ایسی ہی کسی نام نہاد تنظیم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی آڑ میں کسی بین الاقوامی تقریب کا بہانہ کر کے کسی نہ کسی یورپی ملک کا ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے جس کے بعد پھر وہیں سکونت اختیار کر لیتے تھے۔

ندیم کے زیادہ سوشل ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ شاید سوسائٹی کے بڑے طبقے تک رسائی حاصل کرنے کے بعد وہ اس قابل ہو جائے کہ کوئی ایسی بیساکھی اسے مل جائے۔ جس کی مدد سے وہ سات سمندر عبور کرنے میں کامیابی حاصل کر لے۔

گزشتہ چند دنوں سے وہ اس یورپی ملک کی لائبریری میں مستقل آ جا رہا تھا۔ اس کی ایک اہم وجہ ڈینیل نامی وہ نوجوان تھا جو یہاں بہ طور کونسل آفیسر کی خدمات انجام دے رہا تھا۔ دو تین دن تو دونوں کے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا رہا پھر ایک روز اُن کے درمیان "ہیلو ہیلو" بھی ہو گئی۔

اس روز جب اُس نے ندیم کو اپنے کمرے میں چائے پینے کی دعوت دی تو ندیم کے لیے گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

اُسے اپنے خواب کی تعبیر ڈینیل کے روپ میں دکھائی دینے لگی تھی۔

ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں وہ اس سے مختصر سی گپ شپ کرنے لگا محض ڈینیل کا قرب حاصل کرنے کے لیے اس نے انگریزی زبان سکھانے والے ایک ادارے کی شام کی ایک مہنگی کلاس میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔

پندرہ بیس روز تک ڈینیل اُسے بڑے نامحسوس انداز میں کریدتا رہا جس کے بعد شاید اُس نے ندیم پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر ہی لیا۔

ایک روز جب اس نے ندیم کے منہ سے یورپی ملک جانے کی خواہش کا تذکرہ سنا تو فوراً ہی کہہ دیا۔

"ایسا ممکن تو ہے مگر....."

اُس نے جان بوجھ کر بات اُدھوری چھوڑ دی تھی۔

"مگر کیا ___ مسٹر ڈینیل ___"

ندیم نے بیقراری سے پوچھا۔

"دیکھو مسٹر ندیم۔ یہ بزنس کی دُنیا ہے۔ یہاں ایک ہاتھ دو اور ایک ہاتھ لو کا اصول کارفرما ہے ___ اگر تم خود کو ذہنی طور پر انسانیت کی خدمت کے لیے تیار کر لو تو ایسا ممکن ہے۔"

بالآخر اس نے ذومعنی سی بات کہہ ہی دی۔

ندیم تو کسی یورپی ملک جانے کے لیے اپنا مذہب بدلنے کو تیار بیٹھا تھا۔ اس کے دو دوست ایک آغاخانی فرقے کا مذہب اختیار کرنے کے بعد ایک یورپی ملک میں پناہ حاصل کر کے جانے کب سے گلچھرے اڑا رہے تھے۔ یہ تو اس کے نزدیک سب سے آسان طریقہ تھا۔

"مسٹر ڈینیل آپ پلیز بتایئے میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ تو باؤلا ہوا جا رہا تھا۔

"اوکے مسٹر ندیم ___ میں اپنے ایک دوست سے بات کر دوں گا وہ اس پوزیشن میں ہے کہ تمہاری مدد کر سکے ___ ابھی میں کوئی وعدہ نہیں کر رہا لیکن تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ میرے اور تمہارے درمیان جو بھی بات ہو گی اس کی راز داری برقرار رہے گی۔___"

ڈینیل نے اس کی آتش شوق کو مزید بھڑکایا۔

اگلے روز کا وعدہ کر کے ڈینیل دو دن غائب رہا۔ تیسرے روز اُس کی شکل دکھائی دی تو ندیم کی جان میں جان آئی۔

دونوں ڈینیل کے کمرے میں واپس آ گئے۔ ندیم اس کے منہ سے کچھ سُننے کے لیے بیقرار تھا جب کہ ڈینیل نے خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔

Scanned by Iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا بنا اس بات کا۔"

بالآخر ندیم کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔

"اوہ ـــ اچھا اس بات کا" ـــ ڈینیل نے لاپرواہی سے کندھے اُچکائے۔

"مسٹر ندیم تمہارا کام تو سمجھو ہو گیا لیکن تمہیں ایک کام کرنا ہے ـــ تم جانتے ہو کہ ہم لوگ ہیروئن کے ہاتھوں بہت پریشان ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح اُن لوگوں کو بے نقاب کیا جائے جو اس گھناؤنے دھندے میں ملوث ہیں۔ میرے دوست کا کہنا ہے کہ اگر تم ان لوگوں کے لیے کام کرو اور ایسے افراد سے متعلق اطلاعات دو تو وہ تمہارے لیے ویزا حاصل کر سکتے ہیں۔"

"بس مسٹر ڈینیل ـــ یہ بھی کوئی کام ہے۔ ہم تو پہلے ہی اینٹی ڈرگ سوسائٹی چلا رہے ہیں۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ـــ"

ندیم نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"مسٹر ندیم چونکہ میرا فرض تھا کہ میں اُن لوگوں سے تمہارا مکمل تعارف کرواتا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ تم کس سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہو تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔ تم جانتے ہو اس کا سبب کیا ہے ـــ؟"

"کیا ہے ـــ؟"

ندیم نے ہونقوں کی طرح منہ کھولا۔

"کیونکہ تمہارا چیئرمین اسی دھندے میں ملوث ہے۔ وہ بہت عرصے سے ہیروئن یورپ میں سپلائی کر رہا ہے لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت ہاتھ نہیں آتا۔"

ڈینیل نے اگلا حملہ کیا۔

"ہوں ں ں ـــ" ندیم نے گردن ہلائی ـــ "مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ آخر اس کے متعلق ساری دنیا جھوٹ تو نہیں بولتی۔ ضرور یہ شخص اسی دھندے میں ملوث ہے۔

مسٹر ڈینیل یہ تو انسانیت کی خدمت بھی ہو گی ـــ میں اس کے لیے تیار ہوں بس آپ فوراً مجھے بتائیے کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

ندیم اس سنہری موقع کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

ڈینیل نے اس سوال کا جواب بھی اگلے روز پر ٹال دیا۔ وہ لوگ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو ایک دم ذبح کرنے کے قائل نہیں تھے۔

اگلے روز جب وہ ڈینیل سے ملا تو منصوبہ تیار تھا۔

○

"دیکھو مسٹر ندیم ـــ غور سے میری بات سننا۔ اگر تمہارا دل اس بات کو مانے تو ہامی بھرنا ورنہ تمہیں اجازت ہے کہ انکار کر دو ـــ اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور میں پھر بھی کسی نہ کسی طرح تمہیں کوئی ویزا لگوا دوں گا۔ لیکن اگر یہ بات تمہارے دماغ میں آ جائے اور تم اس کے لیے تیار ہو جاؤ تو نہ صرف تمہیں ویزا ملے گا بلکہ وہاں بھی تمہارے لیے ہر ممکن آسانیاں پیدا کی جائیں!"

ڈینیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ندیم نے اس دوران اپنے شہر کے تقریباً تمام قابلِ ذکر مزارات اور مقابر پر دعائیں مانگی تھیں کہ ڈینیل کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو جائے اور اب وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔

"مسٹر ڈینیل آپ مجھ پر ہر طرح اعتماد کر سکتے ہیں"

اس نے بظاہر گورے کو اپنی قوتِ اعتماد سے مرعوب کرنا چاہا۔

"غور سے سنو تمہیں کیا کرنا ہے ـــ"

یہ کہتے ہوئے ڈینیل نے اُسے سارا منصوبہ سمجھا دیا اور آخر میں پھر یہی بات دہرائی کہ اگر وہ چاہے تو اب بھی انکار کر سکتا ہے۔

Scanned by iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن ــــــ

وہاں انکار کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی۔

اگر یہ گورا ندیم کو امریکی ویزے کے عوض جہنم میں چھلانگ لگانے کی ترغیب بھی دیتا تو اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اُسے تو بہر صورت امریکہ جانا تھا۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑتی۔۔

"او۔ کے سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔ جیسے ہی تمہاری طرف سے سگنل ملے گا تمہارے ویزے کا بندوبست ہو جائے گا۔"

ڈینیل نے جواب دیا۔

آج اس نے ندیم کو بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے رخصت کیا تھا۔

○

حاجی صاحب کو گزشتہ دنوں جو آفر اُن کے امریکی دوست کی طرف سے آئی تھی اُس نے تو حاجی صاحب کے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تھے۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں سختی ہونے کے سبب ہیروئن کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

آج کل وہ شدت سے کسی "کوریئر" (ہانڈی) کی تلاش میں تھے جو اُن کا مال حفاظت سے لے جا سکے۔ کیونکہ دوسرے قریباً تمام طریقے فرسودہ ہو چکے تھے یا امریکی اور یورپی پولیس کے علم میں آ چکے تھے۔

حاجی صاحب کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اُن کے "امریکی دوست" کے پس پردہ ڈکر کا ہاتھ موجود ہے۔ جس نے مافیا کے "ناپل" گروپ میں موجود اپنے "سورس" کے ذریعے یہ سارا گھڑاگ پھیلایا تھا۔

سٹیج تیار تھی۔

ڈرامہ لکھا جا چکا تھا۔

تمام اداکار اپنی اپنی جگہ چوکس تھے۔

اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ڈرامہ شروع ہوا اور پھر "ڈی ای اے" کے یہودی ایجنٹ اس کا ڈراپ سین کر دیں۔

حاجی صاحب کو دن رات یہی فکر کھائے چلی جا رہی تھی کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔ انہوں نے قریباً ڈیڑھ سال پہلے غیر ممالک کی سپلائی بند کر دی تھی، کیونکہ قدرت نے انہیں خطرے کی بو خود ہی سے سونگھ لینے والی حس سے نوازا تھا۔ اور حاجی صاحب کو جب یہ خبر ملی کہ بالے شاہ کی بھیجی ہوئی دو بیگمات یکے بعد دیگرے ایمسٹرڈیم پر گرفتار ہو چکی ہیں تو انہوں نے پیش بندی کے طور پر ادھر دیکھنا ہی بند کر دیا۔

حاجی صاحب اس معاملے میں بڑے کائیاں واقع ہوئے تھے۔

اُن کی ہمیشہ یہی کوشش رہی تھی کہ اُن کا نام کسی غیر ملکی ایجنسی کی لسٹ پر نہ آئے کیونکہ وہاں اُن کی رشوت اور سفارش کے چانسز نہ ہونے کے برابر تھے۔ البتہ یہاں کی انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی۔

اس ملک کی بیشتر ایجنسیاں اُن کے گھڑے کی مچھلیاں تھیں۔ جنہیں وہ جب چاہے سمندر سے خشکی پر اور پھر خشکی سے سمندر میں واپس لے جاتے۔ وہ تو پہلے یہی سمجھتے رہے کہ شاید غیر ممالک میں بھی رشوت کا نسخہ چل جائے گا۔

لیکن ــــــ

اگر ایسی بات ہوتی تو بالے شاہ کے بندے کیوں پکڑے جاتے؟

وہ کوئی کم سیانا تو نہیں تھا۔ اُس نے پولیس کی نوکری بھی کی ہوئی تھی۔

سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔

لیکن ــــــ

حاجی صاحب کو "ریٹ" کی آفر ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے تو اُن کی راتوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ اِس روز بھی وہ اپنے ہونہار سیکرٹری کے سامنے یہی رونا رو رہے تھے۔

"شاید ہمارا کام بنتا نظر آ رہا ہے حاجی صاحب ــــ"

ــ سیکرٹری نے اچانک ہی کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تیرے منہ میں گھی شکر ــــ جلدی بتا جلدی۔ ــــ"

حاجی صاحب کی رال ٹپکنے لگی۔

"مجھے کل ہی ندیم نے بتایا تھا کہ امریکہ میں کوئی کانفرنس ہو رہی ہے۔ جس میں ڈرگ کے خلاف کام کرنے والی تنظیموں کے نمائندے دنیا بھر سے اکٹھے ہوں گے۔ اُس نے پوچھا تھا کہ اگر حاجی صاحب اس کے لیے ٹکٹ کا بندوبست کر دیں تو وہ اُن لوگوں سے خط و کتابت کر کے ویزا حاصل کر سکتا ہے۔ اِس طرح آپکی والنٹ میں ہماری تنظیم کو بین الاقوامی سطح پر شناسائی حاصل ہو جائے گی ــــ میں تو کہتا ہوں حاجی صاحب ایک پنتھ اور دو کاج۔ اللہ کا نام لے کر داؤ لگا دیں۔ نہ صرف یہ کہ بزنس ہو جائے گا بلکہ دنیا بھر میں آپ کی شناخت " اینٹی ڈرگ " کی حیثیت سے ہو گی اور آپ جانتے ہیں کہ جو سند کسی کو یورپ امریکہ کی طرف سے مل جائے اُس کو ہمارے ہاں لوگ اپنے ایمان کا حصہ بنا لیتے ہیں۔"

سیکرٹری نے حاجی صاحب کو خوش کر دیا۔

"اوئے سیکرٹری یار تُو تو بڑے کام کا بندہ ہے" ــــ انہوں نے وہی فقرہ دہرایا جو وہ سیکرٹری سے بے حد متاثر ہوتے تو دہرایا کرتے تھے ــــ "تو تو گُنوں کی گُتھی ہے ــــ دیکھنا کیا ہے ــــ کر لے قابو ــــ ایسے ہی قربانی کا بکرا بناتے ہیں۔ میرا ذکر درمیان میں لائے بغیر کام کرنا۔ تاکہ کھیل اگر بگڑ بھی جائے تو بھی میں محفوظ رہوں ــــ اور ہاں یہ بھی دیکھ لینا کہ لڑکے کے دانت بھی پورے ہیں یا نہیں۔ اُسے گارنٹی دے دینا کہ یہاں کی فکر نہ کرے کوئی اُس کے سامان کو ہاتھ نہیں لگائے گا اور ایک ٹکٹ کیا ہم اُسے دس ٹکٹوں کے پیسے دے دیں گے۔ اُسے اچھا خاصا لالچ دے دینا ــــ"

حاجی نے یہاں بھی اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری دکھائی تھی اور براہِ راست کھیل کا حصہ بننے کے بجائے اپنے سیکرٹری کو میدان میں اُتارا تھا۔ تاکہ کوئی بھی بندوق اگر چلائی ہو تو اُس کا کندھا استعمال کیا جائے۔ یوں بھی آخر یہ سیکرٹری کس مرض کی دوا تھا۔ حاجی صاحب اُسے اتنی تنخواہ دیتے تھے جتنی اس ملک کے ڈپٹی کمشنر کو نہیں ملتی تھی۔

"بس حاجی صاحب آپ مال اور پیکنگ کا بندوبست کریں۔ دوسرے تمام معاملات مجھ پر چھوڑ دیں۔ میرے جیسے جانثاروں کی موجودگی میں آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ــــ"

سیکرٹری نے چمچہ گیری کرتے ہوئے کہا۔

"اوئے ٹھیک ہے ــــ ٹھیک ہے۔ بس ذرا ہوشیاری سے کام کرنا ہے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

حاجی نے اپنے گنجے سر پہ ہاتھ پھیر کر ٹوپی دوبارہ سر پہ جماتے ہوئے کہا۔

"حاجی صاحب پہلے کبھی آپ کو شکایت کا موقع ملا ہے جو اب ملے گا۔"

سیکرٹری نے چاپلوسی سے دانت نکالے۔

○

ندیم کے تو سارے پتے سیدھے پڑ رہے تھے۔

اس نے دو روز پہلے ہی سیکرٹری سے بات کی تھی کہ امریکہ کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے انہیں ایک کانفرنس میں شمولیت کی دعوت ملی ہے اور اس بنیاد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر اُسے امریکہ کا ویزا آسانی سے مل سکتا ہے۔ اس وقت تو سیکرٹری نے بات سُنی اَن سُنی کر دی تھی۔

لیکن ——

آج جب اُس نے ندیم کو دوپہر کا کھانا ایک فائیو سٹار ہوٹل میں اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور اُسے یقین ہونے لگا کہ تیر نشانے پہ اگر ابھی تک نہیں لگا تو کم از کم نشانے کی طرف بڑھ رہا ہے اور جلد ہی وہ ٹارگیٹ کو ہٹ کرے گا۔

اپنے واحد سوٹ کے ساتھ وہ مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی ہوٹل میں پہنچ گیا۔ یہ آدھا گھنٹہ اُس نے ہوٹل کے لان میں ٹہلتے ہوئے گزارا تھا۔

آج زندگی میں شاید پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا تھا کہ وقت تھم گیا ہے یہ آدھا گھنٹہ جیسے آدھی صدی پہ محیط ہو گیا تھا۔

خدا خدا کر کے اُسے سیکرٹری کی کار ہوٹل کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔

ندیم لپک کر اس کے استقبال کو آگے بڑھا اُس نے بڑی گرمجوشی سے سیکرٹری سے معانقہ کیا تھا۔ دوسری طرف سے بھی کچھ کم گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا۔

"یار دفتر میں تو مل بیٹھنے کا وقت ہی نہیں ملتا —— ہر وقت ہجوم لگا رہتا ہے میں نے سوچا یہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کر لیں۔"

یہ کہتے ہوئے سیکرٹری بڑی محبت اور بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر اُسے ڈائننگ ہال میں لے آیا۔ دونوں نے "بوفے" سے اپنی مرضی کا کھانا انتخاب کیا اور ہال کے دوسرے کونے میں موجود ایک خالی میز کی طرف چل دیئے۔ یہ خاصا محفوظ کونا تھا اور یہ میز بھی اکثر حاجی صاحب کے سیکرٹری کے لیے مخصوص رہتی تھی۔

"یار میں نے سوچا تمہیں امریکہ کی سیر کروا ہی دی جائے۔"

بالآخر سیکرٹری نے اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد مطلب کی بات پہ آتے ہوئے کہا۔

"شکریہ جناب۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا" —— ندیم نے بے ساختہ کہا۔

"اس میں احسان مند رہنے یا نہ رہنے والی کوئی بات نہیں۔ دیکھو یار میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھا ہے۔ میں تمہاری طرح کبھی نوجوان تھا اور میں نے بھی مستقبل کے بڑے سنہرے سپنے سجائے تھے۔ قدرت انسان کو کبھی نہ کبھی ایک موقعہ ضرور دیتی ہے کہ وہ اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے لے۔ میں نے تمہاری بات پہ بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ ہم بھی اس موقع کو ضائع نہ کریں۔ اگر تم ذرا سی ہمت کرو تو نہ صرف زندگی بھر کی روٹیاں اکٹھی ہو جائیں گی بلکہ میں اور تم دونوں اپنی محرومیاں بھی پوری کر سکیں گے۔"

سیکرٹری نے نیپکن سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"جی میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن کون کافر یہ نہیں چاہے گا کہ اُسے اس گھٹیا زندگی سے نجات ملے۔"

ندیم نے بظاہر انجان بنتے ہوئے کہا۔

"دیکھو ندیم بھائی اس معاشرے میں جہاں ہم تم جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہاں کچھ جانوروں کو انسانی روپ میں ہم پہ اس لیے مسلط کیا گیا ہے کہ اُن کے پاس حرام کی دولت ہے جس سے وہ جو چاہیں کر دکھائیں جیسے چاہیں نظامِ حیات کو چلائیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حاجی صاحب سمیت یہ تمام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگ آج بڑی باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن ان کا ماضی دیکھو تو تمہیں ایک ہی بات نظر آئے گی کہ ان لوگوں نے اپنے موجودہ منصب تک پہنچنے کے لیے ہر غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہتھکنڈہ استعمال کیا ہے ـــــ میں کہتا ہوں کہ آخر ہم ہی کیوں ساری زندگی کڑھتے رہیں۔ ہم بھی کیوں نہ یہی ہتھکنڈے استعمال کریں اور اگر تم میرا ساتھ دو تو امریکہ کے اس چکر سے ہم دونوں کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔"

اُس نے بالآخر دھماکہ کر ہی دیا۔

"مجیب صاحب! آپ میرے بڑے بھائیوں کی طرح ہیں۔ میں آپ کے ایک اشارے پر اپنی گردن کٹوا سکتا ہوں۔ آپ حکم کریں۔ میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ جیسے کہیں گے ویسے کروں گا۔ آپ کچھ بتائیں تو سہی۔"

ندیم کی بے چینی واقعی بڑھنے لگی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اب سیکرٹری جلد از جلد وہ بات کہہ دے جسے سننے کے انتظار میں اُس کے کان پکنے لگے تھے اور دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی جاتی تھی۔

"آؤ باہر لان میں کھلی ہوا میں بیٹھتے ہیں۔ موسم آج بہت اچھا ہو رہا ہے۔"

اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"چلیئے ـــــ"

دونوں ہال کمرے سے باہر لان میں آ گئے۔

آسمان بادلوں سے پٹا پڑا تھا اور یورپ کی سمت سے چلنے والی ٹھنڈی ہوا نے فضا میں خنکی کے احساس کو قدرے بڑھا دیا تھا۔ سیکرٹری مجیب نے بیرے کو اُن کے لیے باہر ہی کافی لانے کا آرڈر دے دیا تھا، اور اب دونوں واقعی اتنی محفوظ جگہ پہ بیٹھ گئے تھے۔ جہاں سے بہت کوشش کرنے کے باوجود بھی کوئی ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔

"ندیم بھائی! پہلی بات تو اپنے ذہن میں یہ بٹھا لینا کہ یہ جو گفتگو میرے اور تمہارے درمیان ہو رہی ہے اس کا حاجی صاحب سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ کبھی آئندہ ہونا چاہیے۔ عین ممکن ہے اگر تم یہ بات اُن تک پہنچا دو تو مجھے نوکری ہی سے ہاتھ دھونے پڑیں لیکن مجھے اب اس کی بھی پرواہ نہیں ہے۔ دولت حاصل کرنا ہر شخص کا حق ہے۔ صرف بڑی مچھلیوں ہی کو اس تالاب میں زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ میرے پاس تمہارے اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کا ایک شاندار منصوبہ موجود ہے۔ اگر تمہیں امریکی ویزا مل جاتا ہے تو میں تمہارے سامان میں کچھ ہیروئن اس طرح پیک کر دا سکتا ہوں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ جہاں تک ہمارے ملک کے ایئرپورٹس کا تعلق ہے کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا ـــــ وہاں بھی اگر تم کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے ہو کسی نے تمہارے سامان کی تلاشی نہیں لینی، اگر سرسری تلاشی لے بھی لی جائے تو بھی وہاں سے کچھ برآمد نہیں ہو گا۔ وہاں ایئرپورٹ پر اُتر کر تم ایک نمبر پر فون کر دو گے اور مسٹر میک کو بتاؤ گے کہ تم اس وقت کہاں موجود ہو ـــــ وہ لوگ تمہیں خود لینے آئیں گے۔ اپنا سامان اُن کے حوالے کر دینا وہاں تمہیں اتنی زیادہ رقم مل جائے گی کہ تم کم از کم دو مہینے بھی امریکہ میں بادشاہوں کی طرح بسر کر سکو گے ـــــ باقی کا حصہ اپنے ملک واپس آنے پر وصول کر لینا۔"

مجیب نے کافی کا گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے اُسے ساری بات کہہ ڈالی۔

اپنی دانست میں اس نے بڑی چالاکی سے حاجی صاحب کو اس کھیل سے نکال دیا تھا لیکن ندیم بھی اتنا بیوقوف نہیں رہا تھا کہ بات کی تہہ تک نہ پہنچتا۔ اُسے بھی اس بات کا احساس تھا کہ سیکرٹری مجیب کے منہ میں حاجی صاحب کی زبان ہے۔ حاجی صاحب اتنے بیوقوف بھی نہیں تھے کہ براہ راست اس کے سامنے آ جاتے۔ بہرحال اُسے تو آم کھانے سے مطلب تھا۔ گٹھلیاں گنا وقت ضائع کرنے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مترادف ہوتا۔

امریکہ جانے کے جنون نے اُسے خاصا چالاک بھی بنا دیا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ اُسے آگے کیا کہانی سنانی ہے۔

"مجیب صاحب۔ مجھے آپ کی پیش کش قبول ہے لیکن ایک شرط کے ساتھ۔"

اپنی دانست میں وہ بھی کاروباری بننے لگا تھا۔

"کیا؟"

سیکرٹری مجیب نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں تو کنگلا آدمی ہوں۔ آپ جانتے ہیں میرے پاس ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں۔"

"مطمئن رہو ——— یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

سیکرٹری نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ——— "جس روز تمہارا ویزا لگے گا اُسی روز سے تمہارا بزنس شروع ہو جائے گا۔ گو کہ مجھے تمہاری بہادری اور عقلمندی پر کوئی شک نہیں ہے لیکن میں پھر بھی یہ بات کہوں گا کہ فی الوقت کسی سے بھی اس بات کا تذکرہ نہیں کرنا۔ کسی سے یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ تم ویزے کے حصول کے لیے کوشاں ہو۔ میرے دفتر کی فیکس اور ٹیلی فون ۲۴ گھنٹے تمہارے استعمال کے لیے حاضر ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہے اپنی خط و کتابت مکمل کر لو اور ہاں یہ فی الحال خرچ کے لیے رکھ لو۔"

اتنا کہتے ہوئے سیکرٹری نے اپنے پرس سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اُس کے کھلے ہاتھ پر رکھ دیے۔

ڈینیل سے ملاقات پر اس خوف کے پیش نظر کہ کوئی قیامت نہ کھڑی ہو جائے اس نے سیدھے سبھاؤ حاجی صاحب کا نام لے دیا اور اُسے یہی بتایا تھا کہ حاجی صاحب نے براہِ راست اُس سے بات کی ہے اور وہ اس کے ذریعے مال بھیجنا چاہتے ہیں۔

"ویل ڈن ———"

ڈینیل نے کہا اور اُسے ایک فیکس نمبر لکھوا دیا کہ وہ حاجی صاحب کے آفس سے اس نمبر پر خط و کتابت کرے۔

تین چار روز کی خط و کتابت کے بعد بالآخر ندیم کے نام پر امریکہ کی ایک تنظیم کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہو گیا جس میں اگلے مہینے کی ایک تاریخ دی گئی تھی۔ جب وہ لوگ واشنگٹن میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منشیات کے خاتمے کے عنوان سے منعقد کرنے جا رہے تھے ———!

"بس ——— اب کام بن گیا ———"

ندیم نے فیکس وصول کرتے ہی سیکرٹری مجیب سے کہا۔ جو حاجی صاحب کے حکم پر دن رات اُس کی خدمت میں جُتا ہوا تھا۔ اس دوران حاجی نے جان بوجھ کر اُس سے ملاقات کرنے سے احتراز برتا تھا۔ وہ ڈرامے میں اپنی دانست میں اس طرح حقیقت کا رنگ بھر رہے تھے۔ اور خود کو اس کھیل سے الگ تھلگ ظاہر کرنے کے لیے کوشاں تھے۔

یہ الگ بات کہ ندیم کو اب ضرورت سے زیادہ سمجھ آنے لگی تھی۔

"کل اللہ کا نام لے کر ویزا لگوا لو"

مجیب نے بھی اُس کی مسکراہٹ میں ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

"ضرور مجیب بھائی ——— اب تو ان کے پاس انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں بچی۔"

"گڈ لک ———"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ کہتے ہوئے مجیب نے اُس کے ہاتھ میں پاسپورٹ پکڑوا دیا جو اُس نے ایجنٹ فیس دے تیار کروایا تھا۔

دوسرے روز علی الصباح ندیم بھی اُس قطار میں کھڑا ہو گیا جو قونصلیٹ کے باہر لگی تھی۔ اور جہاں اُس جیسے سینکڑوں نوجوان روزانہ اپنی محرومیوں پر ماتم کناں، آنکھوں میں مستقبل کے سپنے سجائے کھڑے ہوتے اور گھنٹوں کے جان لیوا انتظار کے بعد "کورا سا جواب" لے کر واپس لوٹ جاتے۔ اُس کا دل معمول سے زیادہ رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

عجیب عجیب وسوسے اُس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

کبھی مایوسی کی ایک لہر اُٹھتی اور اُسے یوں لگتا جیسے اُس کا دل ڈوبتا چلا جا رہا ہو۔ اور کبھی اچانک امید اور جوش کے ملے جلے جذبات سے اس کی دھڑکنیں بے قابو ہو جاتیں۔

خدا خدا کر کے اُس کی باری آئی اور ایک کھڑکی پر اُس کا پاسپورٹ جمع کر لیا گیا۔

ندیم نے یہ بات بطورِ خاص نوٹ کی تھی کہ اس کھڑکی پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اُس سے کم سوالات کیے گئے تھے جو بہر حال اُس کے لیے ایک اچھا شگون تھا۔

اب انٹرویو کے لیے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ اس سے پہلے درجنوں نوجوانوں کو پکارا گیا اور سب کو "ناں" کہہ کر واپس لوٹا دیا گیا۔ شاید ایک آدھ خوش قسمت ایسا ہو گا جسے ویزا جاری ہوا ہو۔

اپنے دل میں اس نے سینکڑوں مرتبہ اب تک آیت الکرسی کا ورد کر لیا تھا۔

پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب اُس کا نام پکارا گیا۔

کھڑکی میں موجود ڈھلتی عمر کی ایک گوری میم نے اس کے چہرے پر چند ثانیے نظریں لگائے رکھیں پھر اُس سے دوبارہ اس کے نام اور دیگر کوائف کی تصدیق کی شاید وہ اپنے پاس پہلے سے موجود کسی "ایڈوائس" سے اس کے کوائف ملا کر دیکھ رہی تھی اور اطمینان ہونے کے بعد کہ واقعی یہ وہی شخص ہے جس سے متعلق ایڈوائس اُسے ملی ہے۔ اُس نے ندیم کو ویزا دینے کی خوشخبری سُنا دی۔

خوشی سے اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل اچانک سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آن گرے گا۔

خوشی سے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ اُس نے وہ چھوٹی سی سلپ سنبھالی جس کو دکھانے پر اُسے پاسپورٹ واپس ملنا تھا اور واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ رہا۔

جب قریباً ایک گھنٹہ بعد وہ ویزا والے پاسپورٹ سمیت سیکرٹری مجیب کے دفتر پہنچا تو اُس نے جوشِ جذبات میں ندیم کا منہ چوم لیا۔

"یہ لو۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ہزار ہزار کے دس نوٹ اُسے تھما دیے۔

"سفر کی تیاری کے لیے۔۔۔ اچھے کپڑے وغیرہ تیار کروا لو۔۔۔ پیسوں کی پرواہ نہ کرنا۔ روانگی کے وقت گھر والوں کو دینے کے لیے تمہیں اتنے ہی پیسے دیے جائیں گے۔"

سیکرٹری مجیب نے کہا اور ندیم کو اپنا وجود ہلکا ہو کر فضا میں تیرتا محسوس ہوا۔

○

ندیم کی امریکہ روانگی پر اُس کے اعزاز میں حاجی صاحب کے حکم سے ایک چھوٹی سی تقریب اُن لوگوں نے منعقد کی تھی جس میں انسدادِ منشیات کمیٹی کے تمام عہدیداران اور حاجی صاحب شامل ہوئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس تقریب میں حاجی صاحب نے سب کے سامنے ندیم کی بے حد تعریف کی کہ اُس نے معاشرے سے منشیات کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے اور اب امریکہ میں بھی اُن کی تنظیم کی شناخت اُن کے خدمات کے حوالے سے ہوگی۔ انہوں نے ندیم کو بطورِ خاص یہ نصیحت کی تھی کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے اُن کے ملک و قوم کی عزت پر حرف آئے۔ اور ہر جگہ پاکستان کی عزت بڑھانے کا سبب بنے۔

ندیم دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

حاجی بڑا مکار غنڈہ تھا۔ اُس نے اب تک اپنے تمام اقدامات سے بظاہر ندیم کے سامنے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جو حرکت ندیم کرنے جا رہا ہے اس سے حاجی صاحب کا کوئی تعلق نہیں۔

لیکن ___

اصلیت کیا ہے ؟

اس کا علم ندیم کو بخوبی ہو چکا تھا۔

روانگی پر ندیم کو جو بیگ سونپا گیا اُس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے پر بظاہر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کے مختلف حصوں میں تقریباً دو کلو گرام ہیروئن موجود ہے۔ جو اُس بیگ میں موجود مختلف اشیاء اور بیگ کے خفیہ حصوں میں چھپائی گئی تھی۔

ایئر پورٹ پر کسی نے اُس کی خصوصی چیکنگ نہیں کی تھی۔

بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے بعد لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے اُس نے لاؤنج میں لگے ایک ٹیلی فون بوتھ سے مقامی نمبر پر فون کیا اور وہاں مطلوبہ شخص کی آواز سنائی دینے پر اسے نیویارک کا نمبر، اُس آدمی کا نام جس نے اسے لینے آنا تھا، اپنی فلائٹ اور سیٹ کا نمبر لکھوا دیا ___ یہ ہدایت اُسے ڈینیل کی طرف سے

ملی تھی جس پر اُس نے آنکھیں بند کرکے عمل کیا۔

اب وہ سرور و انبساط میں ڈوبا امریکہ کی افسانوی دنیا کے خوابوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

جہاز پر سوار ہوتے ہوئے خوشی سے اُس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اور جوشِ مسرت سے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

کراچی سے نیویارک تک کا سفر اس نے خوابوں کے مسافر کی طرح گزارا۔ اس درمیان اُس نے اپنی تمام محرومیوں کو حقائق کا روپ دھارتے دیکھ لیا تھا۔

جہاز نیویارک کے جے ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اُترا۔ اس نے امیگریشن اور کسٹم کا مرحلہ بڑی آسانی سے طے کر لیا۔ کسی نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ ندیم واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ اُس سے متعلق خصوصی ہدایات یہاں پہلے ہی سے موجود ہیں۔

"نابل" کا مقامی نمائندہ مارشل اُس کا میزبان تھا۔ جس کے دو کارندے اس کی آمد سے پہلے ہی اُس کے منتظر تھے۔ انہوں نے ندیم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اب وہ ایک قیمتی کار کی انتہائی آرام دہ سیٹوں میں دھنسا اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔

ایئرپورٹ سے بروک لین تک کا سفر اُس نے ایسے مسافر کی حیثیت میں طے کیا تھا جس کا جہاز غلطی سے دوسرے سیارے پر لینڈ کر گیا ہو۔ کار کے شیشوں سے اُس نے وہ سب کچھ زندہ دیکھ لیا تھا جو تصویروں اور فلمی روپ میں دیکھ دیکھ کر اُس کا دماغ خراب ہوا کرتا تھا۔

بروک لین کے ایک خوبصورت اور انتہائی مہنگے اپارٹمنٹ میں وہ لوگ اپنے سامان سمیت پہنچ گئے۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے میزبانوں نے اس کے سامنے مختلف قسم کے جوس سجا دیے اور ندیم مطمئن ہو کر بیٹھ رہا۔ ابھی انہیں وہاں بیٹھے بمشکل چند منٹ گزرے تھے کہ اچانک بلائے ناگہانی ٹوٹ پڑی ــــــــ

اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور برق رفتاری سے سات آٹھ "ایف بی آئی" کے کارکن اندر گھس آئے۔ انہوں نے ندیم یا اس کے ساتھیوں کو اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ پلک جھپکنے میں ان کے ہاتھ بازوؤں کے پیچھے ہتھکڑیوں سے باندھ دیے گئے۔

ندیم کے لیے یہ مرحلہ بڑا پریشان کن تھا۔

وہ گھبرا رہا تھا۔

لیکن ــــــــ

ڈینیل نے اُسے بتایا تھا کہ یہ سب ایک ڈرامے کا حصہ ہے جس میں اسے عدالت تک اپنا رول ادا کرنا تھا۔

اس روز نیویارک کے مقامی اور بین الاقوامی ٹیلی ویژنوں نے ایک پاکستانی ڈرگ سمگلر کی گرفتاری کی خبریں بڑے زور شور سے نشر کی تھیں۔

یہودی میڈیا کے ساتھ ساتھ مقامی ہندو لابی نے اس میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ ندیم کو چند روز بعد ہی احساس ہو گیا کہ اُسے "ٹریپ" کیا گیا ہے۔

لیکن ــــــــ

اب کوئی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔

اس نے پولیس اور عدالت دونوں کے سامنے تفصیلاً اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا اور وہ ساری کہانی سنا دی تھی جو در اصل اُسے ڈینیل نے پڑھائی تھی۔ ڈینیل نے بھی کہا تھا کہ اس کے بعد اس کو رہا کر دیا جائے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔

وہ بڑے دھوکے کا شکار ہوا تھا۔

حاجی صاحب سے متعلق ایسے ایسے افسانے تراشے گئے کہ الامان الحفیظ ــــ!

پاکستانی ایئر لائن پر پابندی کے مطالبے ہونے لگے ــــ!!

پاکستان کو دنیا بھر میں ڈرگ پھیلانے والا ملک قرار دیا جانے لگا ــــ!

یہ سب کچھ دو یہودیوں کا کیا دھرا تھا۔ ایسا کھیل وہ چٹکی بجا کر کھیل سکتے تھے ــــ اس گھناؤنے کھیل کے لیے پاکستان سے زیادہ زرخیز زمین انہیں کہاں میسر آ سکتی تھی۔ جہاں ہر دوسرا نوجوان ــــ یورپ جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

ندیم کو دس سال قید کی سزا ہو گئی۔

اُس کے "اعترافِ جرم" کی وجہ سے اُس سے رعایت برتی گئی تھی۔ عدالت میں اُس نے بہت شور مچایا کہ اُس کے ساتھ کیا ڈرامہ رچایا گیا ہے۔

لیکن ــــــــ

"نام نہاد آزاد امریکن میڈیا" جس نے اس کے اعترافِ جرم کو کئی گنا بڑھا چڑھا کر عالمی رائے عامہ کو گمراہ کیا تھا۔ عدالت کی اس کہانی کی ایک سطر بھی شائع نہ کر سکا۔ اسے ندیم کا جھوٹ اور جان بچانے کی کوشش قرار دیا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلیم باجوہ نے اینٹی ڈرگ سیل کے ایس پی کی حیثیت سے چارج سنبھال لیا تھا۔ اس کے گزشتہ کارنامے کے پیشِ نظر جو اس نے بابے شاہ کا مال پکڑوا کر انجام دیا تھا۔ اس مرتبہ باجوہ کو خصوصی اختیارات اور تحفظات کے ساتھ یہاں لایا گیا تھا۔

باجوہ کو علم تھا کہ بابے شاہ کی حالت زخم خوردہ تلملائے ہوئے سانپ کی سی ہو چکی ہے اور وہ انتقام کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ اُسے یہ بھی اُمید تھی کہ اسی انتقام کے چکر میں وہ ضرور کوئی ایسی غلطی کرے گا جو سلیم باجوہ کو اس قابل بنا سکے کہ وہ اپنے ہاتھوں بابے شاہ کو ہتھکڑی لگا کر اپنی زندگی کی بڑی خواہش پوری کر لے۔

لیکن ———

اس کے اندازوں کے برعکس بابے شاہ بڑے ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ اس نے پولیس کی ملازمت کی تھی اور اس کے محکمے کی خوبیوں اور خامیوں کا اس سے زیادہ ادراک اور کسے ہو سکتا ہے۔

بابے شاہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ سلیم باجوہ اس قماش کا پولیس آفسر نہیں جس کے لیے یہ محکمہ بدنام ہے۔ ایسے نیک نام لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُسے بہت کچھ سوچنا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا قدم اُٹھائے جو اُسے دوبارہ اپنی ہی نظروں میں ذلیل کر دے۔

اس نے احتیاطاً اپنی سرگرمیاں خاصی محدود کر دی تھیں اور اُس کا زیادہ قیام ملک کے دوسرے شہروں میں ہوا کرتا تھا۔ بابے شاہ نے اپنا سیکورٹی کا جال بڑی خوبصورتی سے بُنا ہوا تھا۔

ملک کے چار پانچ بڑے شہروں میں اس کی ذاتی رہائش گاہیں تھیں۔ اس کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ آج تک کسی کو یہ علم نہیں ہو پایا تھا کہ وہ کس وقت کہاں قیام پذیر ہے ———؟

بابے شاہ دورانِ سفر اپنی شناخت خفیہ رکھتا تھا۔

اپنے ملک کے اندر ہی وہ غیر ملکی جاسوسوں کی طرح مختلف بھیس اور نام بدل کر سفر کیا کرتا تھا۔ اس کے پاس دنیا کی بہترین کاریں اور جیپیں موجود تھیں۔

لیکن ———

حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اکثر عام مسافروں کی طرح بسوں اور ٹرینوں سے سفر کرنے کا عادی تھا۔

اپنے جیسے قد کاٹھ والے اپنے قریبی ساتھی کو وہ اپنی شناخت سے پجارو اور لینڈ روور میں بٹھا کر گھر سے باہر نکال دیتا۔

اُس کے گھر کے گرد اگر موجود سیکورٹی کی گاڑیاں اُس کا تعاقب شروع کر دیتیں اور بابے شاہ میدان خالی پا کر چپ چاپ گھر کے پچھلے دروازے سے باہر آتا اور عام مسافروں کی طرح سفر کے لیے اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچ جاتا۔

لیکن ———

اُس نے اپنی "ڈی آئی جی" والی حیثیت کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ جانتا تھا کہ اس کھوکھلی سوسائٹی میں لوگ "بیٹیوں کے" موزوں رشتے" حاصل کرنے کے لیے وہ تمام خلافِ اخلاق حرکتیں کرتے ہیں۔ جن کی بنا پر اس معاشرے میں قدم قدم پر اس جیسے "وی آئی پی" کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔

یہاں کے بڑے بڑے شرفاء کی شادیاں اس وقت تک نامکمل سمجھی جاتی تھیں جب تک سیّد اقبال شاہ صاحب اُن میں شامل نہ ہوں۔

برسرِاقتدار اور اپوزیشن دونوں سیاسی جماعتوں کی خصوصی تقاریب میں وہ موجود ہوتا تھا کیونکہ دونوں ہی اس سے بڑی بڑی رقمیں چندے کی شکل میں حاصل کرتی تھیں۔

بیشتر مذہبی، سماجی، رفاہی اور سیاسی محافل کی رونق اس کے آنے سے دوبالا ہو جاتی تھی۔

آج بھی وہ سیٹھ جابلی والا کی بیٹی کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے بطورِ خاص اس فائیو سٹار ہوٹل میں آیا تھا۔

اس کی آمد کی اطلاع جیسے ہی تقریب میں موجود "شرفاء" کو پہنچی وہ سب اس طرح مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے جیسے اچانک بادشاہ سلامت کی سواری وہاں اتر آئی ہو۔

ان میں بڑے بڑے مصلحِ قوم، تاجر، لیڈر، بلیڈر، سرکاری اور غیر سرکاری، اعلیٰ افسران اور حکومتی اہلکار بھی موجود تھے۔

یہ سب لوگ جانتے تھے کہ بابے شاہ کی اصلیت کیا ہے؟

اگر وہ بابے شاہ کی فراہم کردہ بیساکھیوں کے سہارے امارت یا اقتدار کے مزے لوٹ رہے تھے تو بابے شاہ نے بھی وقت آنے پر انہیں استعمال کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا تھا اور اُن کی مدد سے ایسے ایسے غیر قانونی معرکے سر کیے تھے۔

کہ انہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا تھا۔

لیکن ——

اب تو بابے شاہ کے کسی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان کا ضمیر بھی انہیں ملامت نہیں کرتا تھا کیونکہ انہوں نے ضمیر نام کی چڑیا بہت پہلے سے آزاد کر دی تھی۔ اُن میں سے وہ خود کو خوش قسمت جانتے تھے۔ جنہیں بابے شاہ کسی خدمت کے قابل جانتے کیونکہ اس خدمت کا معاوضہ اتنا زیادہ اور اتنے گنا موصول ہوتا تھا کہ وہ بسا اوقات خود بھی حیران رہ جاتے تھے۔

"شاہ جی"

"پیر جی"

"مرشد"

"سیّد بادشاہ" اور اس طرح کے دوسرے القاب اس کے لیے توصیفی اور تعظیمی انداز میں بلند ہو رہے تھے اور بابے شاہ حاضرین میں سے کسی پر مسکراتی ہوئی نظر ہی اچھالتا، کسی سے ہاتھ ملاتا اور کسی سے بغل گیر ہوتا اس طرف جا رہا تھا جہاں دولہا دلہن کے نزدیک اس کے لیے بطورِ خاص جگہ بنائی گئی تھی۔ جب اچانک اس کی نظر میاں صاحب پر پڑی۔

ایم این اے میاں کا اس محفل میں آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

لیکن ——

اس کی بغل میں موجود خاتون نما لڑکی کو جب بابے شاہ نے دیکھا۔ دیکھتا ہی رہ گیا۔

عورت کبھی اس کی کمزوری نہیں بنی تھی۔

اس نے عورت کو کبھی پاؤں کی جوتی نہیں جانا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس بزنس سے وہ منسلک تھا اس میں اس شہر کی شو بزنس سے متعلق وہ خواتین جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ پاگل ہو جاتے تھے۔

وہ معزز خواتین بابے شاہ کی ایک رات کی قربت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھا کرتی تھیں۔

اس عورت کو دیکھ کر بابے شاہ کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ عورت اس کی کمزوری بھی بن سکتی ہے۔

یہ نیلم تھی ——!

عورتوں کے سابقہ دلال امیر کبابی کی منکوحہ بیوی اور ایم این اے میاں صاحب کی نئی دوست نما سیکرٹری ——!!

⭕

ایم این اے میاں صاحب کا "موری ممبری" سے اس منصب تک کا سفر اپنے دامن میں بڑی بڑی شرمناک کہانیاں سمیٹے ہوئے تھا۔ طالب کمہار کی معاونت سے اس نے ہر وہ حرام کاری کی تھی جس کا تصور بھی کسی شریف آدمی کو گناہگار کر سکتا تھا۔

اس نے دولت اور اقتدار کے حصول کے لیے ہر غیر اخلاقی اور غیر قانونی حربہ استعمال کیا تھا اور اب یہ بات اس کے ایقان کا حصہ بن چکی تھی کہ وہ مجرب طریقے اور ذرائع اختیار کر کے وہ بڑی آسانی سے اگلے پانچ سات سالوں میں مُلک کا وزیراعظم بھی بن سکتا ہے ——!

اس نے اپنے ذہن میں یہ ٹارگٹ بنا لیا تھا۔

اور ——

اب اس کا سفر اپنی منزل کی طرف تیزی سے جاری تھا۔

میاں صاحب نے چند روز پہلے ہی ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں اپنی مخالف سیاسی جماعت میں شمولیت کا اعلان کر کے بڑے بڑے مقتدر حلقوں کو چونکا دیا تھا۔

اس اچانک اعلان کا اہم سبب تھا میاں صاحب کے "اسٹیبلشمنٹ" سے خصوصی تعلقات!

اس کے خاص دوستوں نے میاں صاحب کو سگنل دے دیا تھا کہ اس مرتبہ اقتدار کا جھولا جھولانے کے لیے "اسٹیبلشمنٹ" نے اُن کی مخالف سیاسی جماعت کا انتخاب کر لیا ہے۔ کیونکہ وہ بے چارے گزشتہ سات آٹھ سال سے اس مقصد کے لیے ایڑیاں رگڑ رہے تھے یوں بھی موجودہ برسراقتدار جماعت کے کرتا دھرتا اگلے دس پندرہ سال کی روٹیاں جمع کر چکے تھے اور اب یہ موقعہ کسی اور کو ملنا چاہیے تھا۔

میاں صاحب نے اشارہ پاتے ہی مخالف لیڈر شپ سے رابطہ قائم کیا اور اگلی حکومت میں وزارت کے وعدے پر اُن کی حمایت اور اپنی جماعت کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ اُن کے اس اقدام پر خاصی لے دے ہوئی تھی۔

سابقہ سیاسی جماعت نے انہیں "لوٹا" قرار دیا تھا۔

لیکن ——

انہوں نے موجودہ سیاسی جماعت سے حاصل کردہ صحافتی ذرائع کے ذریعے یہ بات ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انہوں نے ساری زندگی اصولوں کی سیاست کی تھی۔ سابقہ سیاسی جماعت میں اُن کی شمولیت بھی اصولوں کی بنیاد پہ ہوئی تھی اور اُن سے علیحدگی کا فیصلہ بھی اسی بنیاد پہ کیا گیا ہے۔

یوں بھی انہیں ایسے الزامات کی کوئی پرواہ نہیں رہی تھی۔

جس نوعیت کی سیاست میاں صاحب کر رہے تھے۔ اُس میں ایسی معمولی باتوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا تھا۔ یہ تو معمولی سا الزام تھا۔ وہ تو ہوسِ اقتدار میں اتنے اندھے تھے کہ اگر سارے ملک کے عوام یک زبان ہو کر انہیں اگلے تین چار ماہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک گالیاں بھی دیتے رہتے تو بھی وزارت کے مقابلے میں یہ سودا اُن کے لیے زیادہ مہنگا نہیں تھا۔ وہ اپنے خصوصی حلقہ احباب میں اکثر کہا کرتے تھے کہ عزت تو آنی جانی شے ہے البتہ اقتدار قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔

الیکشن نزدیک ہونے کی وجہ سے میاں صاحب نے اپنی پبلک ریلیشنگ بڑھا دی تھی۔ وہ شہر کی بڑی بڑی تقاریب میں اکثر دیکھے جانے لگے تھے۔

آج بھی سیٹھ جاپانی والا کی بیٹی کی شادی میں اُن کی شرکت اُن کی الیکشن مہم کا حصہ تھی۔

ایم این اے میاں صاحب نے اس مہم کے آغاز ہی میں امیر کیانی کی بیگم نیلم کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ نیلم جیسی عورتوں کے بغیر کیانی کی کیا حیثیت ہے۔ ایسے سائن بورڈ اس قماش کی عورتیں اپنے گلے میں کبھی مستقل نہیں لٹکا پاتیں۔

اس کے پاس نیلم کو دینے کے لیے دولت کے انبار موجود تھے۔ پھر امیر کیانی کی یہ حیثیت کیونکر ہونے لگی کہ وہ ایسی خوبصورت عورت کا بلا شرکت غیرے مالک بن جائے۔ اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔

میاں صاحب جیسے بڑے لوگوں کے ٹکڑوں پر پلنے والا عورتوں کا دلال۔!

انہوں نے نیلم سے اس شادی پر اپنے ساتھ چلنے کی بطورِ خاص درخواست کی تھی۔

وہ نیلم کا تعارف اپنی پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کرواتا تھا۔ آخر اُسے کل وزیر بننا تھا اور پھر وزیراعظم ——!

اُس کے لیے ایسی خوبصورت سیکرٹری ابھی سے ضروری تھی۔

سیٹھ جاپانی والا اس ملک کے بڑے صنعتکاروں میں سے ایک تھا۔ اس کے تعلقات جہاں ایک طرف علمائے کرام سے تھے وہیں اچھے برے تمام سیاسی

لیڈروں اور شو بزنس کے لوگوں سے بھی تھے۔ اس نے مشکل وقت میں ان لوگوں کی اکثر مدد کر کے اُن سے بڑے بڑے فوائد حاصل کیے تھے۔ یوں بھی اس شہر میں ایم این اے میاں صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ اور خصوصاً جب سے انہوں نے پارٹی تبدیل کی تھی اہل نظر اندازہ کرنے لگے تھے کہ میاں صاحب مستقبل کے وزیر ہیں یہی وجہ تھی کہ ابھی سے لوگوں نے ان کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے تھے۔

میاں صاحب اپنی نئی چمچماتی لینڈ روور میں جب نیلم کے ساتھ برآمد ہوئے تو مقامی اخبارات کے کئی فوٹو گرافروں کے کیمرے حرکت میں آ گئے۔

یہ لوگ میاں صاحب کی کم اور اُن کی نئی نویلی سیکرٹری کی تصاویر زیادہ اتار رہے تھے۔

میاں صاحب کو اگر اس بات کا یقین ہوتا کہ بالے شاہ یہاں آئے گا تو وہ کبھی اتنے دھوم دھڑکے سے مسلح باڈی گارڈوں کی معیت میں تشریف نہ لاتے کیونکہ انہوں نے ابھی تک بالے شاہ کے حکم کی مکمل تعمیل نہیں کی تھی۔ اور اس کی طلب کردہ رقم کا بمشکل نصف ہی رو رو کر پہنچایا تھا۔

آج تک انہوں نے معمولی فیصلے بھی بالے شاہ کو اعتماد میں لیے بغیر نہیں کیے تھے۔ پارٹی بدلنے کی اُسے اطلاع ہی اخبارات کے ذریعے ملی تھی۔

دراصل میاں صاحب نے یہ سمجھ لیا تھا کہ بالے شاہ کو جتنا زبردست دھچکا لگا ہے اُس کے بعد سے کم از کم چند ماہ کے لیے تو وہ پردہ سکرین سے ضرور غائب ہو جائے گا۔ یہ تو اُن کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بالے شاہ ایک لمحے کے لیے اپنی شکست تسلیم نہیں کرے گا جس کا اندازہ اُسے اس سماجی تقریب میں ہو رہا تھا جہاں بالے شاہ کی آمد نے ہلچل مچا دی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا حال ہے میاں صاحب ــــ کیا بات ہے آج کل اکیلے پرواز کا شوق چرا رہا ہے آپ کو ــــ گزشتہ حادثے کے بعد بھی کوئی نصیحت نہیں ہوئی۔

کوئی اور پارٹی تو سرحد پار کی نہیں پھانس لی۔ خیر تمہاری مرضی میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ میرے دوست اپنے قدموں پر کھڑے ہوں۔ لیکن اس طرح نہیں۔"

بالے شاہ نے گو یہ باتیں مسکراتے ہوئے کہی تھیں۔

لیکن ــــ

ایم این اے میاں صاحب کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر رینگتی محسوس ہوئی تھی۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ بالے شاہ کو اس بات کا علم تھا کہ انہوں نے بالا بالا ہی سرحد پار سکھوں کو مال سپلائی کرنا چاہا تھا۔

یوں بھی اُسے اعلیٰ سیاسی حلقوں کی قربت دلانے والا اقبال شاہ تھا جس نے سرکاری پارٹی والوں کو احساس دلایا ہوا تھا کہ میاں اُس کا آدمی ہے اور اس کی سابقہ پارٹی کے لوگ بھی اس کے جائز ناجائز کام اس لیے بلا چوں چراں کر دیا کرتے تھے کہ وہ اُسے بالے شاہ کا بندہ سمجھتے تھے۔ اب میاں صاحب کو احساس ہوا تھا کہ ان کی حیثیت تو بالے شاہ کے چمچے جیسی ہے تو انہوں نے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے تھے۔

خصوصاً پارٹی تبدیل کرنے کے بعد سے انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ مستقبل کے وزیر ہیں اور سونے پر سہاگہ نیلم کا ساتھ۔ جس نے میاں صاحب کو احساس دلایا تھا کہ جس قسم کی عورت کی تلاش انہیں تھی وہ انہیں مل گئی ہے۔

گویا اپنی دانست میں انہوں نے مستقبل کی وزارت پکی کر لی تھی۔

لیکن ــــ

اچانک بالے شاہ کی ملاقات اور اس کی طرف سے ہنس کر کہے گئے فقروں نے میاں صاحب کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

کیا بالے شاہ کی ناراضی مول لے کر وہ اس ملک میں ایک آزاد انسان کی زندگی جی سکے گا؟ اس سوال کا جواب اُس سے زیادہ صحیح کون جانتا تھا کیونکہ اس نے بالے شاہ کے کئی روپ دیکھے تھے۔

"یہ کون ہے؟"

اچانک ہی بالے شاہ کی نظریں نیلم پر جم گئیں جو خود کو اس کے سامنے نمایاں کرنے کے لیے اپنے جسم کی چند سیکنڈ ہی میں بڑے راز دارانہ انداز میں نمائش کر چکی تھی۔

اس سوال پر تو میاں صاحب گڑبڑا گئے تھے لیکن نیلم کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ اگر بالے شاہ جیسے بین الاقوامی سمگلر کی رفاقت اسے میسر آ جاتی تو وہ سارے جہان کو فتح کر لیتی۔ اُس کے ہزاروں دیرینہ خواب حقیقت کے روپ میں ڈھل جاتے۔

"مسز نیلم شاہ جی ــــ میری سیکرٹری ہیں۔"

میاں صاحب نے تھوک نگلتے ہوئے اپنا خشک گلا تر کر کے جواب دیا۔

"اچھا اب تم نے سیکرٹری بھی رکھنی شروع کر دی ہے۔"

بالے شاہ کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔

"شاہ جی آپ کے تو ہم خادم ہیں لیکن آپ کو علم ہے ناں کہ آج کل کے زمانے میں ایسی سیکرٹری کے بغیر گزارہ بھی نہیں چلتا۔"

"کیا حال ہیں آپ کے؟"

بالے شاہ نے میاں کی چاپلوسی کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے براہ راست

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نیلم کی آنکھوں میں جھانکا جہاں دعوت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں شاہ جی ـــــ میری تو دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔ بہت شہرت سنی تھی آپ کی۔ میری بہت خواہش تھی کہ آپ سے ملاقات کروں۔"

نیلم کے جواب نے میاں صاحب کا اندر کاٹ کے رکھ دیا۔

"شہرت یا دہشت ـــــ"

یہ کہتے ہوئے بالے شاہ خود ہی ہنس دیا۔

"وہ تو جناب ہے ہی ـــــ کسی کی مجال ہے جو آپ کے سامنے دم بھی مار سکے ـــــ"

نیلم ایسا موقعہ کب ہاتھ سے جانے دیتی تھی۔

"کبھی آیئے ناں میرے ہاں ـــــ ہم بھی آپ سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ میاں صاحب کمال کے آدمی ہیں اور کمال کا انتخاب ہوتا ہے ان کا ـــــ"

اس نے نیلم کو میاں کی پرواہ کیے بغیر دعوت دے ڈالی۔

"زہے نصیب ـــــ شاہ جی! آپ جب فرمائیں لونڈی حاضر ہو جائے گی۔"

نیلم اپنی دانست میں آج ہی بالے شاہ پر چھری چلانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

"میاں صاحب انہیں کبھی لے کر آیئے ناں۔"

یہ کہتے ہوئے بالے شاہ آگے بڑھ گیا ـــــ کیونکہ بہت سے لوگ اس سے باتیں کرنے کے لیے کچھ فاصلے پر دست بدست کھڑے تھے۔

"کتے کا پلا ـــــ مجھے اپنا زرخرید غلام سمجھتا ہے ـــــ دیکھ لوں گا۔ اونہہ۔"

میاں صاحب نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا اور نیلم کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگے۔ جس کی جوتی کو بھی اب میاں صاحب کی پرواہ نہیں رہی تھی۔

محفل اپنے شباب پر تھی۔

شراب کے نشے میں مست شہر کے شرفاء دلہن اور دولہا پر نوٹوں کی گڈیاں نچھاور کر رہے تھے جو وہاں موجود گانے اور ناچنے والیاں جھولیاں بھر بھر کر اکٹھی کر رہی تھیں۔

بالے شاہ اس دوران مختلف لوگوں سے باتیں کرتا رہا پھر وہ اچانک واپس لوٹ گیا۔ یہ اس کی عادت تھی وہ ہمیشہ "بھری محفل" چھوڑ کر جاتا تھا۔ خالی سیلر اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میاں صاحب بھی کچھ دیر بعد نیلم کے ساتھ واپس آ گئے۔

"مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن آپ نے اس طرح بالے شاہ کی دعوت قبول کر کے اچھا نہیں کیا۔ وہ میرے متعلق کیا سوچے گا۔"

میاں صاحب نے گھر پہنچتے ہی امیر کبابی کی موجودگی میں کہا جو اب "بیوی" کو میاں صاحب سے وصول کرنے اپنی گاڑی لایا تھا۔

"میاں صاحب آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔"

نیلم نے اچانک ہی پلٹا کھایا۔

"میں آپ کی سیکرٹری ہوں۔ میرا فرض ہے آپ کے بُرے بھلے کا خیال رکھوں۔ آپ ایک بڑا الیکشن لڑنے جا رہے ہیں اور میں نے محسوس کیا ہے شاہ جی کو آپ کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ اگر میں نے اُن کے دل میں تھوڑی سی جگہ بنا ہی لی ہے تو اس کا فائدہ کسے ہو گا ـــــ؟ آپ کو میاں صاحب۔"

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے لائٹر کے ذریعے میاں صاحب کے منہ میں دبا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحب یہ بات مت بھولیے کہ کم از کم اس شہر میں کوئی بالے شاہ کو ناراض کر کے سکھ کی نیند نہیں سو سکتا۔ اگر آپ کی کسی حرکت کی وجہ سے اس کے

اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل میں میل آگیا ہے تو اُسے سوائے میرے اور کوئی صاف نہیں کر سکتا۔ میاں صاحب میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اور حق نمک ادا کرنا بھی میرا فرض بنتا ہے۔ بس آپ مطمئن ہو جائیے۔ ہم اگلے ایک دو روز میں شاہ جی کے ہاں چلتے ہیں سارا معاملہ ٹھیک کرا دوں گی ــــــ میاں صاحب ایک وقت میں دو سانپوں سے لڑائی آپ کو مار ڈالے گی ــــــ یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ طالب کمہار اور آپ کے تعلقات اب مثالی نہیں رہے۔ یہ بھی یاد رکھیئے کہ اس موذی کو بھی بالے شاہ ہی سنبھال سکتا ہے۔ اگر ہم دانشمندی سے کام لیں تو دونوں کو آپس میں ٹکرا کر اپنا اُلو سیدھا کر سکتے ہیں ــــــ میاں صاحب!

سانپ سے سانپ لڑے تو زہر کیسے چڑھے ــــــ؟"

نیلم کی گفتگو نے میاں صاحب کو ایک لمحے کے لیے تو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی بات پر یقین کرے یا نہ کرے۔

بہرحال مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق فی الوقت اُسے بادلِ نخواستہ ہی سہی نیلم کی ہاں میں ہاں ملانی تھی۔

○

ایس پی سلیم باجوہ کے سامنے حاجی صاحب کے کالے کرتوت کی فائل دھری تھی اور وہ اس ڈھلتی عمر کے خفیہ پولیس کے انسپکٹر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جو انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ سے بطورِ خاص اُن سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔

"کمال ہے ــــــ اتنا کچھ ہو گیا اور اس شخص کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔"

اُس نے حیرانگی سے کہا۔

"سر! یہ تو کچھ بھی نہیں ــــــ یہ فائل تو میری ذاتی محنت کا نتیجہ ہے۔

باقی جن لوگوں نے مختلف ایجنسیوں سے اُس پر کام کیا ہے انہوں نے بھی اس طرح کے بنجانے کتنی فائلیں بنا رکھی ہوں گی۔"

انسپکٹر رفیق نے مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

"یہ رپورٹس کیا فائل نہیں ہوئیں۔"

ایس پی صاحب نے پھر حیرانگی سے دریافت کیا۔

"ہوئی ہیں سر! لیکن ایک انسپکٹر اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے کہ افسرانِ اعلیٰ کے حکم پر کوئی آپریشن کرے۔ اور اس کی رپورٹ افسرانِ بالا تک پہنچا کر گھر بیٹھا رہے ــــــ کس کی مجال ہے جو اس مگرمچھ پر ہاتھ ڈالے ــــــ سرکار دربار میں ان لوگوں نے اپنے زر خرید ملازمین کی فوج بھرتی کروائی ہوئی ہے۔ ان ملازمین کا سوائے اس کے اور کیا کام ہے کہ اپنے مالکان کی ہر برائی کی پردہ پوشی کرتے رہیں اور کیس دبا کر واپس لوٹا دیں ــــــ سر! میں نے تو یہ غیر قانونی حرکت کی ہے کہ اپنی تمام رپورٹس کی فوٹو سٹیٹ محفوظ رکھتا ہوں۔ لیکن میرا ضمیر صاف ہے اور میرا ایمان تھا کہ کبھی نہ کبھی کوئی ایسا فرشتہ سیرت انسان ضرور آئے گا جو اس وحشی درندے کو جس نے مذہبی لبادہ اوڑھ رکھا ہے قانون کی گرفت میں لے گا ــــــ ایس پی صاحب ــــــ میں اس درندے کا ڈسا ہوا ہوں ــــــ میری زندگی کے واحد سہارے میرے اکلوتے بیٹے کو جو بی اے کا طالبِ علم تھا اس وحشی کے کارندوں نے ہیروئن کے نشے پر لگایا ہے ــــــ یہ بڑا خطرناک درندہ ہے۔ ایس پی صاحب۔ اس کے کارندے اس کے لیے مارکیٹ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس شہر کے ہر بڑے کالج پر کسی نہ کسی انداز میں یہ لوگ قابض ہیں۔ حاجی کے کارندے پہلے ان معصوم بچے اور بچیوں کو حیلے بہانوں سے اس گھٹیا نشے کا چسکا ڈالتے ہیں اور جب وہ اس کے عادی ہو جائیں تو اُن کے گاہک بن جاتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ جب ان بے چاروں کے پاس نشہ خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تو ہیروئن کے ایک سگریٹ کے لیے انہیں کس حد تک گرنا پڑتا ہے اور حاجی صاحب کے کارندے اُن کے ساتھ کیسا گھناؤنا سلوک کرتے ہیں ـــ کاش میں آپ کو بتا سکتا۔ ایس پی صاحب میری تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ تینوں بڑی ہیں اور بیاہنے لائق ہو چلی ہیں۔ ساری زندگی پولیس کی ایمانداری سے ملازمت کرنے کے بعد جب میرا بیٹا میرا بازو بننے جا رہا تھا تو ان موذیوں نے اُسے مفلوج کر کے ہمارے لیے لاینحل مسئلہ بنا دیا ہے۔ کاش میری چار بیٹیاں ہی ہوتیں ـــ“

اُس کی آواز بھرا گئی ـــ!

”رفیق صاحب صبر کریں۔ آپ ایسے لوگ بھی اگر ہمت ہار گئے تو عوام کا رہا سہا اعتماد بھی ہم پر سے اُٹھ جائے گا۔ آپ تو اس محکمے کی آبرو ہیں اور میں آپ کا ساتھی ہونے کے ناطے خدا کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ ان موذیوں کو ان کے بِلوں سے نکال کر کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ یہ فائل یہیں چھوڑ جائیے۔ آپ سے ملاقات ایک راز کی طرح میرے سینے میں مرتے دم تک دفن رہے گی۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ آپ کا تبادلہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں کروا لوں۔ مجھے آپ ایسے لوگوں ہی کی ضرورت ہے۔ میں آپ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ آپ کا بیٹا میرا بھائی ہے۔ میں دل و جان سے یہ کوشش کروں گا کہ وہ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر آپ کا بازو بن جائے۔ میرے جاننے والے ایک دردمند ڈاکٹر ایسے مریضوں کے علاج پر قدرت رکھتے ہیں۔ آپ آج اپنے گھر مطمئن ہو کر جائیے۔“

انسپکٹر رفیق عالم واقعی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ہی محکمے کے کسی افسر سے ملنے کے بعد اتنا مطمئن ہوا تھا۔ اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کی برسوں

کی محنت ضرور رنگ لائے گی اور یہ ایس پی حاجی کو ضرور اپنے شکنجے میں جکڑ لے گا۔ وہ ایس پی سلیم باجوہ کو سلیوٹ کر کے واپس لوٹ آیا۔

امریکن ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی اور انٹرپول کی رپورٹس اُس کے سامنے دھری تھیں جن کے مطابق حاجی اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ اپنا مال یورپ اور امریکن منڈیوں میں پہنچا چکا تھا اور انہیں کئی انکوائریوں میں مطلوب بھی تھا۔

اُس کی تازہ واردات کو گو کہ اُن لوگوں نے اپنے انداز سے رپورٹ کیا تھا لیکن دو تین روز ہی میں ایس پی سلیم باجوہ انکوائری کے بعد اس بات کا پتہ لگا لیا تھا کہ ندیم کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔

وہ ”ڈبل کراس“ ہوا تھا۔

کسی غیر ملکی ایجنسی کے کارندے نے اپنی ذاتی حیثیت میں اپنے سرکاری منصب سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کے خلاف سازش کی تھی۔ یہ سازش دراصل ان بین الاقوامی سازشوں کا حصہ تھی جس کا مقصد پاکستان کو امریکہ کی نظروں میں ”دہشت گرد“ ملک قرار دلوا کر اپنا الّو سیدھا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ندیم کی حیثیت تو بین الاقوامی سیاست کے اس شطرنج پر ایک معمولی مہرے جیسی بھی نہیں تھی۔ اُسے ان لوگوں نے بچوں کے کھلونے کی طرح استعمال کیا تھا اور جی بھر کے کھیلنے کے بعد اب ”ٹریش“ کر دیا تھا۔

اُس کے ذہن میں جس خدشے نے اچانک سر اُٹھایا تھا اُس نے خود ایس پی سلیم باجوہ کو چونکا دیا تھا۔

”کہیں یہ حاجی بھی اس سازش میں شامل تو نہیں!“

اُسے اب بہر صورت اس سوال کا جواب تلاش کرنا تھا اور یہی عزم لے کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ندیم کے گھر کا رُخ کرنے کے بجائے اُس کے والد کے دفتر جانے کا ارادہ باندھا تھا اور وہاں وہ عام شہریوں کے روپ ہی میں گیا تھا۔

ندیم کا والد ریلوے ہیڈ کلرک اور ڈھلتی عمر کا شریف اور وضعدار انسان لگتا تھا۔ بیٹے کی غیر ملک میں گرفتاری نے گردش حالات کے مارے ریٹائر کلرک کو بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے جانے کیسے کیسے پیٹ کاٹ کر دن رات محنت کر کے اپنے بیٹے کو پڑھایا لکھایا تھا ـــــ لیکن تقدیر نے اس کے ساتھ ایسی چال چلی تھی کہ بے چارہ مریض بن کر رہ گیا تھا۔

بیٹے کی گرفتاری کے بعد سے مقامی ایجنسیوں نے اُس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ اس ملک میں اتنی یونیورسٹیاں نہیں جتنی انٹیلی جنس ایجنسیاں ہیں اور آپس میں معاصرانہ چشمک کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے کوآرڈی نیشن بھی بادلِ نخواستہ ہی کرتی تھیں۔

ملک معراج دین اُن کے سوالات کے جوابات لکھواتے لکھواتے تنگ آچکا تھا۔ ایک ایجنسی کے لوگ اس کو ذہنی اذیت دے کر واپس جاتے تو چند روز بعد ہی دوسری ایجنسی والے آجاتے۔ یہ سب لوگ ایک ہی قسم کے سوالات کرتے تھے جن کا ایک ہی طرح کا جواب اُس نے سب کو لکھوایا تھا۔ جب وہ نئے آنے والوں سے کہتا کہ اُن سے پہلے بھی "سرکاری لوگ" اس کی تفتیش کر چکے ہیں تو جواب ملتا!

"ہمارا معاملہ مختلف ہے۔ ہمارا تعلق سنٹر سے ہے۔ فلاں کا نہیں تھا۔"

ایک مرتبہ پھر وہ اپنے اُلٹے سیدھے سوالات کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتے اور یوں گھما پھرا کر بوڑھے ہیڈ کلرک سے سوالات کرتے جیسے اس کی تفتیش کر رہے ہوں اور جیسے اپنے بیٹے کے گناہ کا ذمہ دار وہ خود ہے۔

ملک معراج دین نے اُسے قسمت کا لکھا جان کر قبول کر لیا تھا اور بجائے احتجاج کرنے کے چُپ چاپ گردن جھکا کر یہ ذہنی اذیت برداشت کر رہا تھا۔

ایس پی سلیم باجوہ کو اس تلخ حقیقت کا شدت سے احساس تھا کہ اب تک اس کے بھائی بندوں نے بے چارے ملک معراج دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہو گا اور بظاہر اُس کی ملاقات بھی بوڑھے سرکاری ملازم کے لیے باعث تکلیف ہی ہو گی۔

لیکن ـــــ

اُسے ملے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

⊙

ایس پی سلیم باجوہ کو اُمید تھی کہ وہ ضرور اس گفتگو سے کوئی ایسا کلو نکال لے گا جس کے ذریعے وہ حاجی پر ہاتھ ڈال سکے۔

حاجی جیسے گھاگ اور موذی مجرم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے اُسے بہت ٹھوس ثبوت تلاش کرنے تھے تاکہ اُسے قانونی گرفت سے نکلنے کا موقع نہ مل سکے۔ اُسے ماضی میں ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا جب اُس نے اپنی جان پر کھیل کر بلے شاہ اور سردار زئی کا مال پکڑوایا تھا۔

لیکن ـــــ

وہ دونوں آزاد گھوم رہے تھے اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ انہوں نے شاید اب تک اپنا نقصان بھی پورا کر لیا ہو۔

ملک معراج دین کلرک حسبِ معمول اپنے کمرے سے سب سے آخر میں باہر نکلا۔

اِستدادِ زمانہ کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔ ایک نظر اُس بزرگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی شکل پر پڑتے ہی باجوہ کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس بے چارے پر کیا بیت رہی ہے بیٹے کے ناکردہ گناہ کی سزا اُس کا سارا خاندان بھگت رہا تھا اور بیٹا پردیس کی جیل میں قید تھا۔ خدا جانے اب اُس سے اس زندگی میں ملاقات ہو بھی پاتی یا نہیں۔ بظاہر ملک معراج دین کے حالات تے اور جس طرح مختلف انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہلکاروں نے دن رات اُس کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں اس کے بعد تو دکھائی دیتا تھا کہ پہلے سے شوگر کا یہ مریض کسی دن اچانک ہارٹ فیل سے مر جائے گا۔

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کون سا منہ لے کر ملک معراج دین کے پاس جائے بوڑھا کلرک سر جھکائے اُس راستے کی طرف گامزن تھا جہاں سے اُسے معمول کے مطابق ایک ویگن پر بیٹھ کر اپنے گھر واپس جانا تھا۔

بالآخر اپنے ذہن میں ایک منصوبہ طے کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے نزدیک پہنچ ہی گیا۔

"ملک صاحب السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔"

بوڑھے نے گھبرا کر اُس کی طرف دیکھا اور اس کے سلام کا جواب دیا۔

"گھبرائیے نہیں میں آپ کے بیٹوں کی طرح ہوں۔ مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں، اگر آپ مجھے چند منٹ دے سکیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

معراج دین کو اس بات کا احساس تو ہو گیا تھا کہ اُسے سلام کرنے والا کون ہے۔ کیونکہ جب سے ندیم گرفتار ہوا تھا اُس کے بعد سے آئے روز لیے سلام کرنے والوں سے اُس کا پالا پڑتا ہی رہتا تھا۔

لیکن ـــ

اس نوجوان میں اُسے دوسروں سے کچھ مختلف چیز نظر آتی تھی۔

"کیا بات ہے؟"

اُس نے ہتھیار پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کے گھر جانے میں دیر ہونے سے اگر گھر والے خدانخواستہ پریشان ہوتے ہیں تو آپ مجھے کل کا کوئی وقت دے دیں۔ کہیں آپ کو دیر نہ ہو جائے۔"

اس نوعیت کے فقرے کسی انٹیلی جنس آفیسر کی زبان سے ملک معراج دین پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔

"نہیں بیٹا ـــ میرے گھر دیر سے جانے پر اب کوئی نہیں گھبراتا۔ انہیں علم ہے کہ میں اپنی ناخلف اولاد کے گناہوں کی جوابدہی اس دنیا ہی میں کر رہا ہوں۔"

ملک صاحب کی آواز قدرے بھرا گئی تھی۔

"اگر میں نے آپ کو پریشان کیا ہے تو معافی چاہتا ہوں۔"

باجوہ نے انتہائی تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا۔ قسمت میں دُکھ لکھا ہے وہ تو جھیلنا ہی پڑے گا۔ میں تو کہتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے اس جہان میں سزا دے لیں۔ لیکن میری بچیاں۔۔۔۔

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"میرے ساتھ تشریف لائیے ـــ"

باجوہ نے انہیں اپنی کار کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

ملک معراج دین جانتا تھا کہ اسے کوئی اغوا نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس کے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ نہیں پڑا تھا۔ وہ بے چارہ تو خود نان جویں کو محتاج تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ملک صاحب میں جانتا ہوں کہ گزشتہ چند دنوں سے آپ کس قدر ذہنی عذاب سے گزر رہے ہیں چونکہ میرا تعلق بھی پولیس کے محکمے سے ہے۔ اس لیے میں بہتر اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اُن لوگوں نے آپ سے کیا سلوک کیا ہوگا ـــــ لیکن میں آپ کو صرف اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ کے پاس میں پولیس آفیسر بن کر نہیں صرف ایک ہمدرد پاکستانی کی حیثیت سے آیا ہوں۔ آپ کے بیٹے کے ساتھ جو زیادتی ہوئی یا آپ کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے ممکن ہے اس کا ازالہ تو نہ ہو سکے۔ کیونکہ یہ تیر تو کمان سے بھی کا نکل چکا ہے ـــــ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ کی وجہ سے اور بہت سے ندیم ان موذیوں کے شکنجے میں آنے سے بچ جائیں گے یا جو ان کے شکنجے میں پھنس چکے ہیں ہم انہیں نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ خدمت ہے اپنے وطن کی اپنی قوم کی ـــــ اگر آپ اس سلسلے میں کچھ تعاون کریں تو اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور اس کا اجر دیں گے۔ عین ممکن ہے کہ قدرت نے آپ کے بیٹے کے ذریعے اور بہت سے بے گناہوں کو امریکہ اور یورپ کی جیلوں میں جانے سے بچانا ہو۔"

سلیم باجوہ جس طرح کی باتیں ملک معراج دین سے کر رہا تھا۔ اس کے بعد سے تو وہ پولیس سے متعلق اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر گئے ہیں اب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ بُرے لوگوں کی طرح اچھے لوگ بھی ہر محکمے میں ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔

باجوہ اُسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ایک اچھے سے ریستوران میں لے آیا تھا ـــــ!

ملک معراج دین کے "ناں ناں" کرنے کے باوجود بھی اس نے کھانا منگوا

لیا تھا اور اب دونوں کھانا کھا رہے تھے۔

اس دوران باجوہ نامحسوس انداز میں ان سے کئی سوالات کے جوابات بھی حاصل کر چکا تھا۔

"اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ کے بیٹے کو ایک سازش کے تحت اس جال میں پھنسایا گیا ہے۔ لیکن ایسا کوئی بھی جال اس پر پھینکنے کے لیے ان لوگوں نے اُس کے نزدیکی ساتھیوں اور دوستوں میں سے کسی نہ کسی کا تعاون بھی ضرور حاصل کیا ہوگا۔ تو آپ کے ذہن میں ایسا کون سا نام آئے گا۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہیں ناں کہ جس طرح پولیس کو اپنی تفتیش کی ابتداء کرنے کے لیے کوئی مفروضہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ کسی نہ کسی پر واردات کا شک کرنا پڑتا ہے تاکہ تفتیش کے لیے کوئی نقطۂ آغاز تو ملے؟ اب آپ ذہن پر زور دے کر سوچئے کہ ایسا کون سا نام ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے آپ کو اُس کے دوستوں کی مکمل فہرست کا علم نہ ہو۔ عین ممکن ہے اُس نے کبھی گھر میں اپنی والدہ یا بہنوں سے اس مسئلے پر کوئی بات کی ہو ـــــ انہیں کریدیئے عین ممکن ہے کوئی نام انہیں یاد رہ گیا ہو۔"

کھانا ختم ہونے پر قہوے کا آرڈر دے کر اس نے ملک معراج دین سے اہم سوال کر ہی دیا۔

اس دوران وہ ملک معراج دین کو یہ احساس دلانے میں صد فی صد کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ ایک پولیس آفیسر ضرور ہے لیکن یہاں وہ محض تفتیش کی نیت سے نہیں آیا بلکہ اُس کے ہمدرد کی حیثیت سے آیا ہے۔

"دیکھو بیٹا دلوں کا حال تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہوگا لیکن میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ فوراً کسی کا نام لے کر خواہ مخواہ کسی بے گناہ کو اس چکمہ میں پھنساؤں ہاں ایک بات ضرور کہوں گا کہ آخری دنوں میں اُس کے ساتھ دو

اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تین مرتبہ میں نے جس شخص کو دیکھا اُس کا ضرور اس معاملے میں کوئی ہاتھ رہا ہوگا۔"

باجوہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"کون ہے وہ شخص؟"

اُس نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

"دراصل وہ آخری دنوں میں ندیم کو اپنی کار پر چھوڑنے آیا کرتا تھا۔ سفید رنگ کی کار ہے اس کے پاس۔ میں نے اُسے دو تین مرتبہ دُور سے دیکھا ہے۔ شاید میں نہ دیکھ پاتا لیکن اتفاق سے اُس کا اور میرا آمنا سامنا اس لیے ہو گیا کہ میں مسجد کی طرف جا رہا تھا اور وہ ندیم کو اپنی سفید کار میں لے کر آ رہا تھا۔ ندیم نے میرے استفسار پر اُس کا نام مجیب بتایا تھا اور کہا تھا کہ آج کل جس تنظیم میں اُس کا آنا جانا لگا رہتا ہے ـــــ مجیب اس تنظیم کے جنرل سیکرٹری ہے ـــــ کوئی حاجی صاحب ہیں بہ ذات شریف، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔ مجیب سے میری صرف ایک مرتبہ دُعا سلام ہوئی تھی وہ بھی اس طرح کہ ہم دونوں اچانک ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے۔ مجھے پہلی ہی نظر میں یہ شخص بڑا چالاک ہوشیار دکھائی دیا۔ وہ مجھے جس طرح انکل انکل کہہ رہا تھا اُس کا انداز بڑا ہی مکارانہ تھا۔ ندیم کے پاس ایسی کوئی خوبی نہیں تھی کہ اُسے کوئی اپنی کار میں گھر تک چھوڑنے کے لیے آتے ـــــ میں نے بہت عرصہ پہلے ہی اُسے سختی سے اپنے دوستوں کو گھر بلانے کی ممانعت کر دی تھی کیونکہ جوان بیٹیوں کے گھر میں ہوتے ہوئے ان کے بھائی کے دوستوں کی آمدورفت نہ مجھے پسند تھی نہ میری بیوی کو ـــــ ندیم نے گھر میں یہی بتایا تھا کہ سیکرٹری مجیب ہی کی وجہ سے اُسے امریکہ جانا نصیب ہوا ہے ـــــ وہ گھر میں اکثر اُس کی تعریف ہی کیا کرتا تھا۔ باقی دلوں کے حال تو خدا جانتا ہے لیکن مجھے اس پر شک ہے

کہ ضرور اس شخص کا اس سارے کھیل میں کوئی ہاتھ رہا ہوگا۔"

ملک معراج دین نے اپنی بات کے خاتمے پر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

اس کی بات، باجوہ کے دل کو لگی تھی۔

اس بات کا تو اُسے بھی علم نہیں تھا کہ یہ شخص کون ہے؟ اور واقعی اس جرم میں اس کا حصہ بھی رہا ہے یا نہیں۔ لیکن اُسے اطمینان ضرور تھا کہ کوئی نقطہ آغاز تو ملا۔

ملک معراج دین کو وہ اپنی گاڑی میں اُن کے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔ گاڑی سے اُترنے سے پہلے اُس نے کاغذ کی ایک سلپ پر اپنا نام اور دفتر کا ٹیلیفون نمبر لکھ کر انہیں دیتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب آج کے بعد کسی ایجنسی کا کوئی شخص بھی آپ کو تنگ کرنے نہیں آئے گا۔ اگر کوئی آئے تو آپ اس کے کسی سوال کا جواب نہ دیں اور میرا نام بتا کر کہیں کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔ میں نے آپ کو اپنا ٹیلی فون نمبر دے دیا ہے۔ کبھی کوئی بھی ضرورت پیش آئے تو مجھے یاد کیجیے۔ اس دوران اگر اپنے طور پر آپ کے علم میں کوئی بات آئے تو وہ بھی مجھے ضرور بتایے پلیز۔ میں آپ کا وقت ضائع کرنے پر پھر معافی چاہتا ہوں۔"

اُس نے گاڑی سے اُتر کر بڑے ادب سے اُن کا دروازہ کھولا اور انہیں رخصت کیا تھا۔ بوڑھے معراج دین کو یوں لگا جیسے سلیم باجوہ سے ملنے کے بعد اس کے دل پر پڑی چٹان ایک طرف سرک گئی ہو۔

اس نے اپنی زندگی میں ایسا باتمیز، با اصول اور درد دل رکھنے والا سرکاری افسر نہیں دیکھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکنجہ

"کل شام تک سب مجھے اس شخص کے متعلق مکمل رپورٹس چاہئیں۔ ۲۴ گھنٹوں میں جو کچھ جمع کر سکتے ہو کر لو ـــــ لیکن خبردار کوئی اس کے نزدیک بھی نہیں پھٹکے گا۔ نہ ہی اُسے محاصرے میں آنے کا احساس ہونا چاہیئے۔"

اس نے دفتر پہنچتے ہی اپنے تین انسپکٹروں کو بلا کر فرداً فرداً ہدایات دی تھیں۔ پہلے وہ اپنے طور پر اس ذات شریف سے متعلق حقائق جاننا چاہتا تھا تاکہ اس پر مضبوط ہاتھ ڈال سکے۔

اگلے روز شام سے پہلے اُس کی میز پر تینوں انسپکٹروں کی رپورٹیں موجود تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ سیکرٹری مجیب کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ حاجی کے مقامی ایجنٹوں کو مال پہنچانا اور ان سے رقوم وصول کرنا اسی کی ذمہ داری ہے۔ اس کے ذریعے متعلقہ تھانے کو اُس کا حصہ پہنچایا جاتا ہے اور حاجی کی نام نہاد تنظیم کا کرتا دھرتا بھی یہی ہے۔ اس شخص کا ماضی بھی خاصا مجرمانہ رہا تھا۔ اپنے آبائی شہر میں وہ پولیس کی نظروں میں ہمیشہ مشکوک رہا۔

لیکن ـــــ

اس شہر میں آنے کے بعد یکایک اس کا شمار حاجی کے مصاحبوں میں ہونے لگا اور اب وہ اُس کا سب سے قریبی کارندہ ہے۔

"تنظیم میں شامل کچھ لڑکے لڑکیوں سے رابطہ کرنے کے بعد ان لوگوں کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ندیم اور مجیب کے درمیان آخری دنوں میں بڑی گاڑھی چھننے لگی تھی۔

سلیم باجوہ نے ایک ایک رپورٹ کا بڑی گہری نظروں سے جائزہ لیا تھا۔

"آج شام کو جب وہ گھر واپس لوٹ رہا ہو تو اُٹھا کر "سیف ہاؤس" پہنچا دو ـــــ خبردار بہت رازداری کی ضرورت ہے۔ انسپکٹر خان تم اس آپریشن کے انچارج ہو۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے۔"

اُس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔

"اوکے سر"

انسپکٹر خان نے اُسے سیلوٹ مارا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُس کے اتی ساتھی بھی اُس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آگئے تھے۔

باجوہ نے اس درمیان حاصل کردہ معلومات ذہن نشین کر لی تھیں۔ اپنی معلومات کی بنیاد پر اس نے مجیب سے حقائق اگلوانے تھے۔

انسپکٹر خان نے اپنے ماتحتوں کو منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا اس کے ایک ماتحت نے اپنی موٹر سائیکل سمیت حاجی صاحب کی اس کمپنی کے آفس کے باہر پوزیشن سنبھال لی تھی جہاں سیکرٹری مجیب مینجر کی حیثیت سے بیٹھا کرتا تھا۔

آج خلاف معمول وہ شام کو جلدی باہر آگیا تھا۔ شاید کسی گھریلو کام سے آرہا ہوگا۔ جیسے ہی اس نے دفتر کے باہر پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی سٹارٹ کی اس نے انسپکٹر خان کو "واکی ٹاکی" پر مطلع کر دیا۔

اب وہ اپنی موٹر سائیکل چلاتا کار کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ ٹریفک کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اژدھام میں سیکرٹری مجیب کی گاڑی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔

تقریباً سات آٹھ منٹ کی اس تکلیف دہ ڈرائیونگ کے بعد بالآخر وہ اس کھلی سڑک پر آ گیا جو یہاں سے شہر کی اس ماڈرن کالونی کو جاتی تھی جہاں مجیب کا گھر تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

ابھی اس سڑک پر اس نے بمشکل ایک ڈیڑھ کلو میٹر ہی کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ سڑک کے ایک کنارے پر پولیس کی جیپ اسے کار کی ہیڈ لائٹس میں کھڑی دکھائی دی۔ ایک کانسٹیبل ٹارچ جلا بجھا کر اسے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"شٹ ——"

اس نے دل ہی دل میں گالی دی۔

گزشتہ چار پانچ ماہ سے شہر کی ہر قابل ذکر سڑک پر ایسے ناکے لگ گئے تھے۔ اسے علم تھا کہ اس کی شناخت ہوتے ہی یہ لوگ سلیوٹ مار کر اسے آگے بڑھا دیں گے۔

لیکن ——

یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ رہی تھی۔

اس نے جیسے ہی گاڑی کو بریک لگائے پولیس کی جیپ سے تین مسلح جوان باہر نکل آئے۔ ایک کے ہاتھ میں بندوق اور باقی دونوں نے ریوالور تھام رکھے تھے جبکہ کانسٹیبل کے ہاتھ میں بھی بندوق پکڑی ہوئی تھی۔

"باہر نکلو —— ہمیں گاڑی کی تلاشی لینی ہے۔"

ریوالور والوں میں سے ایک نے جو انسپکٹر خان تھا اسے حکم دیا۔

"تم لوگ کون ہو —— اور یہ کیا طریقہ ہے گفتگو کا؟"

مجیب کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ اس طرح کسی نے آج تک اس سے بات

نہیں کی تھی۔

"اوئے باہر آئے گا یا تجھے طریقہ سکھاؤں باہر آنے کا۔"

رائفل والے نے کہا۔

"شٹ اپ —— بکواس ....."

ابھی اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُبلنا شروع ہی ہوا تھا جب ریوالور والے نے اس کی کار کا اگلا دروازہ کھول کر اس کا گریبان پکڑا اور جھٹکا دے کر باہر نکال لیا —— !

خدا جانے اس کے ہاتھ کس دھات کے بنے تھے مجیب کا بازو پکڑ کر اس نے اپنی طرف کھینچا تو یوں لگا جیسے اس کے بازو میں یہ انگلیاں گڑ گئی ہوں۔

اس سے پہلے کہ اسے صورت حال کی سمجھ آتے تینوں نے بوکھلائے ہوئے سیکرٹری مجیب کو اٹھا کر پولیس وین میں پھینکا۔

تینوں میں سے دو اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔ ایک وہیں رہ گیا تھا۔ جس نے اس کی گاڑی سنبھالی تھی اور وہ کانسٹیبل جس نے اسے ٹارچ کا سگنل دے کر کھڑا کیا تھا اس نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

وین کے پچھلے حصے کے باہر انھوں نے کینوس کی چادر پھینک کر اندر کا منظر محفوظ کر لیا تھا۔

"کون ہو تم —— مجھے کیوں اغوا کیا ہے۔ کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"

مجیب اب واقعی گھبرانے لگا تھا۔

"تھوڑی دیر کے لیے تمہاری زبان بند نہیں ہو سکتی —— یا پھر ہم بند کر دیں —— تم اندھے ہو۔ تمہیں علم نہیں کہ ہم پولیس والے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُن میں سے ایک نے قدرے غصے سے کہا۔

"لیکن یہ کیا طریقہ ہے۔ تم نے مجھے اغوا کیا ہے۔ میں عدالت میں جاؤں گا۔"

اُس کی آخری بات کا جواب ایک زوردار تھپڑ کی صورت میں اُس کے منہ پر لگا تو مجیب کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اُسے دوسرے ہی لمحے سمجھ آ گئی کہ یہ انٹیلی جنس والے ہیں اور واقعی اگر اس نے اپنی زبان بند نہ کی تو مار مار کر اُس کا بھرکس نکال دیں گے۔

مجیب کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا۔

اس بات کا احساس تو اُسے ہو گیا تھا کہ جن لوگوں نے اُسے کسی ریکارڈ میں لائے بغیر سرِراہ اغوا کیا ہے وہ اس کے ساتھ کوئی بھی سلوک کر سکتے ہیں کیونکہ ان کو کسی قانونی گرفت کا خوف تو تھا نہیں۔

شاید یہ لوگ حاجی صاحب کی طاقت کو بھی نہیں مانتے تھے ورنہ شاید اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت ہی نہ کرتے۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

ایک ہی تھپڑ نے اُسے خاصا عقل مند بنا دیا تھا اور اب وہ خوفزدہ تھا، کن اکھیوں سے اُن دونوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑا بزدل شخص تھا۔ ساری زندگی جرائم پیشہ افراد کے ساتھ گزارنے اور خود جرم کی دنیا کا باشندہ ہونے کے باوجود پولیس سے اُس کی جان جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی جس علاقے میں بھی وہ حاجی صاحب کے لیے "نئی منڈی" تلاش کرتا وہاں سب سے پہلے مقامی تھانے کو ہاتھ میں لینا تھا۔ اس نے بڑا سستا سا نسخہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ مقامی پولیس کا منہ نوٹوں سے بند کرنے کے بعد وہ بغیر کسی ڈر خوف کے اپنا مکروہ دھندہ چلا رہا تھا۔

مجیب کو یوں لگا جیسے اب ساری زندگی کے گناہوں اور جرائم کا حساب دینے

کا وقت آ گیا تھا۔

کچھ بھی ہو جائے اس نے سوچا کہ وہ کم از کم ان لوگوں کی مار پٹائی کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ ان کی مار سے بچنے کے لیے اگر اُسے حاجی صاحب کے سارے بھید بھی اُگلنے پڑے تو اُگل دے گا۔ اُس کی طرف سے سب کچھ جاتا جہنم میں۔ اگر ان لوگوں نے ایک آدھ دن اس کی ٹھکائی کر دی تو ساری زندگی اپنا سامنا بھی نہیں کر سکے گا۔

گاڑی اب ایک ماڈرن کالونی کے بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔

یہ کسی انٹیلی جنس ایجنسی کا سیف ہاؤس تھا۔

ذہن کا پردہ ہٹنے پر جو چہرے سیکرٹری مجیب کو اپنے استقبال کے لیے دکھائی دیے اُنہیں دیکھ کر ہی اس کی گھگھی بندھ گئی۔

اُن میں سے ایک نے ہاتھ لمبا کر کے اس کا کالر تھام کر اپنی طرف جھٹکا دیا تو مجیب ربڑ کی طرح اُس کی طرف کھنچا چلا گیا۔ اس کے منہ سے خوف اور اذیت سے ملی جلی ایسی آوازیں بلند ہو رہی تھیں جن کا مطلب خود اُسے بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"چلو بیٹا تمہیں ذرا اپنا تعارف کروا دیں ـــــ بہت بے چینی لگی تھی تمہیں ـــــ"

انسپکٹر خان نے اس کی گدی میں ہاتھ جماتے ہوئے اُسے آگے کی طرف دھکا دیا۔

"دیکھو میرے ساتھ زیادتی نہ کرو ـــــ آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں حاجی صاحب کا سیکرٹری ہوں اور ـــــ اور..."

"اور ہم بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کے خوف زدہ حلق سے برآمد ہونے والے نامکمل فقرے کو انسپکٹر خان نے مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"مم۔ مم۔ میرا مطلب ہے...."

اُس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

"تمہارا مطلب کیا ہے میں جانتا ہوں۔ ابھی تمہارا چھترول شروع نہیں ہوا اور تم بوکھلا گئے ہو۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ اگر افسران کے سامنے تمہاری زبان سے کوئی جھوٹی بات نکلی تو ہم تمہاری زبان اور ہاتھ کاٹ کر تمہارے حاجی کے سامنے پھینک آئیں گے ___ اور کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا ___ ابھی فیصلہ کر لو کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہو یا جوتوں کے ساتھ پیاز کھاؤ گے ___"

اُسے دھکے دے کر ایک کمرے میں لے جاتے ہوئے انسپکٹر خان نے ایسے لہجے میں کہا کہ سیکرٹری مجیب کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔

ایجنسی کے لوگوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ مجیب کے انتخاب میں حاجی نے غلطی کی ہے۔ ممکن ہے وہ بہت مکار رہا ہو اپنے فن میں یکتا سمجھا جاتا ہو، لیکن وہ اس قابل ہرگز نہیں تھا کہ پولیس کے دو جوتے بھی برداشت کر لیتا۔

چند منٹ میں ہی انسپکٹر خان اور اُس کے ساتھیوں نے اُسے "چالو" کر دیا۔ ایس پی سلیم باجوہ کا کام خاصا آسان ہو گیا تھا۔

O

سیکرٹری مجیب کو کچھ دیر بعد وہ لوگ اس بنگلے کے تہہ خانے میں لے گئے جہاں ایک میز کے آمنے سامنے موجود کرسیوں میں سے ایک پر ایس پی سلیم باجوہ موجود تھا۔

"اپنے گھر فون کر کے اطلاع دو کہ تم اچانک کسی کام سے شہر سے باہر جا رہے ہو اور رات کو گھر نہیں جا سکو گے۔"

باجوہ نے اس کے سامنے بیٹھتے ہی ٹیلی فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن مَیں تو ___ میں تعاون کے لیے تیار ہوں۔"

مجیب نے کہنا چاہا۔

"اسی بات کا اندازہ کرنے کے لیے تمہیں آج رات کا مہمان رکھا ہے ورنہ یہ مدت کم از کم ایک سال ہوتی۔ اور یہ بات بھی ذہن نشین کر لو کہ تم تعاون کر کے ہمارے اوپر کوئی احسان نہیں کرو گے اپنی جان بخشی کرواؤ گے اور یہ غلط فہمی اپنے دل سے ابھی نکال دو کہ ہمیں بے وقوف بنا لو گے۔ یاد رکھنا اگر تمہاری کہی ہوئی بات غلط ثابت ہو گئی تو ساری زندگی معذوروں کی طرح گزارو گے۔ تم خود جرائم پیشہ آدمی ہو اور جانتے ہو کہ تمہیں کسی ریکارڈ میں لائے بغیر گرفتار کیا گیا ہے۔ اگر ہم تمہیں گولی مار دیں تو بھی ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم یہاں جو کچھ بھی کہو گے اس پر کوئی صرف تمہارے کہنے پر یقین نہیں کرے گا۔ ہم ہر بات کی خود انکوائری کریں گے۔ اس کے بعد ہی تمہارے سچ کو سچ مانا جائے گا۔ مسٹر مجیب یہ بات کان کھول کر سن لو کہ اگر تم نے معمولی سی بھی غلط بیانی کی تو ساری زندگی ملکی اور غیر ملکی جیلوں میں سڑتے رہو گے اور یہ تمہارا حاجی ___ یہ الّو کا پٹھا تمہاری ضمانت کے لیے بھی نہیں آئے گا۔ کیونکہ اُسے تم جیسے ہزاروں زرخرید غلام مل سکتے ہیں۔ یوں بھی اُسے تم سے کوئی عشق نہیں ہو گیا۔ تم اس کی حرامکاریوں میں اس کے مکمل معاون ہوتے ہو اسی لیے تم اُسے عزیز ہو ___ تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرتبہ اگر انہیں اپنے کسی ساتھی پر شک بھی گزرے کہ وہ پولیس کی تحویل میں آ گیا ہے تو اُسے کتے کی موت مروا دیتے ہیں۔ اس لیے میں نے تمہیں کہا ہے کہ اپنے گھر فون کر کے کوئی بہانہ کر دو۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ تم ہمارے قبضے میں ہو۔"

ایس پی باجوہ کے منہ سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ پگھلے سیسے کی طرح اس کے کانوں کے راستے دل و دماغ میں داخل ہو رہا تھا۔ واقعی اس نے ٹھیک کہا تھا کہ اگر حاجی کو اس بات کا شک بھی ہو گیا کہ اُسے انٹیلی جنس والوں نے پکڑا تھا تو وہ سیکرٹری کو آسانی سے مروا دے گا۔ کسی مشتبہ شخص کو اپنے ساتھ رکھنا کسی بھی حاجی جیسے شخص کے لیے اپنی موت کے "ڈیتھ وارنٹ" سائن کرنے والی بات ہوتی۔

"مسٹر مجیب ہمارے لیے تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں اگر ہم حاجی تک صرف یہ اطلاع پہنچا دیں کہ تم انٹیلی جنس کے قبضے میں ہو تو وہ تمہارا خود ہی بندوبست کر دے گا۔ اگر تمہیں جان سے نہیں مارے گا تو کم از کم بارہ پتھر ضرور کر دے گا اور پھر تمہاری عیاشیاں ہیں۔ یہ جو تم نے اپنے گھر والوں سے چوری چھپے تین ماہ پہلے خفیہ شادی کی ہے اُن لوگوں کا کیا بنے گا؟ اس بات پر تم خود ہی اچھی طرح غور کر لو۔"

ایس پی باجوہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے چلائے ہوئے تمام تیر ایک ایک کر کے صحیح نشانے پر لگے ہیں۔

"نہیں نہیں ——— خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے۔ آپ جس طرح کہیں گے میں آپ کے ساتھ تعاون کروں گا۔"

مجیب کے چہرے کا رنگ زرد پڑنے لگا۔

"ٹھیک ہے تم فی الحال گھر فون کرو اور خود کو نارمل رکھو۔"

یہ کہتے ہوئے ایس پی صاحب نے فون اس طرف بڑھا دیا اور دروازے پر موجود گارڈ کو چائے لانے کا حکم دیا۔

مجیب نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے گھر کا نمبر ملایا تھا اور لائن ملنے پر دوسری طرف موجود شخص کو بتایا تھا کہ اچانک کسی کام سے اُسے دوسرے شہر جانا ہے وہ رات کو گھر نہیں آئے گا اگر کسی کا فون آئے تو اُسے بھی بتا دیں۔

باجوہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کرنے کے بعد خاصا محتاط ہو کر بات کر رہا تھا۔

"میری گاڑی کہاں ہے ———"

فون رکھتے ہی اُس نے پہلا سوال کیا تھا۔

"بالکل محفوظ ہے ——— تم کل اُسے خود چلا کر اپنے گھر جاؤ گے، لیکن یہ پیشکش مشروط ہے تمہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے۔"

ایس پی صاحب نے اُسے پھر حالات کی سنگینی یاد دلائی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں حاضر ہوں ——— آپ پوچھیں ——— پوچھیں۔"

وہ خاصا بے چین اور گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

چائے آ گئی ———

باجوہ کے حکم پر اردلی نے چائے بنا کر اُن دونوں کے سامنے رکھی اور باہر چلا گیا۔

"یہ ندیم کا کیا قصہ ہے۔"

اُس نے پہلا سوال داغتے ہوئے نامحسوس انداز میں اپنے پاؤں سے ایک بٹن دبایا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں ہونے والی تمام گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مختصر بات یہ ہے جناب کہ اس کی کسی انگریز سے دوستی تھی اور اُسے ویزا مل رہا تھا۔ حاجی صاحب کی اس دوران امریکہ سے ایک "ڈیل" ہو رہی تھی۔ انہیں "کوریئر" (سامان لے جانے والا) چاہیے تھا۔ ہم نے اس مقصد کے لیے ندیم کو چن لیا ــــ باقی حالات آپ کے علم میں ہیں۔"

اُس نے کہا۔

ایس پی باجوہ نے دو تین گھنٹے اُس سے کرید کرید کر سوالات کیے ــــ گھما پھرا کر اس سے اس شہر کی حد تک حاجی کے پھیلائے ہوئے جرائم کے جال کی تفصیلات معلوم کیں اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کم از کم امریکہ والے معاملے میں حاجی اور ندیم دونوں دھوکے کا شکار ہوئے ہیں

دونوں کو بظاہر یہی وہم رہا کہ وہ اپنا اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں لیکن اصل میں اس چکر میں کوئی اور اپنا اُلّو سیدھا کر گیا اور پاکستان کو بدنام کرنے کی ناپاک سازش کامیاب ہوئی ــــ!

اس نے اس شہر میں حاجی کے اڈے۔

اس کا مال سپلائی کرنے کا طریقہ۔

یہاں اس کے کارندوں کی مکمل فہرست۔ اور دیگر معلومات حاصل کر لی تھیں۔

سیکرٹری مجیب نے واقعی اُن کے ساتھ تعاون کیا تھا ــــ اُس نے اپنی معلومات کی حد تک انہیں ہر وہ بات بتا دی تھی جو اُن کے لیے کار آمد ہو سکتی تھی۔

اب جو کچھ بھی کرنا تھا باجوہ کو کرنا تھا۔

کیا وہ اس دریا میں رہ کر اتنے بڑے مگر مچھ سے دشمنی مول لے سکتا ہے؟

حاجی کے خلاف کارروائی کے دوران اس پر کون کون سے پریشر آ سکتے ہیں۔ کن کن اعلیٰ افسران سے اس کا یارانہ ہے اور اربابِ اختیار سے اس کی کتنی گاڑھی چھنتی ہے۔ کیا ان حالات میں پولیس کا ایک معمولی سا ایس پی اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکے گا ــــ؟

یہ تھے وہ سوالات جو اس کے ذہن کو بار بار کچوکے دے رہے تھے۔

جب تک اسے ان گھناؤنے واقعات کا علم نہیں تھا تب تک تو اس کے پاس حاجی کے خلاف کارروائی نہ کرنے کا کوئی جواز موجود تھا۔

لیکن ــــ

سب کچھ جاننے کے بعد ایک باضمیر اور باغیرت پولیس آفیسر ہونے کے ناطے اب اُس کے پاس فرار کی کوئی راہ باقی نہیں بچی تھی۔

"ٹھیک ہے تم اپنے گھر جاؤ۔ خود کو نارمل رکھو ــــ ابھی ہمیں تمہارا تعاون درکار رہے گا۔ فی الوقت تم معمول کے مطابق سب کام کرتے رہو۔ اگر تم نے خود کو ابنارمل ظاہر کیا تو یاد رکھنا اپنے لیے خود گڑھا کھود لو گے۔ ہم تمہیں کبھی بے جا تکلیف نہیں دیں گے لیکن جہاں تمہاری مدد درکار ہوئی تمہیں ہماری مدد کرنا پڑے گی۔ میں اس بات کا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ تمہیں اس کیس سے بچا لوں گا۔ یوں بھی تمہارا کبھی مجرم سے براہِ راست تعلق نہیں بنتا۔ اب تم جاؤ تمہاری گاڑی باہر موجود ہے۔"

باجوہ نے اُسے رخصت کر دیا۔

"شکریہ جناب!"

مجیب نے گھگھیاتے ہوئے کہا اور ایک سپاہی کی معیت میں باہر آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صبح کی اذان ہو رہی تھی۔

اس بنگلے کے پورچ میں اس کی گاڑی موجود تھی۔

مجیب نے گاڑی کے نزدیک موجود انسپکٹر خان اور اس کے ساتھیوں کو جو اسے کل شام یہاں لے کر آئے تھے جھک جھک کر سلام کیے اور گاڑی سٹارٹ کر کے باہر آ گیا۔۔۔!

اس کے لیے گھر پہنچ کر پہلی خوشخبری یہی تھی کہ اس درمیان اس کے لیے کوئی فون نہیں آیا تھا ورنہ اس کے دل کو دھڑکا ہی لگا رہتا۔

"ٹھیک ہے کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں رات گھر سے باہر رہا ہوں۔ میرا ایک نجی کام تھا۔"

اس نے اپنی اصلی بیوی کو سمجھایا اور انہیں کپڑوں سمیت بیڈ روم میں بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

اگلے روز وہ معمول کے مطابق کام پر گیا تھا۔

اس نے باجوہ کی نصیحت پلے باندھ لی تھی اور خود کو حتی المقدور نارمل رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کسی حرکت سے بھی حاجی صاحب کو اس پر معمولی سا شک گزرے۔

○

"اس میں اجازت کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ باجوہ یار تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیسی باتیں کر رہے ہو۔"

آئی جی صاحب نے اپنے سامنے بیٹھے ایس پی سلیم باجوہ کی طرف دیکھتے ہوئے حیرانگی سے کہا جو اُن کے سامنے حاجی کے کالے کرتوت کی فائل رکھے اس کے خلاف کارروائی کی اجازت مانگ رہا تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

"سر۔ میں جانتا ہوں کہ رولز کے مطابق مجھے کسی مجرم کو گرفتار کرنے کے لیے کسی اعلیٰ افسر کی اجازت نہیں چاہیئے۔ لیکن یہ کوئی عام آدمی نہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ بہت پریشر آئے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے جرائم کا جال اس چالاکی سے بُنا ہے کہ بڑے بڑے بااثر لوگوں کو بھی اس میں لپیٹ لیا ہے۔۔۔ بڑا طوفان اُٹھے گا سر۔۔۔ اور وہ اخبار والا طالب کھارا بھی اس شہر میں موجود ہے وہ میرے متعلق پہلے بھی کوئی نیک گمان نہیں رکھتا۔ حاجی صاحب جیسے مہذب اور جدید طریقہ ہائے جرائم کے ماسٹر میڈیا کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔ یہ لوگ ساری زندگی ان جرائم پیشہ اخبار نویسوں کو اسی لیے پالتے ہیں کہ وقت آنے پر وہ ان کی ڈھال بن سکیں۔ آپ جانتے ہیں سال پہلے اسی شہر سے میرا تبادلہ کن حالات میں کروا دیا گیا تھا۔۔۔"

باجوہ نے بھی دل کی بھڑاس نکالنا ضروری سمجھا۔

"باجوہ صاحب۔۔۔ بہرحال ہم اس معاشرے کا حصہ ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ پریشر آئیں گے لیکن کسی نہ کسی کو تو یہ پتھر پھینکنا ہی ہے۔ تم جیسے نوجوان آفیسر اس محکمے کی اُمید ہیں۔ جاؤ اور خدا پر بھروسہ کر کے میدان میں کود پڑو۔ کسی کی پرواہ نہ کرنا۔ میری تین چار سال کی نوکری رہ گئی ہے۔۔۔ یہ مجھے چاہے جہنم میں بھیج دیں اتنا عرصہ میں وہاں بھی گزار لوں گا لیکن کوئی درندہ ہمارے بچوں کی رگوں میں ہماری آنکھوں کے سامنے زہر گھولتا رہے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں۔ میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔ میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تمام دباؤ میں اپنے اوپر لے لوں گا لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس مرتبہ تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

آئی جی صاحب کا پُرعزم لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں کر کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ہمت بھی رکھتے ہیں اور اس مرتبہ باجوہ کو سال پہلے والی صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

شاکرہ بیگم نے معمول کے مطابق تیاری کی اور ڈرائیور کو گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے دماغ میں ابھی تک حاجی صاحب کی کل کی بات گونج رہی تھی۔ انہوں نے شاکرہ بیگم کو طعنہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

"شاکرہ بیگم زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے اور تم ابھی تک پرانی کار کی طرح دھچکے کھا رہی ہو۔ نئے گاہک لاؤ۔ نئے گاہک۔ عالمی منڈی میں ہمیں بہت نقصان ہوا ہے وہ ہم نے کہاں سے پورا کرنا ہے۔ میں اپنا گھر بیچ کر تو تمہارے للّے تللّے پورے نہیں کر سکتا۔ کچھ ہل جل بھی کر لیا کرو۔ بس انہی پندرہ بیس لڑکوں کو لے کر کب تک بیٹھی رہو گی۔ تم سے تو وہ لونڈیا تیز نکلی جو ابھی تین چار ماہ پہلے ہی ہمارے دھندے میں آئی تھی اور آج اس کے پاس چالیس پچاس گاہک موجود ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن اُس کے گاہکوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"

شاکرہ بیگم نے بھی محسوس کیا تھا جیسے وہ اب بوڑھی ہونے لگی ہے۔ واقعی گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے جب سے اُس نے بزنس سنبھالا تھا اس کی گاہکوں کی تعداد ایک جگہ رُک سی گئی تھی۔ اُن کا کام شہر کے اُن خواتین کالجوں میں ہیروئن کی لعنت پھیلانا تھا جہاں اچھے گھرانوں کی لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

ان سیدھی سادی مغرب زدہ بچیوں کو جن کے اذہان اور معصومیت کو ان کے گھروں کا ماحول بچپن ہی میں ڈس لیا کرتا ہے ورغلانا اور اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے بروئے کار لانا اُس کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا۔

شاکرہ بیگم جیسی فاحشائیں ماڈرن سوشل ورکرز اور آزاد خیال بیگمات کے رُوپ میں ایسے کالجوں اور مخلوط محافل میں آتی جاتی رہتی تھیں جہاں یہ کچے ذہن کی لڑکیاں موجود ہوتیں۔ اپنے شکار کا انتخاب کرنے کے بعد اُن سے دوستی کرنا اور انہیں سوشل ورکر کی آڑ میں اپنے ساتھ لگا کر مخلوط محافل تک لانا اور نشے کی لت میں مبتلا کرنا اُن کے لیے کبھی کارِ دارد نہیں رہا تھا۔

کب تک یہ بدقسمت لڑکیاں اس قابل رہتیں۔ اپنے گھر سے چوری کر کے اپنے نشے کی لت پوری کرتی رہیں۔ بالآخر انہیں شاکرہ بیگم کے اشاروں پر ناچنا پڑتا۔ پہلے پہل تو وہ جیسے تیسے اپنا خرچ چلاتیں، پھر اپنی مقصد براری کے لیے وہ اپنی کسی ساتھی کو اس گھناؤنے نشے پر لگاتیں۔

لیکن ——

تب تک اُن کی اپنی حالت ایسی ہو جاتی تھی کہ اُن کا گزارہ مشکل سے ہوتا اور وہ شاکرہ بیگم اور اس جیسی ماڈرن فاحشاؤں کی برپا کردہ مخلوط محافل میں کسی ایسے نوجوان امیرزادے کو پھانستیں جو اُن کے لیے نشے کا بندوبست کر سکے۔ پھر وہ مرحلہ آجاتا۔ جب انہیں اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے شاکرہ بیگم کی مدد سے جسم فروشی کرنی پڑتی اور شریف گھرانوں کی یہ معصوم بچیاں جسم فروش لڑکیوں میں تبدیل ہو جاتیں۔

اُن کے والدین کو آخر دم تک اپنی صاحبزادیوں کے کرتوت کا علم نہیں ہو پاتا تھا کیونکہ اُن کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ اپنے بچوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکیں۔ ان میں سے بیشتر بدقسمت لڑکیوں کا انجام خودکشی اور موت ہوتا۔ مرنے سے پہلے وہ اتنی بزدل اور خوف زدہ ہوتی تھیں کہ اپنی موت کا سبب بھی نہیں لکھ پاتی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر مرنے سے پہلے کسی کے والدین کو اپنی بچّی کے کرتوت کا علم ہو جاتا تو بھی وہ مصلحت کے تحت خاموش رہتے اور کوشش کرتے کہ اپنی مصیبت کسی اور کے گلے منڈھ دیں۔

وہ اپنی بیٹی کو کسی غریب نوجوان کے ساتھ بیاہ کر اُسے ساری زندگی عذاب میں مبتلا کر دیتے۔

آج بھی شاکرہ بیگم اپنے معمول کے مطابق اپنا بڑا سا ریبرس ہیروئن کی پڑیوں سے بھر کر نیا ڈرن گرلز کالج کی طرف جا رہی تھی۔

اس کے ڈرائیور نے گاڑی معمول کے مطابق ہی کھڑی کی تھی۔ اب بیگم صاحبہ بڑے وقار سے قدم رکھتیں کالج کے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ چوکیدار اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مؤدب ہو گیا تھا۔

شاکرہ بیگم نے ابھی بمشکل چند قدم ہی اُٹھائے تھے جب سفید کپڑوں میں ملبوس تین ہٹے کٹے پولیس والوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا۔ اس ٹیم کی سربراہ ایک لیڈی پولیس آفیسر تھی جس نے شاکرہ بیگم کو حکم دیا کہ اپنا پرس زمین پر رکھ دے۔

"بکواس مت کرو۔ کون ہو تم؟"

شاکرہ بیگم کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اس صورتحال کا سامنا کرنے کا تصور نہیں کیا تھا۔ خدا جانے یہ بلائیں کہاں سے نازل ہو گئی تھیں۔

"شاکرہ بیگم میں پولیس آفیسر ہوں اور تمہیں حکم دے رہی ہوں کہ پرس زمین پر رکھ کر پیچھے ہٹ جاؤ۔"

لیڈی انسپکٹر نے دوبارہ اُسے حکم دیا۔

"شٹ اپ ــــ"

کہتے ہوئے شاکرہ بیگم نے چاہا کہ اپنی گاڑی کی طرف واپس مڑے۔

لیکن ــــ

بجلی کی سی پھرتی سے لیڈی انسپکٹر نے اُس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور پرس کھینچ کر اپنے قبضے میں لے لیا۔

"کیا بدتمیزی ہے۔ تم مجھے نہیں جانتے میں تمہاری پیٹیاں اُتروا دوں گی۔"

شاکرہ بیگم پر مغلظات کا دورہ پڑ گیا تھا۔

اچانک ہی وہاں ایک اخبار کا فوٹو گرافر اور تین چار معزز شہری بھی آ گئے۔ ماجرہ نے اس مرتبہ کوئی کمزوری دشمنوں کے لیے نہیں چھوڑی تھی۔ جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے۔ یہاں موجود تین آدمی معزز شہری تھے جو موقعے کے گواہ بنائے گئے۔ اُن کے سامنے لیڈی انسپکٹر نے پرس کھولا جو ہیروئن سے بھرا ہوا تھا۔

اخبار کے فوٹو گرافر نے موقع کی تصاویر بنائیں اور گالیاں بکتی شاکرہ بیگم کو وہ لوگ اپنی جیپ کی طرف لے گئے۔ جیپ کے نزدیک پہنچ کر شاکرہ بیگم نے چاہا کہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ جائے۔

لیکن ــــ

اُس کے منہ پر لگنے والے زوردار تھپڑ نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ ایک مرتبہ پھر غصے اور اذیت کی شدت سے وہ گالیاں بکنے لگی لیکن لیڈی انسپکٹر کی دو تین ضربات سے ہی اس کے ہوش ٹھکانے پر آ گئے اور وہ بچوں کی طرح چیخنے چلّانے لگی۔

ریمنڈر کالج کے کھلے گیٹ سے بہت سی طالبات دیکھ رہی تھیں جو اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکیں اور باہر آ گئی تھیں۔

انہوں نے جان لیا تھا کہ شاکرہ بیگم کی اصلیت کیا ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پولیس کی جیپ اُسے لے کر چلی گئی تھی۔ معززین اپنی گاڑیوں میں واپس لوٹ گئے۔ کالج میں واپس پہنچ کر تماشہ دیکھنے والی لڑکیوں نے کالج کے در و دیوار ہلا دیے۔

بیگم شاکرہ ہیروئن فروش تھی۔

اس خبر نے کئی لڑکیوں کے تو ہوش ہی اُڑا دیے تھے۔

یہ اپنی نوعیت کی واحد کارروائی نہیں تھی جو یہاں انجام پائی۔ شہر کے تین اور کالجوں کے سامنے بھی یہی تماشا ہوا تھا اور ہر جگہ موقعے کے گواہ اور فوٹوگرافر پہلے سے موجود تھے۔

حاجی صاحب جو بے چارے ایم پی اے بننے کے خواب دیکھ رہے تھے ندیم کی گرفتاری سے پڑنے والی افتاد کے ہاتھوں سخت رنجیدہ تھے۔ یہاں کے کچھ اخبارات نے امریکی اخباروں کی خبر نقل کر کے شائع کر دی تھی اور حاجی صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

انہوں نے گو کہ اگلے ہی روز پریس کانفرنس کر کے اپنے پر لگے الزامات کی صفائی دی تھی اور اخبار نویسوں کو بتایا تھا کہ ندیم نامی نوجوان اُن کی تنظیم کا ممبر ضرور تھا لیکن اس کے کرتوت کا حاجی صاحب کو ہرگز علم نہیں تھا کیونکہ یہ اُن کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس نیک کام میں حصہ لینے والے سے پہلے پولیس سرٹیفکیٹ لانے کی درخواست کریں۔

آج کل وہ ذہنی طور پر خود کو الیکشن کے لیے تیار کر رہے تھے اور اس سلسلے میں آج بھی انہوں نے ایک خصوصی دعوت کا اہتمام کیا تھا جہاں پریس اور زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے اپنے کرمفرماؤں کو مدعو کر رکھا تھا۔

فائیو سٹار ہوٹل کے مؤدب بیرے ہال کمرے کے ایک کونے میں اشیائے

خورد و نوش سجا رہے تھے اور حاجی صاحب اپنی خطابت کے کمال دکھا رہے تھے جب اچانک ہال کمرے کے دروازے سے پولیس کی ایک ٹولی اندر گھس آئی۔

ان پولیس والوں کی کمان سفید کپڑوں میں ملبوس اینٹی ڈرگ فورس کا ایس پی سلیم باجوہ کر رہا تھا۔

وہ سیدھا حاجی صاحب کے سر پر جا کھڑا ہوا تھا۔

"حاجی صاحب میں آپ کو ہیروئن فروشی، بردہ فروشی اور فحاشی کے اڈے چلانے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔"

اُس نے بڑے مؤدب لہجے میں کہا۔

"تم پاگل ہو ـــــ تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم اُلّو کے پٹھے ہو ـــــ"

حاجی صاحب کا صدمے اور بے عزتی کے احساس سے دماغ خراب ہونے لگا تھا۔

"میرے پاس آپ کی گرفتاری کا وارنٹ ہے اگر کوئی صاحب دیکھنا چاہیں تو تصدیق کر سکتے ہیں۔"

اُس نے حاجی صاحب کے پہلو میں موجود شہر کے ایک معزز وکیل کو گرفتاری کا حکم دکھایا جس نے ایک نظر اُس پر ڈال کر اُس کے صحیح ہونے کی تصدیق کر دی۔

"دفع ہو جاؤ ـــــ میں تم سب کو اندر کروا دوں گا۔ تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی؟"

حاجی صاحب اپنی ترنگ میں تھے۔

"حاجی صاحب میری درخواست ہو گی کہ آپ خود پر قابو رکھیں اور ہمارے لیے مسائل پیدا نہ کریں۔"

حاجی صاحب نے چاہا تھا کہ اُس کے منہ پر تھپڑ رسید کریں۔ کیونکہ باجوہ اُن کے بالکل قریب کھڑا تھا، جیسے ہی انہوں نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی چیخ بھی اس کے ساتھ ہی بلند ہوئی تھی۔

باجوہ نے اُن کے ہاتھ کو خدا جانے کس طرح پکڑ کر جھٹکا کہ حاجی صاحب کو اپنا بازو ٹوٹتا محسوس ہوا۔ اس نے حاجی صاحب کا دوسرا بازو بھی اپنے قبضے میں لے کر ایک انسپکٹر کو اشارہ کیا جس نے انہیں ہتھکڑی پہنا دی۔

تھوڑی دیر بعد مستقبل میں ایم پی اے بننے کا خواب دیکھنے والے ہیروئن فروش حاجی صاحب کو پولیس کے جوان دھکے دیتے ہوئے حوالات کی طرف لے جا رہے تھے۔

O

اخبار مجیب کے سامنے موجود تھا اور شاکرہ بیگم کی تصویر اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

قریباً تمام اخبارات نے اپنے صفحۂ اول پر اس نام نہاد سوشل ورکر کے کالے کرتوت شائع کیے تھے۔ موقعۂ واردات کی تصاویر تمام اخبارات کو جاری کر دی گئی تھیں۔

لیکن ـــــ

پولیس نے فی الوقت موقع کے گواہوں کے نام نہیں بتائے تھے۔ ان کی شناخت خفیہ رکھی گئی تھی کیونکہ باجوہ نے اس خطرے کو نظرانداز نہیں کیا تھا کہ حاجی کے کارندے ان گواہوں کو ڈرا دھمکا کر بیان بدلنے پر بھی مجبور کر سکتے تھے۔

تینوں گواہوں کے متعلق ایک بات کا تو اُسے یقین تھا کہ انہیں حاجی کی دولت متاثر نہیں کر سکتی تھی لیکن وہ بہرحال شریف آدمی تھے یعنی ممکن تھا کہ غنڈہ گردی سے انہیں دبا لیا جاتا۔

حاجی صاحب نے ساری زندگی بدمعاش پولیس کی سرپرستی کی تھی۔ انہوں نے تو کبھی تھانے کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اُن کا ایمان تھا کہ دام بنائے کام ـــ اور

وہ اس پر دامے درمے قدمے سخنے عمل پیرا بھی رہتے تھے۔

اُن کے نزدیک ہر پولیس آفیسر کی ایک قیمت تھی۔

لیکن ـــــ

اس مرتبہ اُن کا استقبال جس تھانے میں جن چہروں نے کیا وہ سب کچھ حاجی صاحب کے لیے نیا ہی نہیں چونکا دینے والا بھی تھا۔

تھانے میں گھسنے ہی اس کی "لتر پریڈ" شروع ہو گئی۔

حاجی کو ابھی ایک جوتا ہی لگا تھا کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اس نے بچوں کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا لیکن یہاں کس کو فرصت تھی کہ اس کے چیخنے چلانے پر توجہ دیتا۔ وہ لوگ تو اردگرد کے ماحول سے بالکل بیگانہ اور بے نیاز نظر آتے تھے اور بڑی جانفشانی سے حاجی صاحب کی دھنائی کر رہے تھے۔

حاجی کو ابھی پندرہ بیس جوتے اور ڈنڈے پڑے تھے کہ چیخنے چلاتے اچانک اس کی آواز بند ہو گئی۔

"مر گیا ـــــ"

اُسی حوالدار نے جس کا قد چھ فٹ سے زیادہ اور شکل ہی سے پرانے زمانے کا کوئی جلاد دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ساتھی سے تصدیق چاہی۔

"نہیں جناب۔ اتنا کمزور نہیں ہے۔ اس کے جسم پر ساری چربی حرام کاری کی چڑھی ہوئی ہے۔"

حوالدار کے ساتھی سپاہی نے کہا۔

"اچھا ہوش میں لاؤ۔"

حوالدار کے حکم پر اُس کے ساتھی نے پانی کا گلاس بھر کر حاجی کے منہ پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زور دار چھینٹے مارے اور ہوش میں آنے پر گلاس کا بچا کھچا پانی اُس کے منت سماجت کرنے پر اُسے پینے کے لیے دے دیا۔

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری ہر ممکن خدمت کروں گا۔ جس طرح کہو گے خدمت کروں گا۔ تم لوگ پاگل ہو، تم نہیں جانتے کہ میں کون۔۔"

ابھی اُس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ حوالدار نے دوبارہ اُس کی دھنائی شروع کر دی۔

"معلوم ہوتا ہے ابھی تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں آیا۔"

اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تم معاف کر دو ___ معاف کر دو ___ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

حاجی خوفزدہ میمنے کی طرح گھگھیا رہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے لیکن اپنا دماغ درست رکھنا۔ ابھی تمہیں ہمارے ساتھ بہت وقت گزارنا ہے۔ اگر اس دوران کبھی تمہارے منہ سے دوبارہ یہ فقرہ نکلا تو یاد رکھنا تمہاری ہڈی پسلی برابر کر دیں گے۔ تم کیا ہو اس کا پتہ تمہیں ابھی چل جائے گا۔"

حوالدار نے اندازہ کر لیا تھا کہ اگر دس پندرہ منٹ مزید اس چکر میں لگ گئے تو حاجی صاحب کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اُس نے اپنی زندگی میں اتنے بڑے دھندے سے وابستہ اتنے بڑے نام والا ایسا بزدل ملزم کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"بند کر دو اسے حوالات میں ___ سالا! بین الاقوامی سمگلر بنتا ہے۔ چڑی جتنا دل نہیں کمبخت کا۔ اس حرامی کو تو مارنے کا ذرا لطف نہیں آیا۔ اسے دھکا دو کہیں اور، اُسے لاؤ وہ اُس ڈاکو کی اولاد کو ___"

حوالدار نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے حاجی کی کمر میں لات رسید کی اور حاجی اُلٹ کر دور جا گرا۔

"چل اوئے۔"

اُسی سپاہی نے حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف جھٹکا دیا اور گرنے سے پہلے دوسرا جھٹکا دے کر اُسے سیدھا کھڑا کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی حاجی صاحب حوالات میں بند تھے۔

اُس کے جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

سارے زیادہ دُکھ حاجی صاحب کو اُس ذلت کے احساس کا تھا جس سے انہیں دوچار ہونا پڑا۔ زندگی میں کبھی بدترین حالات میں بھی انہوں نے اس بات کا تصور نہیں کیا تھا کہ پولیس کا معمولی حوالدار اس طرح انہیں ذلیل کرے گا۔

حاجی صاحب کی جسمانی تکلیف پر اب اُن کا غصہ بھاری پڑنے لگا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اب مار کی چوٹوں کا احساس قدرے کم ہو گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھر کا بھیدی

سپاہی نذیر ماچھی نے پہلی نظر میں حاجی صاحب کو پہچان لیا تھا۔

وہ حال ہی میں لائن حاضر ہونے کے بعد بڑی منت سماجت اور افسروں کے سامنے ناک رگڑنے کے بعد بڑی مشکل سے یہاں سی آئی اے سٹاف میں اپنا تبادلہ کروانے کے قابل ہوا تھا۔

لیکن ——

گزشتہ پندرہ روز سے اُس کی جیب میں ایک چونی بھی نہیں گئی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اس گھمبیر صورتِ حال کا سامنا کر رہا تھا۔ اُس نے گزشتہ پندرہ سالہ نوکری میں ایک دن حلال کی کمائی پر گزارہ نہیں کیا تھا۔

لیکن ——

خدا جانے کس کی بددعا اُسے لگی کہ اپنے کالے کرتوت پر لائن حاضر ہونے کے بعد وہ منت سماجت کر کے اگر پہنچا بھی تو کہاں؟

بسا اوقات وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ اس سے تو "پولیس لائن" ہی بہتر تھی۔ رات کو گشت کے دوران ہی کسی سائیکل یا موٹر سائیکل سوار کو گھیر کر سو پچاس روپے اینٹھ لیا کرتا تھا۔

کیا اُسے اب اپنی تنخواہ پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔

یہ تصور ہی اُس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔

پانچ بچے اکرایے کا مکان، بیوی کے نخرے اور اپنے رشتے کی ایک سالی سے اُس کے ناجائز تعلقات۔

کیا وہ یہ سارے جھنجھٹ اپنی تنخواہ سے پورے کر پائے گا؟

اس تنخواہ سے تو وہ اپنے سگریٹوں کا خرچہ اور بچوں کی سکول فیسیں بھی نہیں دے سکتا تھا۔

اُس رات وہ بہت پریشان تھا اور دل ہی دل میں یہاں سے تبادلے کا منصوبہ طے کر رہا تھا جب اُس کی ڈیوٹی حوالات گارد پر لگا دی گئی —— اور یہاں سب سے پہلے ہی اس کی ملاقات حاجی صاحب سے ہوئی۔

وہ حاجی صاحب کے علاقے میں تین سال گزار چکا تھا۔ تب حاجی صاحب چھوٹے درجے کے سمگلر تھے اور بشیر ماچھی ان سے انسپکٹر کے حصے کے پیسے وصول کرنے آیا کرتا تھا۔ حاجی صاحب ترس کھا کر اُسے بھی سو دو سو روپے نذرانہ دے دیا کرتے تھے۔ اس واقعہ کو بھی آج چار پانچ سال گزرنے کو آ رہے تھے کہ اچانک قسمت نے انہیں دوبارہ ملا دیا تھا۔

بشیر ماچھی کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ "گڑی سائیں" کے دربار پر اس نے اگلے روز جو منت مانگی تھی وہ پوری ہو گئی ہے اور اس کی قسمت کھلنے والی ہے ——!

اس بات کا بشیر ماچھی کو بخوبی علم تھا کہ اس حوالات کی حدود میں موجود کسی بھی شخص کو روایتی پولیس والا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ لوگ ایس پی سلیم باجوہ کی خصوصی دریافت تھے۔ اُس نے اپنا سارا سٹاف پولیس کے محکمے سے چن چن کر انتخاب کیا تھا اور اس حوالات کی حدود میں رشوت یا کرپشن کا تصور بھی محال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ کبھی کبھی تو اُسے شک ہونے لگتا کہ واقعی ان لوگوں کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ ہی سے ہے؟

اگر واقعی ایسا ہے تو ان لوگوں کی کایا پلٹ ہوگئی ہے۔

شام ڈھل رہی تھی اور حاجی کا غصے سے دماغ پھٹ رہا تھا کہ ابھی تک اس کی "سفارش" کیوں نہیں آئی۔

کیا اُس کے پروردہ تمام افسران مر گئے ہیں؟

اُس نے سوچا "اوہ" ہائے ہائے "کہتا حوالات کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ایس پی باجوہ نے اُسے ذہنی طور پر اذیت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور اُسے حوالات کے جس حصے میں رکھا گیا تھا وہاں کوئی اور ملزم بھی بند نہیں تھا جس سے حاجی بات کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا۔

شاید اُن لوگوں نے کوشش کی تھی کہ حاجی کسی بھی طرح باہر کوئی پیغام نہ بھیج سکے نہ ہی اس کے لیے یہاں کوئی مدد کو آسکے۔

جب قدرے ہوش آیا تو حاجی نے اطراف میں صورت احوال کا جائزہ لیا۔ شاید شام ہونے والی تھی کیونکہ حوالات کی سلاخوں سے اُسے سامنے کا میدان خالی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک میز کے گرد چند کرسیاں ہی پڑی تھیں۔

"حاجی صاحب سلام علیکم!"

اچانک ایک مہربان آواز نے اُسے چونکا دیا۔

حاجی نے گردن گھما کر دیکھا حوالات کے دروازے سے ایک سپاہی ہاتھ میں رائفل تھامے لگا کھڑا تھا۔

"کون ہو تم؟"

حاجی نے اُسے واقعی نہیں پہچانا تھا۔

"حاجی صاحب میں بشیر ہوں ____ انسپکٹر محمود شاہ والا ____ آپ کی خدمت کرتا رہا ہوں جی ____"

اُس نے بڑی ہی مسکینی صورت بنا کر کہا۔

حاجی کو اگر کچھ یاد بھی تھا تو تھوڑی دیر پہلے ہونے والی دھنائی اور بے عزتی کے احساس نے اُس کا ذہن ماؤف کر کے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ بہرحال وہ کوئی بھی تھا۔ اُسے اس سے کیا غرض۔ خدا جانے اُس کی زندگی میں کتنے ایسے انسپکٹر اور سپاہی آئے گئے تھے۔ اور اب وہ کہاں سے یاد کرتا پھرے کہ کمبخت بشیر کون ہے؟

لیکن ____

اس وقت تو اُسے اس سپاہی کی شکل میں تائیدِ غیبی میسر آگئی تھی۔

"اوہو ____ تم تو پھر اپنے بندے ہوئے ناں۔"

اُس نے اپنے دل پر جبر کر کے دانت نکالے۔

"حاجی صاحب ہم آپ کے نمک خوار ہیں۔ آپ کے غلام ہیں مجھے دکھ ہے کہ آپ جیسی بڑی ہستی کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہے۔ اس حوالدار کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ایس پی اگر اسے ڈانٹ دے، لوٹ کے تو یہ ملزم کی ہڈیاں توڑ دیتا ہے۔ درندہ ہے سالا درندہ۔ جانے اِدھر کہاں سے آگیا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

حاجی نے سرگوشی میں دریافت کیا۔

"بلبل شاہ ____"

بشیر باچھی نے جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاجی نے دل میں قسم کھائی کہ اس کا بھلے کچھ بچے یا نہ بچے وہ ایک مرتبہ حوالدار بلبل شاہ کو ضرور اس گستاخی کا مزہ چکھائے گا۔

"حاجی صاحب آپ مطمئن رہیں۔ میں اس قابل تو نہیں کہ حرام خوروں کے راستے کی دیوار بن سکوں لیکن میں آپ کی ہر ممکن خدمت کروں گا۔ آپ حکم کریں۔ حکم۔ میں جس قابل بھی ہوں بھلے میری نوکری داؤ پہ لگ جائے ضرور آپ کا حکم بجا لاؤں گا"

بشیر ماچھی کو امید تھی کہ جن حالات سے حاجی گزر رہا ہے ان میں اس کی معمولی مدد کا بھی غیر معمولی انعام مل سکتا تھا۔

"تم ایک نمبر یاد رکھ سکتے ہو ——"

حاجی نے کہا۔

"مائی باپ حکم کریں۔ میرے پاس پنسل بھی ہے اور سگریٹ کی ڈبی بھی۔ آپ پیغام لکھ دیں۔ میں صبح ضرور وہاں آپ کا حکم پہنچا دوں گا۔"

"شاباش —"

حاجی نے بے ساختہ اس کی عقلمندی کی داد دی۔

بشیر ماچھی نے اپنی پتلون کی جیب سے چھوٹی سی پنسل نکال کر حاجی صاحب کو تھما دی۔ یہ کس کے پرانے ہتھیار تھے جن کے ذریعے وہ اپنی حرام کی روزی کمایا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس چھوٹی سی پنسل اور سگریٹ کی خالی ڈبی کی اہمیت اس وقت کیا ہے؟

حاجی صاحب نے کپکپاتے ہاتھوں سے ٹیلی فون نمبر اور مختصر سا پیغام لکھ کر ڈبی اور پنسل اسے واپس کر دی۔

بشیر ماچھی نے پیغام کو پڑھے بغیر ڈبی اپنی جیب میں اسی طرح رکھ لی۔ اگر اسے علم ہو جاتا کہ یہ پیغام کس کے نام ہے تو شاید دہشت سے اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔

حاجی صاحب نے اپنے پرانے شاگرد اور دنیا کے بڑے سمگلروں میں سے ایک بابے شاہ کے نام کوئی پیغام لکھا تھا اور سپاہی بشیر ماچھی سے کہا تھا کہ وہ اس نمبر پر فون کر کے صرف یہ اطلاع دے کہ اس کے پاس شاہ صاحب کے لیے ایک پیغام ہے جہاں بھی وہ موجود ہو گا اس سے کوئی نہ کوئی خود پیغام لینے آئے گا اور بشیر کو بھی خوش کر دے گا۔

"حاجی صاحب —— کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا۔ اس بدقسمت ایس پی کو علم نہیں کہ آپ کی ہستی کیا ہے۔ میں آپ کو درد ختم کرنے کی گولیاں اور چائے بہرصورت تھوڑی دیر تک پہنچا دوں گا۔ اگر کسی نشہ پانی کی ضرورت ہو تو بھی حکم کریں۔ میں صبح تک ۔۔۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ اگر ممکن ہو تو چائے کا بندوبست کر دو۔ باقی میں دیکھ لوں گا اس ایس پی اور اس حوالدار کو —— اس شہر میں رہوں گا یا پھر یہ دونوں رہیں گے ——"

حاجی نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

"ذات کی کوڑھ کرلی اور شہتیر کو جپھے"

سپاہی بشیر ماچھی نے حاجی صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد واقعی حاجی صاحب تک چائے کا ایک گلاس اور دو گولیاں اسپرو پہنچا دی تھیں۔ حاجی صاحب عام حالات میں شاید اپنے کتے کے لیے بھی اس طرح کی مدارات پسند نہ کرتے جو بشیر ماچھی نے ان کے لیے کی تھی۔

لیکن ——

فی الوقت سوائے خاموشی کے خود کو حالات کے دھارے پر بہلاتے چلے جانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اندر کوئی چارہ نہیں تھا۔

انہیں حیرانگی ہو رہی تھی کہ ابھی تک ایس پی باجوہ نے اُس کی باقاعدہ تفتیش نہیں کی۔ پھر حاجی کو اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی مل گیا۔

"شاید مجھے میری بے بسی کا احساس دلانا چاہتا ہے ـــ تاکہ صبح جب وہ میرے سامنے آئے تو میں اُس کے لگائے ہوئے تمام الزامات تسلیم کرلوں۔"

"ہونہہ ـــ"

انھوں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے ہنڈی کے پر کیا نکل آئے دماغ ہی خراب ہو گیا۔

"دیکھ لوں گا میں تمہیں ـــ دیکھ لوں گا ـــ"

حاجی عالمِ وحشت میں بڑبڑاتا رہا۔

سپاہی بشیر ماچھی کی ڈیوٹی صبح سات بجے ختم ہوئی۔

ساڑھے سات بجے وہ حاجی صاحب کے فراہم کردہ نمبر پر رابطہ کر چکا تھا۔ اُس نے ٹیلی فون یہاں سے ڈیڑھ میل دُور ایک مارکیٹ میں جا کر کسی بیکری کی دُکان سے کیا تھا۔

دوسری طرف سے "ہیلو" کی آواز آنے پر اُس نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ اس کے پاس "شاہ صاحب" کے لیے "حاجی صاحب" کا ایک اہم پیغام ہے جو سی آئی اے کی حوالات میں بند ہیں۔

فون سننے والے نے اُسے چند سیکنڈ کے لیے ہولڈ کروایا۔ شاید وہ کسی سے مشورہ کر رہا تھا۔

"تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

بشیر ماچھی نے جگہ سمجھا دی۔

"ہم دس منٹ تک پہنچ رہے ہیں۔ اسی دُکان پر ٹھہرنا۔"

دوسری طرف سے کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

بشیر ماچھی نے آج سے پہلے سینکڑوں مرتبہ ملزمان کی اسی نوعیت کی خدمات انجام دی تھیں۔

لیکن ـــ

آج نجانے کیوں اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ گو کہ وہ حاجی صاحب والے تھانے میں اب نہیں رہا تھا۔ لیکن حاجی صاحب کی شہرت سے تو بخوبی آگاہ تھا۔ اُسے علم تھا کہ حاجی صاحب کی اس مُلک میں کیا اہمیت اور حیثیت ہے اور بلبل شاہ نے ایس پی کے حکم پر حاجی صاحب کو بے عزت کر کے اپنے لیے کون سی مشکلات کھڑی کر لی تھیں۔

اوّل تو حوالات کے کسی ملازم کے اس طرف آنے کے امکانات ہی نہ ہونے کے برابر تھے لیکن سپاہی بشیر ماچھی دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ کسی نے اُسے یہاں نہ دیکھا ہو۔

ایک ایک لمحہ اُس پر ایک ایک صدی کی طرح بھاری پڑ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے ایک نیلے رنگ کی نئے ماڈل کی گاڑی وہاں آ کر رُکی جس میں سے ایک سمارٹ سا نوجوان نکل کر باہر آیا۔

بشیر ماچھی تیزی سے اُس کی طرف لپکا۔

"بشیر تمہارا نام ہے؟"

نوجوان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ـــ سر جی ـــ میں نے ہی فون کیا تھا ـــ"

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشیر ماچھی نے بے شرمی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

نوجوان نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا اور کار کی طرف واپس گھوم گیا۔

"سر جی ـــــ مجھے آٹھ بجے رپورٹ کرنی ہے ـــــ"

اُس نے چاہا کہ جھوٹ بول کر یہیں جان چھڑا لے ـــــ اُسے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔

"کوئی بات نہیں ہم تمہیں آٹھ بجے سے پہلے تمہاری ڈیوٹی پر پہنچا دیں گے۔"

نوجوان نے رُک کر ایک چھپتی ہوئی نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور دوبارہ چل دیا۔

بشیر ماچھی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نوجوان نے جادو کر دیا ہو ـــــ وہ سحر زدہ معمول کی طرح مزید کچھ کہے اُس کے تعاقب میں چل دیا۔

نوجوان نے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اُسے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اندر بیٹھنے کے بعد بشیر ماچھی کو اپنے بدن سے جان نکلتی محسوس ہوئی کیونکہ کار کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ اس شہر کا نامی گرامی غنڈہ راجی بیٹھا تھا۔

"کیا حال ہے بشیر ٹھیک تو ہے ـــــ کہاں پہنچا دیا ہمارے حاجی صاحب کو۔"

راجی نے اُسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کیونکہ بشیر اس کی اسی نوعیت کی خدمات متعدد مرتبہ اس سے پہلے بھی انجام دے چکا تھا۔

"خیر ہے ملک جی ـــــ ہم تو جناب آپ کے غلام ہیں ـــــ تابعدار ہیں آپ کے ـــــ یہ نیا افسر آگیا ہے کم بخت نے ہماری تو جان عذاب میں ڈال رکھی ہے ـــــ"

اُس نے روایتی چمچہ گیری کا مظاہرہ کیا۔

اس درمیان میں وہ نوجوان بھی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ کار چل دی اور دوبارہ بشیر ماچھی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

"وہ ڈبی کہاں ہے ـــــ"

اُس نوجوان نے پوچھا۔

بشیر ماچھی نے اپنی قمیض کی جیب سے ڈبی نکال کر اُسے تھما دی۔

نوجوان نے کار میں بیٹھتے بیٹھتے اُس تحریر پر نظر دوڑائی اور اگلی سیٹ پر موجود راجی کو تھما دی۔

"ٹھیک ہے ـــــ"

راجی نے ڈبی پر لکھی تحریر پڑھ کر اُسے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اسے فارغ کر دو ـــــ بڑے کام کا آدمی ہے۔ اپنا پرانا یار ہے۔"

راجی نے پیچھے بیٹھے نوجوان سے کہا جس نے اپنا بٹوہ نکال کر اُس میں سے پانچ پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر بشیر کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"شکریہ سر جی ـــــ اللہ آپ کو خوش رکھے۔"

بشیر ماچھی نے بھکاریوں کی طرح نوٹ تھامتے ہوئے کہا۔

"بشیر یہ خیال رکھنا ممکن ہے ہمیں تمہاری ضرورت دوبارہ بھی پیش آئے۔"

راجی نے کہا۔

"ملک جی نوکر کیا اور نخرہ کیسا؟ جب آپ حکم دیں گے غلام حاضر ہے۔"

بشیر ماچھی کی باچھیں اتنی زیادہ رقم دیکھ کر خواہ مخواہ کھل گئی تھیں۔ اُس نے تو زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنے معمولی کام پر اُسے ہزار روپیہ انعام مل جائے گا۔ اگر یہ اتنے شاہ خرچ لوگ تھے تو وہ اُن کے لیے کنویں میں چھلانگ بھی لگا سکتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم یہاں اُتر جاؤ۔ رکشے میں بیٹھ کر چلے جانا۔"

راجی کے اشارے پر ڈرائیور نے ایک جگہ گاڑی روک دی۔

"بڑی مہربانی ملک صاحب ___ آپ کے بچے جئیں۔ مولا خوش رکھے۔"

بھکاریوں کی طرح ہاتھ باندھتا وہ کار سے نیچے اُتر گیا۔

○

بابے شاہ کے سامنے حاجی کا پیغام دھرا تھا اور خود وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"شاہ جی ___ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہم آپ کے نوکر ابھی زندہ ہیں۔"

راجی نے بالکل بٹیر باچھی کے سے انداز میں کہا۔

"راجی ___ حاجی صاحب میرے محسن ہیں۔ انہوں نے برے وقت میں میرا ساتھ دیا۔ یہ احسان فراموشی ہو گی اگر ہم نے اس مرحلے پر انہیں اکیلا چھوڑ دیا۔ حاجی صاحب مجھے کبھی زحمت نہیں دیا کرتے۔ معاملہ چونکہ سنگین ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھے یاد کیا ہے۔"

بابے شاہ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی ___ آپ مطمئن ہو جائیں۔ ہمارے پاس زرتاج بیگم جیسے ہتھیار ابھی موجود ہیں۔ یہ ایس پی۔ اس بے چارے کی اوقات ہی کیا ہے ___ آپ اطمینان سے دوسرے شہر تشریف لے جائیں۔ یہ معاملہ اگلے ۲۴ گھنٹوں میں ختم سمجھیے۔ اور ہاں مطمئن رہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ آج حاجی صاحب کا ریمانڈ کس طرح لیتا ہے ___"

راجی نے گردن پھلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ بات دل کو لگتی ہے۔ زرتاج بیگم کو میدان میں اتارو۔ ممکن ہے اس

کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل موجود ہو۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ ایس پی سلیم باجوہ حاجی صاحب کی تفتیش نہ کرنے پائے۔ میری ضرورت جب بھی ہو کھاجی والے نمبر پہ فون کر لینا۔"

بابے شاہ زرتاج بیگم کا نام سن کر قدرے مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

راجی نے بابے شاہ کو اس منصوبے سے آگاہ کر دیا جس پر وہ عمل کرنے جا رہا تھا۔ اور اب بابے شاہ کو یقین ہو چلا تھا کہ حاجی کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا ___!

اس روز جب سلیم باجوہ اپنے دفتر پہنچا تو شہر کے تین وکیلوں کو اس نے اپنا منتظر پایا۔

"خیریت ہے خان صاحب۔"

اُس نے ایک وکیل کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے جناب کہ آپ نے کل سے ایک معزز شہری کو حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اُسے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔"

خان صاحب خاصے گرم دکھائی دے رہے تھے۔

ایس پی باجوہ جانتا تھا کہ کن مکار بدمعاشوں سے اُس کا واسطہ ہے اُس نے خود کو ٹھنڈا رکھنے میں ہی عافیت جانی۔

"میں سمجھا نہیں آپ کس معزز شہری کی بات کر رہے ہیں ___ ظاہر ہے یہاں تھانے حوالات میں معزز اور شریف شہری ہی آئیں گے۔ غنڈے بدمعاش اور چور اُچکے تو آنے سے رہے۔"

باجوہ نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میری مراد حاجی حنیف سے ہے۔"

Scanned by Iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیرسٹر خان صاحب نے کہا۔

"اوہ — تو یوں فرمائیے ناں — لیکن آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے وہ یہاں کہاں ہیں؟"

ایس پی باجوہ نے حکمتِ عملی اختیار کی۔

"ایس پی صاحب — آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے — شہر کے درجنوں معززین اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ نے کل خود انہیں ایک اہم تقریب سے گرفتار کیا اور اپنے ساتھ لے کر آئے۔"

خان صاحب نے وکیلوں کا روائتی لہجہ اختیار کیا۔

"جناب میں نے کب اس بات سے انکار کیا ہے۔ یقیناً میں نے ہی انہیں گرفتار کیا تھا — لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ انہیں یہاں حبسِ بے جا میں رکھا گیا ہے — میں نے گرفتاری کے وقت وارنٹ گرفتاری بھی ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔"

ایس پی باجوہ کی مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔

"کمال کرتے ہیں آپ — آپ حاجی صاحب کو گرفتار کر کے لائے ہیں۔ آپ یہاں کے انچارج ہیں۔ اگر وہ یہاں نہیں تو کہاں ہیں؟"

خان صاحب اپنی دانست میں باجوہ پر رعب جھاڑ رہے تھے۔

"اس سوال کا جواب میں آپ کو دینے کا پابند نہیں۔"

باجوہ نے کمال بے اعتنائی سے کہا۔

"کیوں —؟ میں حاجی صاحب کا وکیل ہوں۔ آپ مجھے کیوں نہیں بتلاتے۔"

خان صاحب نے چڑ کر پوچھا۔

"یہ انتظامی معاملہ ہے — ملزم ایک خطرناک سمگلر ہے۔ اُس کے فرار کا خطرہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

ایس پی باجوہ نے اُن کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

خان صاحب کے تن بدن میں اس جواب نے آگ لگا دی۔

"آپ کس سے بات کر رہے ہیں۔ میں بار کا عہدہ دار ہوں۔ میں نے اس شہر میں چالیس سال سے اپنی عزت بنائی ہے۔ جھک نہیں ماری۔"

انہوں نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے خان صاحب آپ ایک معزز وکیل ہیں لیکن عین ممکن ہے کہ آپ کو ہلڈ پریشر کا عارضہ لاحق رہا ہو — اس لیے میری درخواست ہے کہ اپنی زبان اور دماغ قابو میں رکھیں۔ آپ قانون دان ہیں یہ تو بعد کی بات ہے کہ آپ میرا کیا بگاڑیں گے لیکن فی الوقت میں آپ کو ایک پولیس آفیسر کو دھمکیاں دینے کے جرم میں گرفتار کر سکتا ہوں۔"

ایس پی باجوہ نے پہلی مرتبہ ان کی طرف دیکھ کر بات کہی تھی۔

"میں تمہیں دیکھ لوں گا — آج ہی دیکھ لوں گا — تم جیسے کئی آئے اور گئے۔"

یہ کہتے ہوئے بیرسٹر خان صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ساتھیوں سمیت باہر نکل گئے۔

ایس پی باجوہ گہری سوچ میں ڈوبا دکھائی دے رہا تھا۔

اُس نے خان صاحب کے جاتے ہی گھنٹی کا بٹن دبایا۔

"یس سر" —

دروازے پر موجود گارڈ نے اندر آ کر ایڑیاں بجائیں۔

ون اردو ڈاٹ کام

Scanned by Iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"انسپکٹر عامر کو بھیجو۔"

انہوں نے حکم دیا اور اگلے ہی لمحے انسپکٹر عامر وہاں موجود تھا۔

"حاجی کو گاڑی میں بٹھاؤ ـــــ ہم اسی وقت اس کا ریمانڈ لینے جا رہے ہیں۔ ہری اپ۔ فوراً۔ ایک منٹ ضائع نہ ہو۔"

"یس سر۔"

انسپکٹر عامر نے ایڑیاں بجائیں۔

پانچ منٹ بعد پولیس کی ایک وین میں سادہ کپڑوں والے پولیس ملازمین کے ساتھ حاجی سمیت وہ لوگ عدالت کی طرف جا رہے تھے تاکہ ملزم کا ریمانڈ لے سکیں۔

○

فاخرہ کے لیے ایک ایک لمحہ قیامت ڈھا رہا تھا۔

اس درمیان متعدد مرتبہ اس کا جی چاہا کہ اس اذیت سے نجات پانے کے لیے خودکشی کر لے۔ اسے علم تھا کہ والد کے کمرے میں سرہانے والی دراز میں بھرا ہوا ریوالور موجود ہے۔

لیکن ـــــ

وہ مر نہیں سکتی تھی۔

زندہ درگور رہ کر زندگی گزارنا اس کا نصیب نہیں تھا۔ یہ کیفیت اس نے خود پر اپنے ہاتھوں طاری کی تھی۔

اب جو وہ بے بس کیچوے کی طرح سسک سسک کر جی رہی تھی تو اس کا سبب کوئی اور نہیں وہ خود تھی۔

بی ایس سی کے سیکنڈ ایئر میں اس کے والد کا تبادلہ اب اس بڑے شہر

ون اردو ڈاٹ کام

میں ہوا تھا جہاں بسنے اور تعلیم حاصل کرنے کے خواب اس نے بچپن میں اس وقت سے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے جب وہ پانچویں جماعت میں اس شہر سے نکلے تھے۔

تب اس کے والد ایس پی تھے۔ آج وہ ایس ایس پی بن کر واپس اسی شہر میں آئے تھے تو فاخرہ کو یوں لگا جیسے بچپن سے اب تک وہ جو دعائیں مانگتی آ رہی تھی وہ اچانک بارگاہِ ایزدی میں باریاب ہو گئی تھیں۔ اس نے دبی زبان سے کئی مرتبہ اپنی والدہ کے سامنے بڑے شہر کے ماڈرن گرلز کالج میں داخلے کی خواہش ظاہر کی تھی جہاں اس کی کزن پڑھتی تھیں۔ جو اس شہر میں رہتی تھیں۔

لیکن ـــــ

اپنی بہن کے مزاج آشنا ایس پی فیض صاحب نے اس کی اس خواہش کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ اس شہر میں ان کی بھی ایک بہن تھی جس کے ہاں رہ کر فاخرہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو سکتی تھی۔ اپنی بیٹی کو ہوسٹل میں داخل کروانے کا خطرہ وہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ کیونکہ پولیس ملازمت میں لمبا عرصہ گزارنے کے بعد بعض اداروں سے ان کا اعتماد قریباً اٹھ چکا تھا۔

اب جو قدرت نے انہیں اس شہر میں زندگی کے کچھ سال بسر کرنے کا موقع دیا تو انہوں نے اس شہر کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنانے کے لیے یہاں ایک پلاٹ خرید کر اس پر مکان کی تعمیر بھی شروع کر دی۔ اس شہر کی درسگاہوں میں کم از کم ان کے بچوں کو ڈھنگ کی تعلیم میسر آ سکتی تھی۔ چھوٹے شہروں میں تو یہ سہولت بھی حاصل نہیں تھی۔

فاخرہ نے بی ایس سی کے دوسرے سال میں داخلہ اس ماڈرن کالج میں لیا تھا۔ انگریزی ذریعہ تعلیم ہونے کے سبب یہاں کی بیشتر لڑکیوں کا تعلق اس کلاس کے لوگوں سے تھا۔ یہاں بالخصوص اس کی طرح اعلیٰ افسران کی بیٹیاں تعلیم حاصل

Scanned by Iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرسکتی تھیں یا پھر شہر کے امراء اور رؤسا کی صاحبزادیاں ____ جن کے درمیان تعلیم سے زیادہ تہذیب کے میدان میں مسابقت کی دوڑ لگی رہتی تھی۔ ہر نیا فیشن، ہر نیا ٹرینڈ اس شہر کو اسی کالج سے ملا کرتا تھا۔

مغرب کی جدید فضائیں عموماً اس کالج کی طالبات کو لاحق ہوا کرتی تھیں۔

فاخرہ بھی کوئی معمولی لڑکی نہیں رہی تھی۔

شہر کے ایس ایس پی کی صاحبزادی تھی۔ جلد ہی اس کی دوستی کالج میں اپنی ہم پلہ لڑکیوں سے ہو گئی اور چند روز میں پھر ان کے درمیان گاڑھی چھننے لگی۔

فاخرہ نے جس گروپ سے دوستی کی پینگیں بڑھائی تھیں، لڑکیوں کا وہی گروپ اس کالج کی "کریم" سمجھا جاتا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد ان بگڑی ہوئی رئیس زادیوں کی تھی جو کالج میں کھلے بندوں سگریٹ نوشی بھی کر لیا کرتی تھیں، اور خود کو ماڈرن اور مہذب ظاہر کرنے کے لیے پھر اس پر اپنی گردن بھی پھلائی رہتی تھیں۔

فاخرہ کو اس نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند دنوں ہی میں فاخرہ ان کے ساتھ اتنی زیادہ فری ہو گئی کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بھی ان کا آنا جانا شروع ہو گیا۔

شمع اسے سب سے زیادہ پسند تھی۔

جب وہ اپنی سہیلیوں کے سامنے بڑے فخر سے سگریٹ نوشی کرتی تو اس کی اس "جسارتِ رندانہ" پر سب سے زیادہ داد اسے فاخرہ کی طرف سے ہی ملتی تھی۔

پہلے پہلے تو مذاق ہی ہوتا ہے۔

لیکن ____

یہ مذاق فاخرہ کو بہت مہنگا پڑا۔

اس روز شمع نے اسے مذاق میں سگریٹ کی آفر کی تھی جو اس نے قبول کر لی اور دونوں کی دوستی اور گہری ہو گئی۔

شمع کی ممی تھیں تو دیسی، لیکن بہت سی ولایتی عورتیں اس کا حقہ بھرتی دکھائی دیتی تھیں۔ مسلسل سگریٹ نوشی سے ان کی دو انگلیوں کا تو رنگ ہی بدل چکا تھا۔

شمع نے اسے بتایا تھا کہ ممی نے زندگی کا زیادہ حصہ فارن میں گزارا ہے۔

پپا بھی فارن کا مال ہی لگتے تھے۔ ان کے منہ میں بھی مسلسل پائپ دبا رہتا تھا۔

شمع والدین کا بڑا احترام کرتی تھی جس کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے پپا کے سامنے سگریٹ نہیں پیتی تھی۔ البتہ اپنی ممی سے وہ خاصی فری تھی۔ اس لیے ماں کے سامنے کوئی شرم نہیں کرتی تھی۔

"ممی اور میں تو سہیلیوں کی طرح رہتی ہیں۔ میں تو سگریٹ بھی اسی برانڈ کے پیتی ہوں بلکہ ممی کے ہی چوری کر لیتی ہوں ____ بھئی آپ ایسی ریجڈ سوسائٹی میں کم از کم میں تو بازار سے جا کر سگریٹ خریدنے کا رسک نہیں لے سکتی ناں!"

شمع نے اپنی ممی سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے سویٹی ____ تمہارے باپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو یہاں اس ملک میں جھک مار رہا ہے ____ وہاں سٹیٹس میں کیا نہیں ہے ہمارے لیے ____ غضب خدا کا ____ بندہ ڈھنگ کی زندگی ہی نہیں جی سکتا۔ میں تو کہتی ہوں یہاں کے لوگ مر کیوں نہیں جاتے ____ بے شرم کہیں کے ____"

شمع کی ممی کے جو منہ میں آتا بکتی چلی جاتیں۔

فاخرہ کو آنٹی بہت پسند آئی تھی

ان کا مزاج بالکل ایسا ہی تھا جیسا کسی عورت کے متعلق فاخرہ سوچا کرتی تھی۔ اس کی اپنی ماں تو بے چاری سیدھی سادی عورت تھی اور اس کی یہی بات فاخرہ کو پسند نہیں آئی تھی۔ جبکہ اس کی آنٹی جو اس شہر میں رہتی تھیں، صرف اس لیے اس کی فیورٹ تھیں کہ وہ ماڈرن خاتون تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"امی آپ زمانے کے ساتھ مل کر نہیں چل سکتیں۔"

اُس نے کئی دفعہ اپنی ماں سے کہا تھا۔

"بیٹی ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ زمانہ تو گمراہی کی طرف تیزی سے جا رہا ہے۔ ہم اس طرف نہیں جا سکتے۔"

اُس کی ماں جواب دیتی اور اُس کے جواب سے فاخرہ کو اُلجھن ہونے لگتی ——

"امی کیا یہ لوگ گدھے ہیں جو۔۔۔"

"ہاں"

اُس کی ماں اُس کی بات کاٹ دیتی۔

اپنی دانست میں اس طرح اس نے اپنی بیٹی کو ڈسپلن میں رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔

لیکن ——

وہ بے چاری کبھی نہ جان سکی کہ اس نے تو چڑیا کو زبردستی پنجرے میں بند کر رکھا ہے۔ اس کی بیٹی تو اپنی شہر والی آنٹی اور کزن کی طرح اپنے پر پھیلا کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جانا چاہتی تھی اور اب جو اُسے اپنے ہم خیال ملے تو گویا بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

شمع کی شکل میں اُسے بہترین دوست اور اُس کی ماں کی شکل میں بہترین آنٹی مل گئی تھی۔ وہ دوسرے تیسرے دن شمع کے گھر کا ایک چکر ضرور لگا لیا کرتی تھی۔ اس ضمن میں اُسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اگر ابو کا ڈرائیور نہ ملتا تو شمع اپنی گاڑی اسے لینے کے لیے بھیج دیتی۔

اُس کی بے چاری سیدھی سادی ماں کے تو وہم و گمان میں بھی اپنی بیٹی

کے لچھن نہیں آ سکتے تھے۔ شمع نے اُن سے پہلی ملاقات ہی میں ایسے خلوص کا مظاہرہ کیا تھا کہ فاخرہ کی امی اس کے لیے اپنے دل میں بالکل اپنی بیٹی کے سے جذبات محسوس کرنے لگی تھی۔ انہوں نے اس درمیان کئی دفعہ اُسے اپنی امی کو گھر لانے کی دعوت بھی دے ڈالی تھی۔

فاخرہ کی ماں کو علم تھا کہ اُس کی بیٹی شمع کے گھر بھی جاتی ہے۔

جب کبھی وہ اس طرح بار بار کسی کے گھر جانے کا نوٹس لیتیں تو فاخرہ کا ایک ہی جواب ہوتا۔

"امی بی ایس سی کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ ہم اکٹھی تیاری کرتی ہیں۔ ابو کی افسری اپنی جگہ لیکن ان کی تنخواہ سے آپ میرے لیے ٹیوٹر تو رکھ نہیں سکتیں۔ نہ ہی کبھی انہیں اپنی بیٹی کا خیال آئے گا۔"

وہ جلے بھنے لہجے میں کہتی۔

"بیٹی! —— تم بڑی ہو گئی ہو۔ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ تمہارے چھوٹے بہن بھائیوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ اپنی زبان کو لگام دو۔"

ماں اُسے پیار سے ڈانٹ دیتیں۔

فاخرہ کی ہر ممکن کوشش یہی ہوتی کہ اس کی والدہ کہیں ناراض نہ ہو جائے کیونکہ اس ناراضگی کی قیمت وہ نہیں چکا سکتی تھی۔ وہ اپنی امی کو خوش رکھ کر ہی اپنی سہیلی کے گھر آسانی سے آ جا سکتی تھی۔

پہلے پہل تو یہ معاملہ دوستی اور آزاد خیالی تک محدود تھا۔

لیکن ——

اب شمع کے ہاں جانا اس کے لیے ناگزیر ہوتا جا رہا تھا —— اور اس کی وجہ تھی وہ سگریٹ جو وہ گزشتہ ایک مہینے سے روزانہ پی رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ سگریٹ اُسے شمع نے معمول کے مطابق ہی پلایا تھا۔ پہلے پہل تو اُسے سگریٹ کا ذائقہ عجیب سا لگا لیکن دو تین کش لگانے کے بعد ہی اُسے اپنا بدن ہوا میں تحلیل ہوتا محسوس ہونے لگا تو وہ ذائقے کو بھول گئی۔

"کیا ہے اس میں ـــــ؟"

اس نے بڑی بوجھل سی آواز میں پوچھا۔

"ارے کچھ نہیں میری جان ـــــ بس انجوائے کرو ـــــ لائف انجوائے کرو دکھوں سے بھری اس دنیا میں خوشی کے چند لمحات غنیمت ہیں۔" شمع نے جو خود بھی ایسا ہی سگریٹ پی رہی تھی اس کے زانوں پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اس روز پہلی مرتبہ فاخرہ کو کچھ عجیب سا لگا۔ ایک دو چکر بھی آئے۔

لیکن ـــــ

اُسے ایک عجیب سی خماری کا احساس ہوا۔

اس روز شمع خود کار ڈرائیو کر کے اُسے گھر چھوڑنے آئی۔ آج چونکہ اُسے شمع کے گھر معمول سے زیادہ دیر ہو گئی تھی اس لیے شمع خود اس کے ساتھ آئی تھی تاکہ اُسے اپنی امی کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچا سکے لیکن گھر پہ امی موجود نہیں تھیں۔ وہ کسی کے ہاں تعزیت کو گئی ہوئی تھیں۔ اور ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

فاخرہ کو ابھی تک خماری چڑھی ہوئی تھی۔ شمع نے بھی اسے مشورہ دیا تھا کہ سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ جائے اور کسی پہ کچھ ظاہر نہ ہونے دے۔

اور اُس نے ایسا ہی کیا۔

شام دیر گئے تک وہ اپنے کمرے میں بند رہی۔

شام کے بعد اس کی والدہ کی واپسی ہوئی تو فاخرہ بھی نارمل ہو چکی تھی۔

اُس کی بے چاری ماں یہی سمجھ رہی تھی کہ بیٹی کو شہر میں آ کر الائچی چبانے کی عادت پڑ گئی ہے۔

لیکن ـــــ

اصل میں یہ نسخہ اُسے شمع نے ہی بتایا تھا۔

* * *

فاخرہ کو اس کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد شمع اپنے گھر کے بجائے اپنی ہی آبادی کے ایک دوسرے بنگلے میں گئی تھی۔

اس کی شکل پہ نظر پڑتے ہی بنگلے کے دروازے پہ موجود چوکیدار نے دروازہ کھول دیا اور وہ گاڑی چلاتی پورچ تک لے آئی۔

سامنے برآمدے میں ایک آرام دہ کرسی پہ اچھی خاصی لیپا پوتی کیے ایک ڈھلتی عمر کی خاتون کسی سے کارڈلیس ٹیلیفون پہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی ـــــ

اس کی کسی نہ کسی ادا سے یہ ضرور علم ہو جاتا تھا کہ وہ اپنی عمر سے کم نظر آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کار میں موجود شمع پہ نظر پڑتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"اچھا ایک چڑیا آئی ہے۔ ابھی دوبارہ بات کروں گی۔"

اُس نے فون پہ گفتگو بند کرنے کے لیے دوسری طرف کہا اور فون رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

اپنی دانست میں وہ شمع کو "ویل کم" کہتے جا رہی تھی۔

اپنے منحوس چہرے پہ اُس نے کاروباری مسکراہٹ سجائی اور "ہائے میری جان شمع" کا نعرہ بلند کرتی دونوں بانہیں پھیلا کر کار کا دروازہ بند کرتی شمع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرف چل دی۔

"ہیلو آنٹی ——"

شمع نے دروازہ بند کر کے اس کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے دونوں آپس میں بغل گیر ہو رہی تھیں۔

یہ شاکرہ بیگم تھی۔

شمع جیسی درجنوں بگڑی ہوئی امیر زادیوں کی دوستوں جیسی آنٹی۔ جس کے دروازے اپنی ان بھانجیوں کے لیے اس وقت تک کھلے رہتے تھے جب تک وہ اُس کے اشاروں پر بندریوں کی طرح ناچتی رہیں۔ جب اُسے احساس ہوتا کہ اب اس بندریا میں دم خم نہیں رہا تو اس کے گھر کا دروازہ "بھانجی" پر بند ہو جاتا۔

"کیسی ہو میری جان —— اتنے دن کے بعد؟"

شاکرہ بیگم نے جنس زدہ عورتوں کی طرح اُس کے گالوں کے بوسے لیتے ہوئے پوچھا۔

"ارے آنٹی —— میں نے کہا پہلے کوئی معرکہ تو مار لیں۔ اب اس طرح منہ اُٹھا کر چلے آنا کوئی اچھی بات نہیں تھی ناں —— آج اُس ایس ایس پی کی بیٹی کو پٹا کر آئی ہوں۔"

اُس نے آنٹی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ بھئی واہ —— ویل ڈن —— دل خوش کر دیا تُو نے یہ خبر سُنا کر ——"

آنٹی نے دوبارہ اس کے گالوں پر اپنے پوپلے منہ کو رگڑنا شروع کر دیا۔

شاکرہ بیگم نے شمع کو چھ سات ماہ پہلے اپنے جال میں پھانسا تھا۔ اک کیس

پر اُسے کچھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی کیونکہ شمع پہلے ہی اپنی ماں کے ماڈرن ازم کی ڈسی ہوئی تھی اور اُس کا لڑکپن بھی سٹیٹس میں گزر رہا تھا۔

اُسے ہیروئن کا نشہ شاکرہ بیگم نے چند ماہ پہلے ہی لگایا تھا۔ اور اب اُس سٹیج پر آ چلی تھی کہ شمع کی جمع پونجی تھوڑی تھوڑی کر کے ختم ہونے لگی تھی۔

آج تک وہ اپنی ماں کے سگریٹ ہی چوری کر کے پیتی آئی تھی۔

لیکن ——

اب اس نے باپ کی جیب سے پیسے بھی چوری چھپے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ البتہ ہر دفعہ جب بھی اُس نے یہ حرکت کی یہ خوف اُسے ضرور دامنگیر رہا کہ اگر کبھی اُس کی اِس حرکت کا علم گھر والوں کو ہو گیا تو شاید وہ اُن کا سامنا نہ کر پائے کیونکہ شمع کے ذاتی جیب خرچ کے لیے پہلے ہی سے کچھ کمی نہیں تھی۔

وہ بگڑی ہوئی ماں کی واحد اولاد تھی۔

اس کی ماں نے جس شخص سے شادی کی تھی وہ پہلے ہی اُس جیسی ایک زندہ اور ایک مُردہ عورت کا خاوند تھا۔

لیکن ——

اپنی بے پناہ دولت کے بل بوتے پر وہ اپنے لیے ایسی مزید درجنوں بیویوں کا اہتمام کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود اُس نے نائلہ سے شادی کے بعد کوئی باقاعدہ شادی نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو نائلہ کی طرف سے اس کے دل و دماغ پر اچانک چھا جانا ہی رہی تھی لیکن دوسری بات یہ بھی تھی کہ اب نائلہ نے اسے اِس قابل چھوڑا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی عورت کو باقاعدہ منکوحہ بنا سکے۔

اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس نے ایسی کوئی حرکت کی تو غیر ملکی شہرت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی حامل نائلہ مختار اُس کی ہڈیاں چبا جائے گی۔

اس رئیس زادے کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت تو نہیں تھا کہ شمع اُس کی بیٹی ہے لیکن اُس نے نائلہ کے کہنے پر یہ بات بھی مان لی تھی۔ نائلہ امریکہ میں ہی رہتی تھی جہاں اپنے بزنس کے ضمن میں اُس کے خاوند کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

اُس نے بھی نائلہ بیگم پر کبھی پاکستان جا کر آباد ہونے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ البتہ نائلہ بیگم خود اب ایک عرصے سے پاکستان جا بسنے پر سنجیدگی سے غور کرنے لگی تھی اُس کا سبب تھا اس کے خاوند کی بے انتہا دولت۔ آخر وہ کسی اور کو اس پر قبضہ کیوں کرنے دے۔

نجانے کیوں اُسے ہر وقت اس بات کی اُمید رہتی تھی کہ یہ امیر زادہ جس زیادتی سے شراب اور شباب کا رسیا ہے کسی روز اچانک ضرور اس کا ہارٹ فیل ہوگا اور یہ مر جائے گا جس کے بعد پھر سب کچھ اُس کا تو تھا۔

ایک روز اس کے خاوند کو ہارٹ اٹیک بھی ہو گیا جس کے بعد سے تو نائلہ مختار کے لیے امریکہ میں ایک ایک پل ایک ایک صدی پر محیط ہونے لگا تھا۔ بالآخر وہ پاکستان آ ہی گئی۔

شمع کی اپنے والد سے ہفتے میں ایک دو مرتبہ کھانے کی میز پر ہی ہیلو ہیلو ہو جاتی تھی اور وہ "ہائے بے بی" اور شمع "ہائے پپا" کہہ کر ایک دوسرے کا فرض اتار دیا کرتے تھے۔

شاکرہ بیگم کا آنا جانا اپنے شکار کی تلاش میں اُس کے کالج میں لگا رہتا تھا اور اُس نے پہلی ہی نظر میں اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ یہ چڑیا جلد اس کے پنجرے میں بند ہونے والی ہے۔

ایسا ہی ہوا؟

دو تین مرتبہ شاکرہ بیگم نے اُسے "ٹریٹ" دیا اور شہد لگا کر اپنی انگلی سے چپکا لیا۔

پہلے پہل تو مخلوط محافل کا چسکا اُسے لگایا۔ اُس کی کبھی کبھی سگریٹ پینے کی عادت کو مستقل کیا اور بالآخر ایک روز اُسے ہیروئن کے چسکے پر بھی لگا دیا۔

"آنٹی اس پر تو بہت رقم اُٹھتی ہے ——"

اس نے چند روز پہلے ہی کہا تھا۔

"ارے میری جان کیوں خرچ کرتے ہو پیسے —— یہ دُنیا اُلّو کے پٹھے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ کسی کو بھی بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔ وہ کیا نام ہے اس کا وہ تمہارا بوائے فرینڈ آصف۔ وہ کس دن کام آئے گا —— بڑا امیر آدمی ہے ——"

شاکرہ بیگم نے اُس کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آنٹی وہ تو بہت "ایگریسو" ہو جاتا ہے —— مہینے میں ایک دو مرتبہ تو ٹھیک ہے لیکن دوسرے تیسرے روز تو میں افورڈ نہیں کر سکتی ناں۔"

اُس نے شرماتے ہوئے آنٹی کو بتایا۔

"ایک اور بڑا سستا طریقہ ہے۔ تمہارا کام بھی چلتا رہے گا اور ہمارا بھی۔"

شاکرہ بیگم نے جب دیکھا کہ لوہا گرم ہے تو چوٹ کر دی۔

"وہ کیا ——؟"

"وہ جو تمہاری سہیلی ہے ناں —— وہ کیا نام ہے اس کا ——"

شاکرہ بیگم نے جان بوجھ کر بے نیازی کے انداز میں سوچتے ہوئے کہا۔

"فاخرہ ——"

شمع نے بے چینی سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں ہاں وہی، وہ پولیس آفیسر کی بیٹی ـــــ وہ کس دن کام آئے گی۔"
شاکرہ بیگم نے اُس کے بازو پہ آہستگی سے ہاتھ رکھ دیا۔
"کیا کرنا ہے اُس کا ـــــ وہ تو نری پینڈو ہے۔ ایک دم پینڈو۔"
شمع نے جواب دیا۔
"یہی تو بات ہے۔ اسی لیے تو مَیں نے اُس کا نام لیا ہے ـــ اُسے تسکار کر دو ـــ اپنی لائن پر لگا لو ـــ اور اپنے اور اُس کے حصے کا سگریٹ مفت لیتی جاؤ ـــ"
شاکرہ بیگم نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔
"ارے واہ ـــ یہ تو کوئی بات ہی نہیں بس سمجھیں ہو گیا آپ کا کام۔"
شمع نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
"میرا کام ـــ؟ ارے تمہارا کام بھی ـــ میرا اس سے کیا تعلق ـــ اس سے تو تمہاری مشکلات ختم ہوں گی۔"
شاکرہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا اور شمع بھی اُس کی تقلید میں بے وقوفوں کی طرح دانت نکالتی رہی۔
شمع کو شاکرہ نے جس طرح اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کے بعد یوں تو وہ حکماً بھی اُس سے سب کچھ کروا سکتی تھی۔
لیکن ـــ
اس کی خوبی یہی تھی کہ اپنے شکار کو کبھی قیدی اور خود کو صیاد ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔
اس کا قیدی خود کو آزاد سمجھتے ہوئے بھی اُس کا قیدی ہوتا تھا۔ یہ الگ بات کہ شاکرہ بیگم اُس سے کوئی بھی کام ڈانٹ کر نہیں محبت سے لینے کی

قائل تھی۔
اُس نے شمع کو دس بھرے ہوئے سگریٹ بطور انعام بھی دیے تھے۔ اور وعدہ کیا تھا کہ اگلے ایک ماہ تک وہ اُسے مفت سگریٹ دیتی رہے گی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ فاخرہ ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔
شمع کی روانگی کے بعد اُس نے ـــــ ایک نمبر ملایا تھا۔ دوسری طرف سے "ہیلو" کی آواز آنے پر اُس نے اپنا تعارف کروایا۔
"شاہ جی سے عرض کر دیں کہ بندی نے اُن کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اور پولیس افسر کی بیٹی کا کام ہو چکا ہے۔"
شاکرہ بیگم نے جوشِ مسرت سے بے قابو ہوتے ہوئے دوسری طرف پیغام دیا تھا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے بابے شاہ نے بذاتِ خود کسی کام کا حکم دیا تھا۔ عام حالات میں تو وہ کسی سے ملنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس نے چند روز پہلے ہی شاکرہ بیگم سے کسی محفل میں علیحدگی میں گفتگو کرتے ہوئے شہر کے نئے ایس ایس پی کا تعارف کرواتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ اس کی بیٹی کو گمراہ کر کے اپنے قابو میں کر لے تاکہ وقتِ ضرورت اس "کارڈ" کو بطورِ ترپ استعمال کیا جا سکے۔

○

فاخرہ کو اپنی بدقسمتی کا احساس اُس وقت ہوا جب سب کچھ اُس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔
پندرہ بیس روز شمع نے اُسے مسلسل اس زہر پر لگائے رکھا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے قطرہ قطرہ زہر فاخرہ کی رگوں میں اتارتی رہی۔
ایک روز جب فاخرہ نے حسبِ معمول اُس سے سگریٹ مانگا تو شمع نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انکار کر دیا۔

"کر کر کیا مطلب ہے تمہارا شمع تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"مطلب صاف ہے فاخرہ! میرے پاس اب پیسے نہیں ہوتے ہیں تو کہانے اپنی ضرورتیں کیسے پوری کرتی ہوں۔ میں تمہیں روز روز کہاں سے سگریٹ لا کر دوں ــــ"

شمع نے بڑی بے رخی سے جواب دیا۔

شمع تم جانتی ہو یہ میرے لیے ناممکن ہے۔ مجھے تم نے ہی اس لائن پر لگایا ہے۔ اب تم ہی مجھے لا کر دو۔ میں تو مر جاؤں گی۔"

فاخرہ نے غصے اور بے بسی کے ملے جلے احساس سے کہا۔

"زیادہ مت چلاؤ ــــ تم کوئی دودھ پیتی بچی نہیں تھی کہ میں نے تمہارے منہ سے فیڈر لگا دیا۔ تمہیں علم تھا کہ تم ہیروئن پی رہی ہو اور تم اپنی مرضی سے پیتی رہی ہو۔ سمجھی تم ــــ اور مجھ پر یہ پولیس والی دھونس جمانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ یاد رکھنا تمہارے باپ تک تمہارے سارے کرتوت پہنچا دوں گی۔"

شمع نے دھمکی کے انداز میں کہا۔

اس کا یہ انداز فاخرہ کے لیے اتنا چونکا دینے والا، حیران کن اور اذیت ناک تھا کہ وہ چکرا کر رہ گئی۔

وہ شمع کی منت سماجت پر اتر آئی تھی کہ جیسے بھی ممکن ہے اسے ایک سگریٹ ہی لا دے۔

"میں تمہیں اس شخص سے ملا دیتی ہوں جس سے تمہیں یہ سگریٹ قیمتاً ملتا رہے گا۔ اگر اسے خوش کر سکو تو پھر شاید مفت بھی ــــ"

شمع نے بالآخر کام کی بات کہہ دی۔

"کون ہے وہ؟"

فاخرہ نے بے بسی سے پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ ــــ"

یہ کہتے ہوئے وہ بدحال فاخرہ کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر شاکرہ بیگم کے پاس لے آئی۔

فاخرہ کی شاکرہ بیگم کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی۔

پہلی ملاقات پر اس نے پانچ سگریٹ فاخرہ کو مفت دیے تھے اور وہیں اس کی دوستی تنویر سے کرا دی تھی جس سے اسے ساری زندگی سگریٹ مفت مل سکتے تھے۔

تنویر نے دو تین ملاقاتوں کے بعد ہی اپنی اصلیت دکھا دی۔

لیکن ــــ

اب فاخرہ کے لیے ان باتوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کی عزت نفس تو اس روز دم توڑ گئی تھی جس روز اس نے یہ نشہ شروع کیا تھا۔

بڑے باپ کی چھوٹی بیٹی بن کر رہ گئی تھی وہ۔

شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے والے ایس ایس پی کے گھر میں نقب لگی اور اسے علم نہ ہو سکا۔

زندگی اتنی مصروف تھی کہ شہر کی عزت کے رکھوالے کو اپنے گھر کی خبر رکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔

اور اس کی والدہ ــــ

بے چاری سیدھی سادی دیہاتن۔ دس جماعتیں پاس مذہبی گھرانے کی عورت۔ جن کے آباؤ اجداد میں بھی کسی سے یہ جرم سرزد نہ ہوا ہو گا جو اس کی بیٹی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو گیا تھا۔

اب فاخرہ کا آنا جانا شمع کے ہاں نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

شمع کی دلچسپی بھی اب اس میں ختم ہو گئی تھی۔ وہ بھی اب فاخرہ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی۔

اُس نے اپنے حصے کا کام شاکرہ بیگم کے حکم پر کر دیا تھا۔ سیدھی سادی لڑکی کو انگلی پکڑ کر سیدھا راستہ دکھانے کے بجائے گمراہی کے راستے پر ڈال دیا تھا۔

اور اب شاکرہ بیگم کے حکم پر مفت سگریٹ حاصل کرنے کے لیے ایسا ہی کوئی اور شکار کھیلنا تھا جس کے بعد ہی وہ اپنا نشہ پورا کر سکتی تھی۔

تشویش اور علاج

اُس روز جب صبح سے شام تک فاخرہ کمرے سے باہر نہ نکلی تو اُس کی والدہ کو تشویش لاحق ہوئی۔

”کیا بات ہے ___ تمہارے بیلے دل نہیں چڑھا ابھی ___“

اُس نے فاخرہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”امی میرا سر درد ہو رہا ہے ___ شاید بخار بھی ہے ___“

اُس نے حسبِ معمول رٹا رٹایا فقرہ دہرایا۔

”کیا بات ہے بیٹی ___ تمہیں اکثر بخار اور سر درد رہنے لگا ہے۔ ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتی ___ چلو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“

خاتون کو تشویش لاحق ہوئی۔

”نہیں امی ___ نہیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں بس میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ایسا ہو جاتا ہے ___“

ڈاکٹر کے نام سے وہ اکثر گھبرا جاتی تھی۔

لیکن ___

آج اس کی والدہ نے شاید ڈاکٹر کو دکھانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اُسے اپنی بیٹی کا بار بار ڈاکٹر کے پاس جانے سے انکار کھٹکنے لگا تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچھا ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی ــــ آؤ چلائے پی لو ــــ"

یہ کہتی ہوئی بیگم صاحبہ باہر چلی گئیں، کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے اپنی ایک دوست لیڈی ڈاکٹر کو جن کا تبادلہ ان کی طرح حال ہی میں اس شہر میں ہوا تھا، فون کر کے گھر آنے کی دعوت دی اور اپنے ڈرائیور کو ڈاکٹر نسرین کو لینے کے لیے بھی بھیج دیا۔

ڈاکٹر نسرین کا استقبال بیگم صاحبہ نے خود گھر کے دروازے پر کیا تھا پھر اُسے ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئیں۔ ابھی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کی آمد کا علم فاخرہ کو ہو۔ وہ فاخرہ کو بھی یہ تاثر دینا چاہتی تھیں کہ ڈاکٹر نسرین بن بلائے مہمان کی طرح گھر آئی ہے۔

فاخرہ کو علم تھا کہ ڈاکٹر نسرین اس کی والدہ کی سہیلی ہے اور دونوں نے بچپن ہی نہیں جوانی کا بہت سا حصہ بھی اکٹھے گزارا ہے ــــ اتفاق سے ڈاکٹر نسرین کا تبادلہ وہ اپنے ساتھ ہی کروالیا کرتے تھے جس کا خاوند شادی کے تین چار سال بعد ہی ایک حادثے میں اللہ کو پیارا ہوگیا تھا اور وہ اب اپنے دو بچوں کے ساتھ جو اس شہر کے کالجوں میں زیرِ تعلیم تھے زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بچوں کی خاطر دوبارہ شادی نہیں کی تھی۔

بیگم صاحبہ کے اس طرح اچانک فون کرنے اور گاڑی بھیج کر بلانے پر ڈاکٹر نسرین کی چھٹی حس نے پہلے ہی دال میں کچھ کالا ہونے کا سگنل دے دیا تھا۔

لیکن ــــ

اس شبے کی تصدیق تب ہوئی جب ڈاکٹر نسرین کو بیگم صاحبہ نے اپنی بیٹی کی "پُراسرار حرکات" اور گھر والوں کی نظروں سے اکثر سر درد یا بخار کا بہانہ کر کے غائب رہنے کی بات بتائی۔

"حیرت کی بات تو یہ ہے نسرین کہ وہ ڈاکٹر کے نام سے گھبرا جاتی ہے۔ اللہ خیر کرے میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

"تم بے فکر رہو ــــ خدا خیر کرے گا۔ کچھ نہیں ہوا۔ آج کل کی ماڈرن لڑکیاں زیادہ تر خوابوں خیالوں میں رہنا ہی پسند کرتی ہیں۔ مجھ سے کیا گھبرائے گی وہ۔ میری بیٹی ہے۔ میرے ہاتھوں میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے۔ میں خود دیکھ لوں گی۔"

ڈاکٹر نسرین نے بیگم صاحبہ کی تسلی کروانی چاہی۔

"نسرین دیکھنا جوان اولاد ہے۔ اُسے شک نہ ہونے دینا۔"

بیگم صاحبہ نے پھر تسلی چاہی۔

"تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو ــــ آؤ میرے ساتھ ــــ"

دونوں فاخرہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں ــــ!

فاخرہ دوبارہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹی ہی تھی جب اچانک یہ بلا اس پر نازل ہوئی۔

"کیا حال ہے بیٹی ــــ سُنا ہے کچھ بیمار وغیرہ رہنے لگی ہو۔ میں تو ادھر سے گزر رہی تھی۔ دل چاہا تمہاری ماں سے ملتی جاؤں۔ کمال ہے بھئی ــــ تم نے تو گھر کی مرغی کو دال برابر بھی نہیں جانا۔ کم از کم ایک فون ہی کر دیتی۔ گھر کا ڈاکٹر ہو اور تم بیمار ہو۔ یہ کیا بات ہوئی۔"

ڈاکٹر نسرین نے بے تکلفی سے اُس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے یہ تاثر دیا کہ جیسے واقعی وہ اچانک ہی اس طرف آ نکلی ہو۔ اسے یہ علم ہوا ہے کہ فاخرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو وہ اس کی تیمارداری کو چلی آئی ہے۔

"کچھ نہیں آنٹی ــــ کچھ نہیں ہوا ــــ امی کو تو بس میری ہی فکر لگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہتی ہے۔"

فاخرہ نے چڑ کر کہا تھا۔

"میں تمہارے جانے کا بندوبست کرتی ہوں۔ تم فاخرہ سے گپ شپ لگاؤ ——"

نسرین کی ہدایت کے مطابق اُس کی والدہ بہانہ کر کے وہاں سے چلی گئی۔

"دیکھو بیٹی تمہیں کچھ ہُوا ہے یا نہیں ہُوا۔ اس کا فیصلہ تو بہر حال میں کر دوں گی کیونکہ ڈاکٹر تم نہیں ہو۔ میں ہوں اور میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہو گا کہ اپنے گھر والوں کی صحت کا بھی خیال نہ رکھ سکی۔"

یہ کہتے ہوئے نسرین نے "ناں ناں" کرتی فاخرہ کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ پیشہ ور ڈاکٹر تھی۔

جس جنرل ہسپتال میں وہ سرکاری ملازمت کر رہی تھی وہ اُس شہر کا سب سے بڑا ہسپتال تھا جہاں روزانہ درجنوں مریض اُسے دیکھنے پڑتے تھے۔

اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ سے اُس نے اسٹیتھ سکوپ نکال کر اُس کے جسم پر چند جگہ رکھنے کے بعد میں جو رائے قائم کی تھی اور اُس کے علم نے فاخرہ سے متعلق جس بیماری کی نشاندہی کی تھی اُس کے تصور ہی نے ڈاکٹر نسرین کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔

"اگر اُس کی بے چاری ماں کو علم ہو گیا تو۔۔۔۔"

یہ سوچ کر اُس کو اپنے بدن سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

اُس نے چند منٹ ہی میں فاخرہ کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا اور اب خاصی پریشان ہو گئی تھی۔

"فاخرہ دیکھو بیٹی۔ اس وقت میں تمہاری ماں کی ہی نہیں تمہاری بھی دوست

ہوں —— خدا کا شکر کرو کہ میں اچانک اس طرف آ گئی تھی۔ تم ایک ذمہ دار پولیس آفیسر کی بیٹی ہو۔ آخر وہ لوگ کب تک تمہاری حرکات کو نظر انداز کرتے بالآخر کسی نہ کسی ڈاکٹر نے آ کر تمہیں چیک کرنا تھا اور جو بات میرے علم میں آئی ہے اگر اُس کے علم میں آ جاتی تو ——"

انہوں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر فاخرہ کے مرجھائے ہوئے چہرے پر نظریں جما دیں جہاں ایک رنگ آ رہا تو دوسرا جا رہا تھا۔

"کیا —— کیا بات ہے آنٹی —— کیا ہوا ہے مجھے۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا —— کچھ نہیں ہُوا ——"

فاخرہ کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی تھی۔

"دیکھو بیٹی —— آخر اس بات پر کب تک تم پردہ ڈال سکتی تھی۔ ایک نہ ایک دن تو تمہارے والدین کو علم ہونا ہی تھا۔ مجھے سچ بتا دو۔ یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے ——؟"

اُس نے فاخرہ کے سرہانے تپائی پر دھرے پانی کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اُسے پینے کے لیے دیتے ہوئے کہا۔

فاخرہ خالی خالی آنکھوں سے اُس طرف دیکھتی رہی۔

"دیکھو —— میں تمہیں کسی بہانے یہاں سے اپنے ساتھ لے جاؤں گی —— تمہاری چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کے بہانے لے جاؤں گی۔ تمہاری ماں کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ تمہارا علاج اس مرحلے پر آسان ہے۔ تم ٹھیک ہو کر گھر واپس لوٹو گی۔ بے وقوف مت بنو —— تم اس طرح صرف اپنی زندگی سے ہی نہیں کھیل رہی —— تمہارے دونوں بہن بھائیوں کا مستقبل تباہ ہو سکتا ہے —— تمہیں اس بات کا احساس ہے یا نہیں۔ تم کیوں نہیں سمجھ رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں تمہاری دوست ہوں بیٹی ـــــ تمہاری دشمن نہیں۔"
ڈاکٹر نسرین نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آنٹی ـــــ"

فاخرہ کے منہ سے نکلا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔!

"میں بے قصور ہوں آنٹی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ شمع مجھے جہنم کے گڑھے میں دھکیل رہی ہے۔"

اس نے اپنی نشے کی عادت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"تم اب نارمل ہو جاؤ۔ میں کچھ گولیاں منگوا رہی ہوں ـــــ ان سے تمہیں رات کو بھی اچھی نیند آ جائے گی۔ کل میں خود تمہیں آ کر لے جاؤں گی۔ کل تک تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ میں تمہاری ماں سے کہوں گی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ اچھا اب اچھے بچوں کی طرح اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہاری ماں کو کسی بہانے مطمئن کرتی ہوں۔"

ڈاکٹر نسرین نے کہا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر باہر آ گئی۔

اس نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے فاخرہ کی ماں کو اس کی بیٹی کا روگ بتا دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ خدا کا شکر ادا کرے یہ بات ابھی ان دونوں کے درمیان ہے۔

فاخرہ کے ابو ان دنوں پندرہ روزہ کے ایک تربیتی کورس پہ گئے ہوئے تھے اور ایک دو دن میں ان کی واپسی متوقع تھی۔ بیگم صاحبہ کے تو اس خبر نے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تھے۔ انہیں اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا اگر ڈاکٹر نسرین موقع پر موجود نہ ہوتی تو یہاں کوئی حادثہ بھی متوقع تھا۔ اس نے اپنے ایمرجنسی فسٹ ایڈ بیگ میں موجود گولیوں سے اپنی دیرینہ سہیلی کو سنبھالا اور رات تک

اس کے ساتھ موجود رہی۔

رات تک بیگم صاحبہ نے اس حادثے کو اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

"میں نے اسے نیند کی گولیاں دے دی ہیں۔ صبح تک سوتی رہے گی۔ میں دوپہر کو آ کر اسے لے جاؤں گی۔ میں وہاں گھر میں اکیلی ہوں۔ بچے آج کل اپنے میکے گئے ہوئے ہیں۔ پانچ سات دن اپنے ساتھ رکھ کر علاج کروں گی۔ اس درمیان تم اسے ملتی رہنا۔ بھائی صاحب سے بھی کہنا کہ میرے بچوں کے چلی گئی ہے ـــــ"

ڈاکٹر نسرین نے اسے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے نسرین۔ خدا کی مرضی۔ خدا جانے مجھ سے کونسا ایسا گناہ سرزد ہو گیا تھا جس کی سزا۔۔۔۔"

بیگم صاحبہ کی آواز بھرا گئی۔

ان کے منہ سے ڈھنگ سے الفاظ بھی ادا نہیں ہو رہے تھے۔

"ہوش کر صبیحہ! عقل کر۔ اگر تو نے بھی ہمت ہار دی تو فاخرہ کا کیا بنے گا۔"

ڈاکٹر نسرین نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اور ـــــ

بیگم صاحبہ کو ذرا احساس ہو گیا کہ واقعی اب اگر ان کی بیٹی کو اس آفت سے کوئی بچا سکتا تھا تو وہ کوئی اور نہیں خود بیگم صاحبہ تھیں۔ انہیں حوصلہ کرنا تھا اور حالات کا مقابلہ بھی ـــــ!

ڈاکٹر نسرین چلی گئی۔

بیگم صاحبہ نے خود کو اس طرح نارمل رکھا ہوا تھا جیسے انہیں اس بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا علم ہی نہیں انہوں نے بیٹی کو بھی اس بات کا احساس نہ ہونے دیا اور دوپہر کے بعد ڈاکٹر نسرین اُسے گاؤں لے جانے کا بہانہ کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔

گھر پہنچ کر اُس نے فاخرہ سے پھر جھوٹ بولا اور اُسے بتایا کہ اُس نے بیگم صاحبہ کو، اصل بات نہیں بتائی بلکہ یہی کہا ہے کہ اسے ڈیپریشن کا عارضہ لاحق ہوا ہے جس کا علاج وہ اپنے گھر رکھ کر کرے گی۔

جس روز ڈاکٹر نسرین اُسے گھر لائی تھیں شاکرہ بیگم کو گرفتار ہوئے دو دن ہونے کو آئے تھے۔ فاخرہ کے پاس سگریٹ ختم ہو چکے تھے اور تنویر کو وہ جس نمبر پر ٹیلی فون کیا کرتی تھی وہاں سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔

شمع سے جب وہ اپنی مصیبت کا ذکر کرتی تو وہ اُسے دھمکیاں دے کر فون بند کر دیتی۔ اگلے روز تو اُس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر اُس نے دوبارہ شمع کو فون کیا تو وہ پولیس کو مطلع کر دے گی۔ ایک اعلیٰ پولیس افسر کی بیٹی ہونے کے ناطے اس سے زیادہ پولیس سے کون ڈر سکتا تھا۔

بے چاری سہم کر رہ گئی۔

اُس نے ڈاکٹر نسرین کو بادلِ نخواستہ اپنی تباہی کی ساری کہانی سنا دی تھی۔

لیکن ——

کمال صفائی سے وہ اس کہانی سے تنویر کا ذکر گول کر گئی تھی۔ کم از کم وہ اتنی باہمت نہیں تھی کہ اپنے اس گھناؤنے جرم کا اقرار بھی کر لیتی —— اس سے تو بہتر تھا کہ وہ مر جاتی ——"

نسرین ڈاکٹر تھی —— وہ جانتی تھی کہ مریض کو فی الوقت کس حد تک کریدنا مناسب ہے اور کس حد تک فی الحال رازداری ضروری ہے۔

فاخرہ کو سگریٹ پیئے آج دوسرا دن تھا اور اس وقت اُسے یوں محسوس ہو رہا

تھا جیسے اُس کا جسم دُکھتا ہوا پھوڑا بن گیا ہو۔ اُس کی رگ رگ میں درد تیز نشتر کی طرح اُترتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے اپنے جسم میں خون کی جگہ درد کی لہریں دوڑ رہی محسوس ہو رہی تھیں۔

اُسے فی الوقت ایک سگریٹ درکار تھا خواہ اُس کی قیمت اپنی جان دے کر ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔

لیکن ——

اس سب کچھ کے باوجود ابھی تک اس کے اندر کہیں احساسِ جرم بھی زندہ تھا۔ اس کا ضمیر بار بار اُسے کچوکے دے رہا تھا کہ وہ اس حالت کو پہنچنے سے پہلے مر کیوں نہ گئی

شاید مرنے کا خیال اُسے اس سے پہلے ہی آ گیا ہوتا لیکن ابھی تک اُس کے گناہوں پر پردہ پڑا ہوا تھا اور اس کے گھر میں سوائے فاخرہ اور خدا کی ذات کے اور کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ گناہوں کی اس دلدل میں کتنی گہری اتر گئی ہے۔

ڈاکٹر نسرین نے اُسے کوئی انجکشن لگا کر گہری نیند سلا دیا تھا۔

فی الحال وہ اُس کا اس سے بہتر کوئی علاج نہیں کر سکتی تھی۔

نیند سے بیدار ہونے پر پھر اُس کے وجود میں درد لہر بن کر دوڑنے لگا۔ ڈاکٹر نسرین نے شاید آج اُس کے لیے ہسپتال سے چھٹی کی تھی کیونکہ وہ ابھی تک اُس کے سرہانے بیٹھی تھی۔

"بیٹی یہ گولیاں کھا لو —— خدا سے معافی اور مدد مانگو —— اپنی قوتِ ارادی کو بیدار کرو۔ اپنے آپ کو جانو —— خود کو پہچانو کہ تم کون ہو اور کیا ہو گئی ہو یاد رکھنا تمہاری زندگی سے تمہارے سارے خاندان کی زندگیاں وابستہ ہیں۔ تم ایک بڑے گھر کی عزت ہو۔ اب تک جو کچھ ہو چکا اُسے اپنی بدقسمتی سمجھ کر بھول

Scanned by Iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاؤ — نئے عزم اور ارادے سے زندہ رہنے کی کوشش کرو۔ تم میری باتیں سمجھ رہی ہو ناں — مجھے اپنی دوست جانو — میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو ایک ہفتے کے اندر اندر تم بالکل تندرست اور پہلے جیسی ہو جاؤ گی — لیکن شرط یہی ہے کہ میرا ساتھ دو۔ اپنے گھر والوں کا ساتھ دو۔ خود کو باہمت بناؤ — ہمت سے کام لو — شاباش یہ لو گولیاں۔"

اُن بے رحم لمحات میں جب درد سے اُس کے بدن کی نس نس ٹوٹ رہی تھی۔ اس کی مہربان ڈاکٹر آنٹی نے اُس کے احساس ندامت کو جگا کر اُسے مثبت رُخ دے دیا تھا۔

"آنٹی آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں مر جاؤں گی لیکن نشہ نہیں کروں گی — نہیں کروں گی — نہیں کروں گی۔"

اُس نے پاگلوں کی طرح گردان شروع کر دی۔

گولیوں نے اُسے چند گھنٹے کے لیے پھر نارمل کر دیا۔

لیکن —

اس دوران وہ دل میں عہد کر چکی تھی کہ اب مزید شرمندگی نہیں اُٹھائے گی — اس زندگی سے تو بہرحال موت بہتر تھی۔

فاخرہ نے موت کے خلاف اس جرأت کی جنگ لڑی کہ اسے اپنے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر نسرین نے اپنی زندگی میں طب کا ایسا معجزہ نہیں دیکھا تھا جو فاخرہ نے کر دکھایا۔ آٹھ دن تک وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپی۔ اُس کا زیادہ وقت اس دوران مُصلّے پر گزرا۔ نماز اور مسلسل نوافل کے بعد اُسے کچھ وقت ملتا تو قرآن پاک کھول کر بیٹھ جاتی۔

اس دوران اس کی ماں روزانہ اس سے ملاقات کے لیے آتی رہی۔

دن کا کچھ حصہ اپنی بیٹی کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ ساری رات خدا کے حضور گڑگڑا کر اُس کی صحت اور سلامتی کی دعائیں مانگتی رہتی۔

ان آٹھ دنوں میں وہ متعدد مرتبہ ٹوٹی اور جُڑی۔

اُس کے بدن کا رواں رواں اپنے ساتھ ہونے والے اس اچانک سلوک پر سراپا احتجاج رہا۔

لیکن —

اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آسکی اور دسویں روز اس کی ڈاکٹر آنٹی نے اُسے گلے لگا کر بے ساختہ اس کے گالوں اور ماتھے پر بوسے دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تم نے اپنا ہی نہیں ہم سب کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ تو نے اپنے باپ کی وردی کی لاج رکھ لی ہے اور — اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہارا قد ہم سب کی نظر میں بہت بلند ہو گیا ہے۔ بیٹی! اب تمہارا ایک اور سخت امتحان ہونے والا ہے۔ جب تم اپنے گھر جاؤ گی تو دوبارہ تمہارے دل میں نشے کی خواہش جنم لے گی۔ لیکن اس سے نفرت کرنا۔ بہت نفرت کرنا — کوشش کرنا اپنے پرانے ماحول سے کٹ کر جینے کی۔"

اُس کی آنٹی نے تو اُسے محض ماحول سے کٹ کر جینے کا مشورہ دیا تھا۔

لیکن —

اُس نے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ تو پرانے ماحول میں کبھی واپس نہ جانے کا اپنے آپ سے عہد کر چکی تھی۔

"نہیں پڑھنا مجھے اس ماڈرن کالج میں — بس میں پرائیویٹ امتحان دے لوں گی۔ آپ پاپا سے کہہ دیجئے — ایم ایس سی میں داخلہ لے لوں گی۔ اوزہار)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر میری کوئی بھی دوست کبھی مجھے ملنے آئے تو برائے مہربانی اُسے دروازے ہی سے واپس لوٹا دیجیے۔"

اُس نے گھر پہنچتے ہی اپنی ماں سے کہا تھا۔

"ایسا ہی ہوگا بیٹی ــــ جیسا تم چاہو گی ــــ ہم وہی کریں گے۔"

بیگم صاحبہ کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا ــــ!

○

اُس روز جب تنویرہ کو اچانک شاہ صاحب سے ملاقات کا حکم ملا تو اُس کے قدموں تلے زمین ہی سرک گئی تھی۔

"کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔"

اُس نے ڈرتے ڈرتے پیغام بر سے دریافت کیا تھا۔

"نہیں سیّد بادشاہ کو تمہاری کوئی ادا پسند آ گئی ہے ــــ بیوقوف تم خوش قسمت ہو ــــ شاہ جی کی قدم بوسی کے لیے تو ہم گزشتہ پانچ سال سے ترس رہے ہیں ــــ تم تو کل کے بچے ہو۔"

پیغام بر نے کہا تھا۔

شاہ جی نے کب کہاں اور کس وقت کس سے ملنا ہے۔ اس کا علم ملنے والے کو عین آخری لمحات میں ہوا کرتا تھا۔ اُسے اتنا پیغام مل جاتا تھا کہ اگلے دو روز گزرنے کا مطلب ہوتا تھا کہ بالے شاہ نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔!

تنویرہ کو اگلے روز علی الصباح ہی ایک کار لینے پہنچ گئی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ بالے شاہ کے سامنے موجود تھا۔

"سلام سیّد بادشاہ ــــ"

اُس نے ناشتے کی میز پر اپنے منتظر بالے شاہ کو مرشد کی طرح احترام دیا۔

"بیٹھ جاؤ ــــ بیٹھ جاؤ ــــ کیا نام ہے تمہارا ــــ تنویر شاید ــــ"

بالے شاہ نے اس کے سلام کا جواب دیے بغیر ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنے سامنے بیٹھنے کا حکم دیا۔

" وہ کیا ہے۔ ایس ایس پی کی لڑکی۔ تم ہی اس پر کام کر رہے ہو نا۔؟"

اُس نے پہلا سوال داغا۔

"جی شاہ جی ــــ بے فکر رہیں شاہ جی وہ بچ کر نہیں جا سکتی اپنے قابو میں ہے۔"

تنویرہ نے گردن ہلائی۔

"ٹھیک ہے اُسے قابو کرنا ہے چند روز کے لیے ــــ راجی سے مل کر ساری بات سمجھ لینا۔ کام ہوشیاری سے کرنا۔ کامیابی سے۔ تم جانتے ہو میں ناکام لوگوں کو۔۔۔۔"

اُس نے اپنا فقرہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"شاہ جی آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی میرے بادشاہ۔ آپ کے کتے ہیں مالک. آپ حکم دیں تو اپنی گردن کاٹ کر حاضر کر دیں گے۔"

تنویرہ چمچہ گیری کے لیے ان غنیمت لمحات کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ دوسرے کمرے میں راجی موجود ہے اور ہاں خیال رکھنا اس ملاقات کا کوئی ریکارڈ نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھ لو تم مجھ سے زندگی میں کبھی ملے ہی نہیں ــــ سمجھ گئے ناں ــــ"

بالے شاہ نے اُسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سمجھ گیا مائی باپ ــــ بالکل سمجھ گیا ــــ"

تنویرہ نے کھڑے ہو کر درباریوں کی طرح سر جھکا کر اُسے تعظیم دی اور ملحقہ

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا گھسا۔

سامنے ایک صوفے پہ راجی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

"شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ کوئی حکم براہِ راست دیا ہے۔ اس کی مکمل تعمیل ہونی چاہیے۔ سمجھ گئے ناں میرا مطلب کیا۔ ہے؟"

اُس نے تنویر کے بیٹھنے پر کہا۔

"ملک جی ـــ آج تک کبھی شکایت کا موقع ملا ہے آپ کو جو آئندہ ملے گا؟"

تنویر نے بے شرمی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اِدھر آؤ۔"

اُس نے تنویر کو اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اُسے سمجھانے لگا کہ اُن لوگوں کا منصوبہ کیا ہے اُس نے کیا کرنا ہے؟

"چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس چڑیا کو گھونسلے سے باہر نکال کر اپنے اڈے پہ لے آؤ۔ باقی کام ہم خود سنبھال لیں گے۔ سمجھ گئے ناں۔"

آخر میں راجی نے اسے ہدایت دی۔

"ملک جی ـــ یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔"

تنویر کے لیے واقعی یہ کوئی خاص کام نہیں تھا۔ اُسے حکم ملا تھا کہ کسی طرح فاخرہ کو گھر سے باہر اُن کے اڈے تک لے آئے باقی کام وہ خود کر لیں گے فاخرہ تو اُس کے فون کی منتظر رہا کرتی تھی۔ یہ تو وہ تھا جس نے شاکرہ بیگم کی گرفتاری کے بعد اس سے رابطہ توڑ رکھا تھا۔

"یہ لو ـــ بالے شاہ بادشاہ آدمی ہے۔ اپنے کسی کارکن کو کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔"

اُس نے ایک کونے میں دھرے بریف کیس سے نوٹوں کا ایک بنڈل

نکال کر تنویر کی طرف پھینکا۔

"تھینک یو ـــ ملک جی ـــ"

تنویر نے بے حیائی سے دانت نکالتے ہوئے نوٹوں کے بنڈل کو بوسہ دیا اور اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال کر باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ فون پر فاخرہ سے بات کر رہا تھا ـــ!

اُس نے بڑی ہوشیاری سے کسی عورت سے فون کروایا تھا تاکہ دوسری طرف کسی کو شک نہ پڑے۔

"ہیلو ـــ"

فاخرہ کی آواز پر ہی اُس کی باچھیں کھل گئیں۔

"کیسی ہو ڈارلنگ میں تنو۔۔"

تنویر نے کچھ کہنا چاہا لیکن اُسے یوں لگا جیسے اچانک ۴۴۰ وولٹ کا کرنٹ فون میں دوڑ گیا ہو۔

"شٹ اپ ـــ خبردار اگر دوبارہ فون کیا۔"

دوسری طرف سے فاخرہ نے اُسے ڈانٹ کر فون بند کر دیا۔

اُسے فی الوقت یہی سمجھ آئی تھی کہ شاید فاخرہ کو اس بات کا غصہ ہے کہ تنویر نے اتنے دن اس کی کوئی خبر کیوں نہیں لی۔

وہ وقفے وقفے سے اُسے فون کرتا رہا۔

لیکن ـــ

ہر دفعہ ڈانٹ کھا کر رہ گیا۔

اب اُسے جان کے لالے پڑنے لگے تھے کیونکہ بالے شاہ کے براہِ راست حکم کی تعمیل میں غفلت کا مطلب تھا موت ـــ وہ لوگ فاخرہ کے ذریعے اپنی

Scanned by Iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ترپ چال" چل کر حاجی کو رہا کروانا چاہتے تھے اور فاخرہ اُس کے منہ لگنے کو تیار نہیں تھی۔

کچھ سوچتے ہوئے اُس نے شمع کا نمبر ملایا اور اُس سے فاخرہ کو لانے کے لیے کہا لیکن جب شمع نے اُسے بتایا کہ اُس کا تو داخلہ ہی فاخرہ کے گھر بند ہو چکا تھا۔ تو تنویر نے "با دلِ نخواستہ" ایک خطرناک چال چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اِس میدان کا پرانا شہسوار تھا۔

فاخرہ کے ساتھ اُس کی معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنائی گئی درجنوں تصویریں اس کے پاس موجود تھیں۔ جن کے سامنے وہ بالکل بے بس ہو جاتی ـــــ!!

دوسرے روز جب فاخرہ کی امی اس کی بہن کو ڈراپ کرنے معمول کے مطابق کار میں اُن کے سکول کی طرف جا رہی تھی اور ایس پی صاحب اپنے آفس جا چکے تھے تنویر اپنی موٹر سائیکل پر اُس کے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ گھنٹی بجانے پر جس اردلی نے دروازہ کھولا اس نے بڑے شریفانہ انداز سے اس سے سلام دعا کی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ مس فاخرہ کی سہیلی کا بھائی ہے اور اُن کے لیے اپنی بہن کی شادی کا کارڈ لے کر آیا ہے۔

"یہ کارڈ انہیں پہنچا دیں۔ شکریہ۔"

یہ کہہ کر اُس نے ایک بڑے سے لفافے میں بند کارڈ اُسی کی طرف بڑھا دیا اور خود موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے اپنی راہ لی۔

کارڈ تھوڑی دیر بعد فاخرہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے تجسس کے عالم میں کارڈ کھولا تو تین تصویریں نیچے گر پڑیں۔

فاخرہ کو شاید ہیروئن کے نشے میں کبھی یہ احساس نہیں ہو سکا تھا کہ شاکرہ

کے گھر اس کی نیم برہنہ تصاویر تنویر کے ساتھ کھینچی گئی تھیں۔ یہ کارنامہ انہی شیطانوں کا تھا جن کی چنڈال چوکڑی میں وہ پھنس چکی تھی۔

اپنے شکار کے مستقبل میں ہاتھوں سے پھسل جانے کے خطرے کو انہوں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔

ان تصاویر کے ساتھ ایک مختصر سی تحریر تنویر کی طرف سے تھی۔ اُس نے لکھا تھا!

فاخرہ!

میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔ میں بھی تمہاری طرح ایک ستم رسیدہ نوجوان ہوں۔ جس طرح تم شاکرہ بیگم کے جال میں پھنس گئی تھیں۔ اس طرح ان شیطانوں نے مجھے بھی قابو کر رکھا تھا۔ میں نے بغاوت کر دی ہے۔ میں تو مرنے کے لیے تیار ہوں لیکن مرنے سے پہلے یہ تصور بھی میرے لیے بڑا اذیت ناک ہے کہ تمہارے خاندان کی عزت پر میری وجہ سے کوئی حرف آئے۔ یہ لوگ ایک خطرناک منصوبے پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھ پر اعتبار کرو۔ میں نے اپنی زندگی پر کھیل کر تمہیں بچانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ ایسی درجنوں تصاویر سارے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تقسیم کر دیں۔ تم اسی وقت گھر سے نکلو اور ریکنٹ پارک میں آ جاؤ جہاں ہم ملا کرتے ہیں۔ میں تمہارا منتظر ہوں ـــــ میری موت سے پہلے یہ آخری ملاقات انشاءاللہ ان موذیوں کے چنگل سے تمہاری جان چھڑا دے گی ـــــ خدارا وقت ضائع نہ کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے!

تمہارا تنویر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فاخرہ کو اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔!

اس کے معصوم ذہن نے یہی سوچا کہ شاید تنویر بھی ان کا ستم گزیدہ ہے

اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اس کے جیتے جی یہ تصاویر اس کے والدین تک پہنچ جائیں۔

چند منٹ تک سوچنے کے بعد اس نے اچانک ایک اہم فیصلہ کر لیا۔

اُسے علم تھا اُس کے پاپا کا ایک سروس ریوالور اُن کے کمرے کی الماری میں موجود رہتا تھا۔

ایک جھٹکے سے وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ——!

اس نے اپنے والد کا ریوالور ان کے ہولسٹر سے نکالا۔ کالج میں این سی سی کی تربیت نے اُسے فائر کرنا سکھا دیا تھا۔

ریوالور اُس نے اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالا اور باہر نکل آئی۔ گھر کے دروازے پر موجود اردلی کے پاس اس نے اپنی والدہ کے لیے پیغام چھوڑا اور چند منٹ بعد ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ریجنٹ پارک کی طرف جا رہی تھی۔

ریجنٹ پارک سے کچھ فاصلے پر ہی اُس نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل اُس طرف چل دی۔

○

ایس پی سلیم باجوہ نے اپنی دانست میں بڑی رازداری برتی تھی۔

لیکن ——

جب وہ پولیس کی بند شیشوں والی وین کے ہمراہ عدالت تک پہنچا تو عدالت کے باہر اچھا خاصا مجمع اُس کا منتظر تھا۔

یہ جلوس راتوں رات اس کے استقبال کے لیے ترتیب دیا گیا تھا جس

میں قریباً ہر طبقۂ زندگی کے لوگ شامل تھے۔ سلیم باجوہ نے جیسے ہی وین سے باہر قدم رکھا انہوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پولیس اور خصوصاً ایس پی سلیم باجوہ کے خلاف نعرے بلند کرنے شروع کر دیے۔

یہ لوگ باقاعدہ کتبے اور بینر لکھ کر لائے تھے۔ جنہیں وہ ہوا میں لہراتے اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر نعرے لگا رہے تھے۔

طے شدہ انتظامات کے مطابق ڈرگ مافیا کے تنخواہ دار فری لانس فوٹوگرافر اخبار نویس یہاں پہلے ہی سے موجود تھے جنہوں نے ان مناظر کو ٹھکا ٹھک اپنے کیمروں کی فلموں پر اُتارنا شروع کر دیا۔

سلیم باجوہ ہکا بکا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

اچانک ہی تین چار اخبار نویسوں نے اسے گھیر لیا۔

"آپ نے حاجی صاحب کو ابھی تک عدالت میں پیش کیوں نہیں کیا۔ کل سے انہیں حبس بے جا میں کیوں رکھا ہوا ہے ——؟

ایک اخبار نویس نے جس کی شکل ہی کسی گھریلو پالتو کتے سے ملتی جلتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر لہراتے ہوئے پوچھا۔

ایس پی باجوہ کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اس منحنی سے بندر کا ٹینٹوا دبا دے جس نے اپنے انتہائی مکروہ عزائم کو چھپانے کے لیے صحافت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔

لیکن ——

وہ مجبور تھا۔ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ قانونی پابندیوں نے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔

"نو کمنٹ ——"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا اور قدم آگے بڑھائے۔

"آپ نے کس قانون کے تحت گزشتہ چوبیس گھنٹے سے حاجی صاحب کو اغوا کر کے حبس بے جا میں رکھا ہے ——"

دوسرا سوال ہوا۔

باجوہ نے سونگھ لیا تھا کہ ان سوالات اور اس ساری صورتحال کے پس پردہ کون سی شخصیت ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں نے اپنی دانست میں باجوہ کو مشتعل کرنے کے لیے کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی تھی۔

لیکن ——

باجوہ کم از کم دشمن کی مرضی کا کھیل اس کے میدان میں نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔

اس نے دوبارہ "نو کمنٹ" کہہ کر آگے بڑھنا چاہا لیکن وہی اخبار نویس اسی طرح اس کے راستے پر جم گیا جیسے اپنے سوال کا جواب لیے بغیر واپس نہیں جائے گا۔

"دیکھیے مسٹر! یہ کوئی پریس کانفرنس نہیں ہو رہی۔ آپ میرے راستے سے ہٹ جائیے۔ اس طرح آپ سرکاری کام میں مداخلت کر رہے ہیں۔"

اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اُسے سمجھانا چاہا۔

"واہ ایس پی صاحب اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے تو سنتے آئے تھے لیکن اب کوتوال چور بن کر شریفوں کو ڈانٹیں گے یہ آج دیکھ لیا۔"

یہ اخبار نویس شاید خصوصی طور پر کسی مشن کے لیے بھیجا گیا تھا اور اس کی ہر ممکن کوشش یہی دکھائی دیتی تھی کہ کسی طرح یہاں دنگا فساد کا ماحول پیدا کر دے۔

"دیکھیے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ میرا راستہ چھوڑ دیجیے ہمیں ملزم کو عدالت میں پیش کرنا ہے۔"

ایس پی باجوہ نے ابھی تک اپنے غصے پر کنٹرول کیا ہوا تھا۔

"آپ کو میرے سوال کا جواب دینا ہوگا۔"

جھلائے ہوئے اخبار نویس نے تن کر کہا۔ اس نے اپنی طرف سے شاید باجوہ کا بازو پکڑ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ باجوہ نے دوسری طرف منہ کر کے اپنے ساتھ آنے والی گارد کو اشارہ کیا تھا کہ وہ ملزم کو عدالت میں لے جائیں۔

اخبار نویس کے اس طرح ایس پی کا ہاتھ پکڑنے کی حرکت کا حوالدار بلبل شاہ نے بُرا منایا۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کے آفیسر کی توہین کی جا رہی تھی۔

"ہٹ اوئے پرے ہٹ —— راستہ دے۔"

اس نے اخبار نویس کو ایک طرف ہلکا سا دھکا دیا۔

شاید وہ لوگ اسی اشارے کے منتظر تھے۔

وہی اخبار نویس گالیاں بکتا حوالدار بلبل شاہ کی طرف بڑھا جس نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مشتعل ہجوم ان پر پل پڑا۔

لیکن ——

ایس پی باجوہ نے صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی اپنا پسٹل نکال کر ہوا میں گولیاں چلا دیں جس سے لوگ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

باجوہ کے اشارے پر گارد کے جوان حاجی کو دھکیلتے ہوئے عدالت کے دروازے تک لے گئے۔

باجوہ کو اس بات کا احساس ہی نہ ہو سکا کہ ان کی ایک ایک حرکت کو کیمروں نے اپنی فلم پر محفوظ کر لیا تھا۔ خصوصاً اخبار نویس کو تھپڑ مارنے کا بلبل شاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا سین اور باجوہ کی طرف سے ہوائی فائرنگ ــــــ!!

مشتعل ہجوم نے ان کے تعاقب میں بھاگنے کے بجائے وہیں کھڑے ہو کر نعرے لگانے شروع کر دیے۔

پلک جھپکنے میں ایک نوجوان نے پولیس وین کے نیچے لیٹ کر اُس کا پٹرول پائپ کھینچ کر توڑ دیا اور اس کے ساتھی نے پٹرول پر جلتی تیلی پھینک دی۔

بھک کی آواز سے آگ بھڑک اُٹھی اور پولیس وین جلنے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر احاطہ عدالت میں موجود پولیس کے جوان بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے اور انہوں نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے اُن پر بے تحاشا لاٹھی چارج شروع کر دیا۔

چند منٹ بعد ہی یہ علاقہ میدانِ جنگ بن چکا تھا۔

ایک طرف پولیس تھی اور دوسری طرف جلوس کے نام نہاد شرکا جو خاصے تربیت یافتہ دکھائی دیتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے چند منٹ ہی میں پولیس کو ننگی کا ناچ نچا کر رکھ دیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد پولیس کی مزید نفری اپنے ساتھیوں کی مدد کو پہنچ گئی جسے دیکھ کر شرپسند رفو چکر ہو گئے۔

○

قریباً بھاگتے ہوئے وہ لوگ متعلقہ عدالت میں پہنچے تھے۔

عدالت کا دروازہ ایس پی باجوہ نے ایک جھٹکے سے کھولا اور سب سے پہلے جس شخصیت پر اس کی نظر پڑی اُسے دیکھتے ہی باجوہ کا خون کھول اٹھا۔

یہ بیرسٹر خان تھا۔

اپنے ماتحتوں کے نرغے میں گھرا بیرسٹر خان اپنی گھنی مونچھوں میں چھپے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ سجائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایس پی صاحب ــــــ عدالت کا احترام کیجیے ــــــ یہ آپ کا تھانہ نہیں ہے۔"

بیرسٹر صاحب نے اندر داخل ہوتے ہی اس پر طنز کیا۔ اس کے ساتھ ہی جج صاحب نے گردن کو جھٹکا دے کر اس کی اس حرکت کا نوٹس لیا۔

"مجھے افسوس ہے جناب۔ میں معذرت خواہ ہوں لیکن باہر صورتِ حال بڑی مخدوش ہے کچھ شرپسند وہاں گھس آئے ہیں۔ انہوں نے ملزم کو ہم سے چھیننے کی کوشش کی تھی۔"

ایس پی صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے جج کی طرف دیکھا۔

"جنابِ والا ایک اعلیٰ پولیس افسر کی بوکھلاہٹ کا نوٹس لیا جائے۔ اگر پولیس بھی شرپسندوں کو قابو نہیں کر سکتی تو کیا آسمان سے فرشتے آئیں گے ہماری مدد کو ــــــ"

بیرسٹر خان نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

جج نے منہ سے کچھ کہے بغیر استفہامیہ نظروں سے ایس پی باجوہ کی طرف دیکھا۔

"جنابِ والا۔ وہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ انہیں دنگا فساد کرنے کا موقع دیں۔"

ایس پی باجوہ نے وضاحت کی۔

جب وہ باہر کی صورتِ حال کی وضاحت کر رہا تھا عدالت کے باہر ہونے والی ہنگامہ آرائی کا شور عدالت کے اندر سنائی دے رہا تھا۔

"ٹھیک ہے کارروائی شروع کی جائے۔"

شاید جج صاحب نے صورتِ حال کی نزاکت کو جان لیا تھا۔

ابھی ایس پی باجوہ نے حاجی کی گرفتاری اور اس سے مال کی برآمدگی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے ریمانڈ کی درخواست ہی کی تھی جب حاجی نے آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔

"میرے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے جناب۔ میں مجرم نہیں ہوں ان لوگوں نے ساری رات مجھ پہ ناجائز تشدد کیا ہے۔ میرا فوراً طبی معائنہ کروایا جائے۔ ایس پی صاحب کے حکم پہ پولیس والوں نے مجھے ناجائز حراست میں رکھ کر مجھ پر تشدد کیا ہے۔"

اس کی بات بمشکل مکمل ہوئی تھی جب بیرسٹر خان اور اس کے ماتحتوں نے جج صاحب کے سامنے درخواستوں اور سرٹیفکیٹس کے ڈھیر لگا دیے۔

جج صاحب حیرانگی سے کبھی اُن کاغذات کی طرف دیکھتے اور کبھی ایس پی باجوہ کی طرف۔ وہ ذاتی طور پہ باجوہ کو جانتے تھے انہیں علم تھا کہ باجوہ ایک شریف اور انتہائی دیانتدار پولیس آفیسر ہے جس نے حال ہی میں بھیس بدل کر بابے شاہ کا مال پکڑنے پہ عالمی سطح پر شہرت حاصل کر لی تھی۔

یہ تمام میڈیکل سرٹیفکیٹ شہر کے نامور ڈاکٹر صاحبان کے جاری کردہ تھے جن کے مطابق حاجی صاحب بلڈ پریشر، شوگر اور دل کے عارضے میں مبتلا تھے اور ان پر کسی بھی قسم کا ذہنی دباؤ ان کی موت کا سبب بھی بن سکتا تھا۔

"جنابِ والا! میرا موکل اس ملک کا ایک معزز شہری ہے بے شمار رفاہی انجمنوں کا کرتا دھرتا، کرائمز کنٹرول کمیٹی کا ممبر اور مسجد کمیٹی کا چیئرمین ہونے کے علاوہ علاقے کا سابق کونسلر، چیئرمین زکوٰۃ کمیٹی بھی ہے۔ میرا موکل کئی جان لیوا عارضوں میں مبتلا ہے۔ اُسے کل شام سے ایس پی صاحب نے ایک بھری پُری جلسہ گاہ سے اغوا کر کے حبسِ بیجا میں رکھا ہوا ہے جہاں اُن پہ ناجائز تشدد کیا گیا۔ عدالت اس کا نوٹس لے اور ملزم کے ریمانڈ کی درخواست نامنظور کی جائے۔"

بیرسٹر خان نے بحث کا آغاز کیا۔

"جنابِ والا یہ خطرناک مجرم ہے جس سے ہمیں برآمدگیاں کرنی ہیں۔

اور کئی سابقہ جرائم سے متعلق تفتیش کرنی ہے۔ برائے مہربانی پولیس کو ملزم کا پندرہ روزہ ریمانڈ دیا جائے۔"

ایس پی باجوہ نے درخواست کی۔

بیرسٹر خان نے واقعی دھوپ میں بال سفید نہیں کیے تھے۔ اس کی دلیلوں نے جج کو اتنا مجبور کر دیا کہ انہوں نے پولیس کو ریمانڈ دینے کے بجائے ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پہ جیل بھیج دیا تاکہ اس کا علاج کروایا جا سکے۔

○

ایس پی سلیم باجوہ ایک مرتبہ پھر ہاتھ ملتا رہ گیا۔

ایک مرتبہ پھر "ڈرگ مافیا" نے اُسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

اگلے روز کے اخبارات نے وہ طوفان اُٹھایا کہ الامان الحفیظ انہوں نے باجوہ کو ڈریکولا کا خطاب دیتے ہوئے اس کی فائرنگ کرتے ہوئے تصاویر شائع کیں جن کے نیچے بڑے اشتعال انگیز کیپشن جمائے گئے۔

پولیس نے اپنی دانست میں اپنے ایس پی کو بچانے کے لیے اُن کی طرف بڑھنے والوں کو پیچھے دھکیلا تھا جبکہ اخبارات نے ان تصاویر کو پولیس کے اندھا دھند لاٹھی چارج اور "لوچرپن" سے تشبیہ دی تھی۔

ایک مرتبہ پھر ڈرگ مافیا کے تنخواہ دار صحافتی بھیڑیے اپنے مالکوں کا حقِ نمک ادا کرنے پر تُل گئے تھے۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے سلیم باجوہ کے خلاف ادارتی نوٹس کی مہم چلا دی۔

لیکن ——

اس مرتبہ باجوہ کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اُسے اپنے آئی جی کا اعتماد حاصل تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ تبادلے سے بچ گیا۔ اعلیٰ حکام کو آئی جی صاحب نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خصوصی بریفنگ میں ڈرگ مافیا کی قوت سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ لوگ اپنے اثر و رسوخ کی بنیاد پر جب چاہیں کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری اہم شخصیت کے خلاف "ڈس انفارمیشن" کی مہم چلا سکتے ہیں اور حالات کے رُخ کو "میڈیا" کے ذریعے اپنی طرف موڑ سکتے ہیں ——

آئی جی صاحب کی خصوصی شفقت اور سلیم باجوہ کے ایماندارانہ ریکارڈ کی وجہ سے فی الوقت اس کی عزت محفوظ رہ گئی تھی، ورنہ پھر جگ ہنسائی کا نشانہ بننا پڑتا۔

اس درمیان سلیم باجوہ نے بھی کوشش کی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہ کیس اس کے ہاتھوں سے نہ نکل سکے۔

اُسے خود پر اعتماد تھا کہ وہ تھرڈ ڈگری طریقے بروئے کار لاتے ہوئے حاجی سے سچ اگلوا لے گا کیونکہ سیکرٹری مجیب نے اس کے خلاف قریباً تمام معلومات فراہم کر دی تھیں۔

باجوہ نے بڑی ہوشیاری سے کام لے کر بہت سے ثبوت بھی حاصل کر لیے تھے۔

لیکن ——

اُس کا واسطہ شاید اس ملک کے مکار ترین مجرم سے تھا جس نے کبھی بھی اپنے براہِ راست ملوث ہونے کا ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔

سلیم باجوہ جانتا تھا کہ ان ثبوتوں کے ساتھ عدالت میں نہیں جا سکتا اُسے حاجی کے خلاف ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوت درکار تھے —— وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ خونخوار بھیڑیا جو کسی بدروح کی طرح قوم کے بچوں کی رگوں سے لہو نچوڑ رہا ہے زندگی میں اب دوبارہ آزادی سے گھوم پھر سکے —— اُس نے براہِ راست تو شاید کسی چڑیا کو بھی گولی نہیں ماری ہو گی۔

لیکن ——

اس ملک کے سینکڑوں ہزاروں نوجوانوں کے قتل سے اُس کے ہاتھ رنگے تھے۔ اُس نے مستقبل کے ان معماروں کی رگوں میں جو زہر قطرہ قطرہ انڈیلا تھا اس نے اب رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ہر نوجوان جو ملک کی امید اور اپنے والدین کے بڑھاپے کا سہارا بننے والے تھے اب خود بیساکھیوں کے محتاج ہو کر زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔

شہر کے کسی چوراہے، گراؤنڈ، مزار اور دوسرے مقامات پر جب ایس پی سلیم باجوہ حاجی کے ڈسے ہوئے کسی نوجوان کو ایڑیاں رگڑتے دیکھتا تو اُس کا خون کھولنے لگتا۔

اُس نے پولیس کی نوکری صرف افسری حاصل کرنے اور رُعب جمانے کے لیے نہیں اختیار کی تھی۔ وہ نوجوانی ہی سے ایک مقصد کے تحت زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ اپنی دانست میں قانون کی مدد سے حاصل کردہ اختیارات کے ذریعے معاشرے کو ایسی کالی بھیڑوں سے پاک کرنا چاہتا تھا جنہوں نے اس مملکتِ خداداد کی بقا کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

جو اپنے چہروں پر شرافت کے سائن بورڈ لگائے گھناؤنے جرائم میں ملوث تھے۔ جنہوں نے اس قوم کو مسیحائی، لیڈری، پیری، مریدی، سیاست، صحافت اور دیگر عظیم پیشوں کی آڑ میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

ایس پی سلیم باجوہ بھی اگر چاہتا تو اپنے بہت سے دوسرے ساتھیوں کی طرح جو دن رات لوٹ مار کر رہے تھے بادشاہوں کی سی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ زندگی کی تمام آسائشوں کے دروازے اُس کے لیے چوبیس گھنٹے کھلے تھے۔ اُس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے پاس ہر وقت لاکھوں روپے کی آفرز موجود تھیں۔ وہ چاہتا تو اپنے اشارہ ابرو سے اپنے قدموں میں زمانے کی عیاشیوں کے ڈھیر لگا لیتا۔

لیکن ——

اُس نے ایسا نہیں کیا۔

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کا بیٹا ہونے کے ناطے اس نے جب بھی اپنے باپ سے حالات کی بے رُخی کا گلہ کیا تو اپنے زمانے کے مثال بن کر پولیس آفیسر رہنے والے ڈی ایس پی حاجی نیاز باجوہ نے ایک ہی بات کہی۔

"بیٹا! اس دنیا کی زندگی بظاہر بڑی لمبی دکھائی دیتی ہے لیکن بہت مختصر ہے جو لوگ آنے والے دنوں کے لیے جہنم کا ایندھن سمیٹتے رہتے ہیں وہ دراصل اپنے ہاتھوں اپنی گردنوں میں لعنت کا طوق ڈال کر جیتے ہیں۔ اُن کی اولاد گمراہ ہو جاتی ہے۔ بیٹا رزق حرام کمانے والے بظاہر تو بہت چمکتے دمکتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے اندر ہر وقت ایک آگ سی دہکتی رہتی ہے۔ وہ لوگ جانوروں سے بدتر زندگی جیتے ہیں اگر ان کی ڈھٹائی یا بے حیائی کے سبب وہ انسان دکھائی دیتے ہیں تو یہ بھی اللہ کا احسان ہے —— بیٹا! تم حالات کی گردش سے گھبرایا نہ کرو۔ تم عام شہری نہیں ایک ذمہ دار پولیس آفیسر ہو۔ ہم نے یہ ملک بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا اور اس کی بقا کے لیے ابھی بہت قربانیاں دینا پڑیں گی —— بیٹا! ہم ابھی مکمل آزاد نہیں ہوئے۔ آزادی اور ایمان کے دشمنوں کے خلاف ہمارا جہاد ابھی جاری ہے۔ میں چاہتا ہوں جب میں قیامت کے روز اللہ کے حضور پیش ہوں تو یہ فخر میرے ساتھ موجود ہو کہ میرا بیٹا اس گندگی کے جوہڑ میں کنول کے پھول کی طرح جیا۔ بیٹا! مثال بن کر جینا۔ روشنی چاہے موم بتی کی ہی کیوں نہ ہو اندھیرے میں اپنا وجود منوانے کی اہلیت رکھتی ہے —— اگر تم بھی ہمت ہار گئے تو پھر روزِ محشر خدا

کو کیا جواب دو گے ——؟!

"ابا جی۔ آپ مطمئن رہیں۔ انشاء اللہ میری وجہ سے آپ کو کبھی شرمندگی نہیں اُٹھانی پڑے گی ——"

وہ اپنے بزرگ والد سے کہتا اور ان کی دعائیں لے کر واپس لوٹ آتا۔

○

سلیم باجوہ نے حاجی کی گرفتاری سے عدالت میں پیشی تک کا آپریشن بڑے اعتماد اور خفیہ طریقے سے کیا تھا۔

بُلبل شاہ اس کا خصوصی ماتحت تھا۔ دونوں کا برسوں کا ساتھ تھا گو کہ بُلبل شاہ ایک حوالدار تھا۔

لیکن ——

اُس کی ایمانداری کے سامنے بڑے بڑے جنرل کرنل ایچ دکھائی دیتے تھے۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں کبھی ایک روپے کی رشوت نہیں لی تھی۔ وہ پولیس کی کبڈی ٹیم کا کھلاڑی تھا اور بہترین اتھلیٹ تھا۔ اکثر غیر ممالک میں اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع اُسے ملتا رہتا تھا۔ اور حال ہی میں اس نے ایشین گیمز میں ملک کے لیے جو سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا اس کے بعد سلیم باجوہ نے اس کی پُرزور سفارش کی تھی کہ اُسے اگلے عہدے پر ترقی دے دی جائے۔

اُسی روز بُلبل شاہ کے اے ایس آئی ہونے کے احکامات جاری ہوئے تھے جس روز یہ عدالتی سانحہ پیش آیا

اس وقت وہ ایس پی صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ان کے کمرے میں آیا تھا جب باجوہ نے اپنے پی اے سے کسی ملاقاتی کو اندر نہ آنے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی غیر ضروری ٹیلی فون نہ دینے کی ہدایت کی۔

"بلبل شاہ۔ اس مرتبہ ہمارے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ حاجی کے یہاں موجود ہونے کی خبر آخر باہر کیسے گئی ـــ تم جانتے ہو کہ تمام پولیس والوں کو بھی بتایا گیا تھا کہ حاجی کو کوتوالی میں رکھا گیا ہے ـــ اگر ہم صبح تک یہ بھید چھپائے رکھتے تو عین ممکن تھا کہ اس کا ریمانڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔"

باجوہ نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہ بات اپنی زبان پر لاتے ہوئے ڈرتا تھا کیونکہ اس کوتاہی میں کسی حد تک میں بھی ذمہ دار ہو سکتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں جناب کہ آج تک ایسی کوتاہی نہیں ہوئی۔ شاید ہم میں کوئی کالی بھیڑ آ گئی ہے۔"

بلبل شاہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی ـــ!

"شاہ جی۔ مجھے آج شام تک بہر صورت اُس غدار کا علم ہونا چاہیے جس نے یہ گھٹیا حرکت کی ہے۔ میں ہر کوتاہی برداشت کر سکتا ہوں لیکن اپنے آستین کے سانپ کو معاف نہیں کر سکتا۔"

باجوہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"رائٹ سر! آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی سر ـــ"

بلبل شاہ نے ایڑیاں بجائیں۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ ـــ میں شام کو سٹاف میں آؤں گا ـــ ملزم تمہارے قبضے میں ہونا چاہیے ـــ"

ایس پی باجوہ اس کی طرف دیکھ کر فون کو گھورنے لگا جس کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

بلبل شاہ کے لیے واقعی یہ بڑا چیلنج تھا ـــ

اُس نے اپنی پانچ سالہ ملازمت میں سلیم باجوہ سے زیادہ ایماندار اور محنتی پولیس افسر نہیں دیکھا تھا۔

سٹاف میں واپس پہنچنے تک وہ یہی سوچتا آیا تھا کہ آخر وہ کون ہو سکتا ہے جس کے ذریعے حاجی نے اپنے گرگوں سے رابطہ کر کے سارا پلان ہی بگاڑ کر رکھ دیا۔ اُسے اپنے ساتھیوں کے متعلق علم تھا کہ سلیم باجوہ کے منتخب لوگ غلط نہیں ہو سکتے ـــ ضرور یہ حرکت لائن سے آئے ہوئے کسی جوان کی ہے۔

اپنے دماغ پر زور دینے کے بعد اُسے دو نام مشکوک نظر آئے۔ یہ دونوں "لائن حاضر" سپاہی تھے جن کی خدمات حال ہی میں سپیشل سٹاف کو سونپی گئی تھیں۔

بلبل شاہ نے دونوں میں سے بشیر ماچھی کا انتخاب کیا کیونکہ اُس کا ماضی کا ریکارڈ بھی شرمناک تھا اور اس روز بھی رات کو وہی گارد ڈیوٹی پر تھا۔

اُس نے بڑی ہوشیاری سے اس بات کا پتہ لگا لیا تھا کہ اُس روز اپنی ڈیوٹی سے چھٹی کرنے کے بعد خلاف معمول بشیر ماچھی صبح دیر گئے تک کسی کام کا بہانہ کر کے بازار کی طرف بھی گیا تھا۔

ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد اُس نے خود بخود سے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور اپنے ایک ماتحت کے ذریعے بشیر ماچھی کو اپنے کمرے سے طلب کر لیا۔

بشیر ماچھی پہلے تو اس اچانک طلبی پر بوکھلا گیا لیکن جلد ہی اے ایس آئی بلبل شاہ نے اُسے مطمئن کر دیا۔ اُس نے بشیر ماچھی کے لیے چائے کے ساتھ انڈے اور بسکٹ بھی منگوا لئے تھے۔

"یار بشیرے! ہم آخر پیٹی بھائی ہیں۔ ان افسروں کا کیا آج ہیں اور کل نہیں۔ انہوں نے ہمارے گھر میں دانے تو ڈالنے نہیں۔ یار کچھ ہمارا بھی خیال کر لیا کرو۔ اب تو میرا عہدہ بھی بڑھ گیا ہے۔ سفید پوشی بھی رکھنی ہوتی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بُلبل شاہ نے کہا۔

"شاہ جی۔ میں سمجھا نہیں۔ آپ تو۔۔۔"

بشیر ماچھی نے بظاہر انجان بنتے ہوئے کہا۔

"یار چھوڑ پرے۔ میں نے تمہیں یہاں افسر ماتحت نہیں اپنا بھائی سمجھ کر بلایا ہے۔ مجھ سے اصل میں ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ جس کا ازالہ تم ہی کر سکتے ہو۔"

بُلبل شاہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے اس کی طرف دانہ پھینکا۔

"شاہ جی آپ حکم کریں اگر میں کسی قابل ہوا تو ضرور آپ کے کام آؤں گا۔"

بشیر ماچھی نے دانہ نگل لیا۔

"یار بشیرے۔ تو جانتا ہے کہ ہم تو ملازم آدمی ہیں۔ افسروں کے حکم پر قانونی غیر قانونی ہر کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر کسی کو انکار کریں تو پھر تمہاری طرح لائن حاضر ہونا پڑتا ہے۔ میں نے ایس پی صاحب کے حکم پر حاجی صاحب کی بے عزتی کی تھی لیکن کل عدالت میں جا کر اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا ہے یار ہم تو غریب آدمی ہیں کہیں دو سانڈوں کی لڑائی ہی میں نہ مارے جائیں۔ ایس پی صاحب تو بچ جائیں گے لیکن میں نے حاجی صاحب کے ساتھ جو کچھ غلطی سے کر دیا ہے مجھے تو وہ مروا دے گا۔ بڑا با اثر آدمی لگتا ہے۔ میں تو دوسرے شہر سے آیا ہوں۔ مجھے کیا علم تھا۔ اس نے تو عدالت میں ایس پی صاحب کی ایک نہیں چلنے دی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ دو تین روز میں رہا ہو جائے گا۔ یار کوئی طریقہ ہو کہ مجھے مکان مل جائے۔ میرے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میرا کیا بنے گا ـــــ تمہیں علم ہے کہ مصیبت میں کسی ایس پی نے کام نہیں آنا۔ پھر غیر قانونی حکم کون تسلیم کرے گا کہ کس نے دیا تھا ـــــ؟"

بُلبل شاہ نے قدرے پریشانی کا مظاہرہ کیا۔

"شاہ جی ـــــ بات تو آپ نے ٹھیک کہی ہے ـــــ یہ افسر لوگ کسی کے کام نہیں آیا کرتے ـــــ"

بشیر ماچھی پھسل گیا تھا۔

"یار بشیرے ساری زندگی تیرا احسان نہیں بھولوں گا اور یہاں بھی تیری مرضی کی ڈیوٹی لگوا دوں گا ایس پی صاحب آخر میری اتنی بات تو مان لیں گے۔ لیکن کسی طرح میرا ایک کام کر دے۔۔ ـــــ"

بُلبل شاہ آہستہ آہستہ اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔

"حکم شاہ جی ـــــ"

بشیر ماچھی نے پلیٹ میں موجود اُبلے ہوئے انڈے کا آخری حصہ اپنے منہ میں رکھتے ہوئے چائے کی چسکی لے کر کہا۔

"یار بشیرے۔ میری حاجی صاحب سے کسی طرح جان بخشی کروا دے میرے باپ کی توبہ اگر آئندہ کبھی ایسے کسی بڑے آدمی کے پھڈے میں ٹانگ اڑاؤں!"

بُلبل شاہ نے اس کی گردن کی طرف پھندہ بڑھایا۔

"شاہ جی کوئی بات ہی نہیں۔ میں کل ہی آپ کا کام کروا دوں گا۔"

بشیر ماچھی نے پھندہ اپنی گردن میں اپنے ہاتھوں ڈالتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارے لیے یہ کیسے ممکن ہو گا۔ یار دیکھنا کہیں مروا نہ دینا۔ میں کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا۔۔ ـــــ تم سمجھتے ہو ناں۔۔ ـــــ"

بُلبل شاہ نے تصدیق چاہی۔

"شاہ جی حاجی صاحب سے میری پرانی یاد اللہ ہے ـــــ میں نے ان کے علاقے میں کئی سال تک ڈیوٹی دی ہے۔ بڑی خدمت کی ہے ان کی میری اتنی سی بات نہ مانیں گے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشیر ماچھی نے گردن پھلاتے ہوئے مرغے کی طرح کہا۔

”ٹھیک ہے جب تم کہو گے میں وہاں آجاؤں گا۔۔۔“

بلبل شاہ اب مطمئن ہو گیا تھا

اُس نے فی الوقت بشیر ماچھی کو وہاں سے جانے کے لیے کہہ دیا اور خود ایس پی صاحب کا نمبر گھما کر انہیں ساری صورتِ حال بتا دی۔

”اُسے معطل کر کے لائن حاضر کر دو۔۔۔ میں ابھی احکامات جاری کر رہا ہوں اور شام کو میرے سامنے پیش کرنا۔“

ایس پی سلیم باجوہ نے فون پر ہی کہہ دیا۔ غصے سے اُس کے چہرے کی رگیں تن گئی تھیں۔ اس کے محکمے کے ایک سپاہی نے اس کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔

بشیر ماچھی بڑا مطمئن ہو کر مستقبل کے سنہرے خواب بُنتا اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ جب منشی نے اُسے طلب کر کے ایس پی صاحب کے احکامات سے آگاہ کیا۔

”کہ کیا کیا مطلب ہے۔۔۔ یار منشی صاحب مذاق نہ کرو یار۔ میں تو بڑے کمزور دل کا آدمی ہوں۔ تم جانتے ہی ہو۔“

اُس نے حوالدار منشی سے دھڑکتے دل سے کہا۔

”یہ تو تجھے شام کو پتہ لگے گا جب بڑے صاحب کے سامنے پیش ہو گے۔ اگر اس سے پہلے تمہارے دل کی حرکت بند نہ ہو گئی ہوئی تو۔۔۔“

منشی نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکا دی۔

○

بشیر ماچھی کا دل ڈوبنے لگا تھا وہ انہی قدموں پر دھڑکتے دل کے ساتھ بلبل شاہ

کے کمرے میں جا پہنچا۔

”شاہ جی۔۔۔ یہ منشی صاحب۔۔۔“

اُس نے کچھ کہنا چاہا۔

”کیا ہوا منشی صاحب کو۔۔۔؟“

بلبل شاہ نے بڑی بے اعتنائی سے اس کی بات کاٹ دی۔ اور بشیر ماچھی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

”میرا مطلب ہے جناب ایس پی صاحب کا حکم۔۔۔“

بشیر ماچھی نے تھوک حلق میں نگلتے ہوئے کہا۔

”میں کیا کروں ایس پی صاحب کی مرضی۔ اگر تم حرام کاریاں کرو گے تو اس کی سزا میں تو نہیں بھگت سکتا۔ تم نے کوئی معمولی جرم تو نہیں کیا۔“

بلبل شاہ اس بے رخی سے بات کر رہا تھا جیسے زندگی میں اُن کی پہلی ملاقات ہوئی ہو.....

”لیکن شاہ جی آپ نے تو...“

”کیا میں نے۔۔۔ میں نے کیا ادے۔۔۔ کیا بکواس کر رہے ہو۔ چپ چاپ بیرک میں چلے جاؤ ورنہ ابھی حوالات میں بند کروا دوں گا۔۔۔ اور ہاں خبردار اگر سٹاف سے باہر قدم رکھا۔۔۔ ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گا۔“

بلبل شاہ نے اُس کی بات کاٹ کر اُسے بری طرح ڈانٹ دیا۔

اب بشیر ماچھی کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔

وہ جان گیا کہ بلبل شاہ نے اُسے بیوقوف بنا کر دراصل اُس کے اور حاجی کے درمیان تعلق تلاش کیا ہے تاکہ اس بات کا علم ہو سکے کہ کس نے حاجی کا پیغام باہر پہنچایا ہے۔ یقیناً یہ ڈیوٹی بھی اُسے ایس پی نے سونپی ہو گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشیر ماچھی ڈگمگاتے قدموں سے بیرک تک پہنچا اور اپنے بستر پر بے دام سا ہو کر لیٹ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایس پی صاحب کا سامنا کیسے کرے گا، یہ تو بڑا سخت افسر تھا۔ خدا جانے اُس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔

دوپہر کے بعد بشیر ماچھی نے سٹاف کی عمارت سے باہر کسی کھوکھے پر جا کر چائے پینے کی نیت سے جب عمارت سے باہر جانا چاہا تو مین گیٹ ڈیوٹی پر گارڈ نے اُسے روک لیا۔

"ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ ان کی ملاقات سے پہلے تمہیں باہر نہ جانے دیا جائے۔"

استفسار پر گارڈ نے بتایا۔

"یہ تو غیر قانونی بات ہے ——— میں آخر...."

اُس نے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور واپس اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

اب اُسے غصہ بھی آنے لگا تھا۔

بُلبل شاہ نے اُسے اچھا خاصا بے وقوف بنایا تھا اور اب اُسے ذلیل بھی کر رہا تھا۔ نادیہی سزا اُس کے لیے کوئی انوکھی شے نہیں تھی اُس نے اپنی آدھی سے زیادہ ملازمت پولیس لائن ہی میں متعدد مرتبہ "لائن حاضر" ہونے کی سزا پا کر گزاری تھی۔

لیکن ———

اس طرح اپنے ہی کسی پیٹی بند بھائی کی طرف سے وہ دھوکے کی چال میں پہلی مرتبہ پھنسا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بُلبل شاہ کی بوٹیاں نوچ لے لیکن وہ ایسا سوچ ہی سکتا تھا۔ اگر اس کے اس ارادے کا بھی بُلبل شاہ کو علم ہو جاتا تو وہ بشیر ماچھی کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیتا۔

شام تک کا وقت اُس نے نہایت بے بسی، غصے اور خوف کے ملے جلے جذبات

کے عالم میں گزارا۔

شام پانچ بجے بالآخر ایس پی صاحب تشریف لائے اور آتے ہی اُسے اپنے حضور طلب کیا۔

بشیر ماچھی اپنی وردی میں کر پیش ہوا اور ایس پی صاحب نے دو تین سوالات کر کے ہی اُس کے دماغی بخیے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ انہوں نے بشیر ماچھی کو اپنے منہ سے اپنے جرم کا اقرار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیکن ———

بشیر ماچھی نے جرأت سے کام لے کر اتنا ضرور کہا تھا کہ اس نے ملزم کا پیغام اس کے گھر والوں تک پہنچا کر کوئی جرم نہیں کیا جس پر ایس پی صاحب نے منشی حوالدار کو اپنے پاس طلب کر کے اس کے خلاف خیانت مجرمانہ کا مقدمہ درج کر کے اُسے حوالات میں بند کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

"صبح اسے جیل پہنچا دینا۔ یہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ ہماری حراست میں رہے ——— میں دیکھوں گا اس مرتبہ اس کی ضمانت کیسے ہوتی ہے اور کون اس کی جان بخشی کرواتا ہے۔"

ایس پی سلیم باجوہ نے غصے سے کھولتے ہوئے منشی حوالدار کو حکم دیا جس نے کمرے کا دروازہ کھول کر ہتھکڑی لانے کا حکم جاری کر دیا تھا۔

ایس پی صاحب کے سامنے اُس کی ٹوپی اور بیلٹ واپس لے کر اُسے ہتھکڑی لگائی گئی اور بُلبل شاہ کی معیت میں سٹاف کی ساری عمارت کا چکر لگوا کر اُسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

بشیرے ماچھی کا دماغ غصے سے پھٹنے لگا تھا۔

اس کی اتنی بے عزتی آج تک نہیں ہوئی تھی۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے شرمندگی محسوس کی تھی۔۔۔ اس کے اپنے پنچی بند بھائیوں کے سامنے جان بوجھ کر بلبل شاہ نے ہتھکڑی سمیت اس کی نمائش کی تھی۔

بشیرے ماچھی کی ہتھکڑیاں کھول کر اُسے لاک اپ میں بند کر دیا تھا۔

"بلبل شاہ ۔۔۔"

بالآخر وہ پھٹ پڑا جب بلبل شاہ نے اُس پر لعنت بھیج کر حوالات کا تالا بند کیا تھا۔

"میرا نام بھی بشیر ماچھی ہے۔ اگر اس بے عزتی کا بدلہ نہ لیا تو مجھے کسی ماچھن کا جنا نہ کہنا۔"

اس نے بمشکل اپنے منہ میں بند مغلظات کے طوفان کو باندھا تھا کیونکہ ہوش مند وہ بھی تھا اور جانتا تھا کہ اگر اُس نے بلبل شاہ کو گالی دے دی تو پھر اس کی ہڈی پسلی ابھی برابر ہو جائے گی۔

"شٹ اپ۔"

بلبل شاہ نے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر کر چل دیا۔

صبح جب اُسے مقامی مجسٹریٹ سے ریمانڈ لے کر جیل بھیجا گیا تو جیل کے دروازے میں داخل ہوتے ہی بشیر ماچھی نے جیل ہسپتال کا رُخ کیا تھا۔

ہسپتال کے دروازے پر موجود پہریداروں کے لیے اتنا سُننا ہی کافی تھا کہ وہ "حاجی صاحب" کا آدمی ہے۔ جو یہاں ہسپتال میں بی کلاس حوالاتی کی حیثیت سے گلچھرے اُڑا رہے تھے۔

"اوئے بشیرے تو کہاں اوئے۔"

حاجی صاحب نے جن کی ٹانگیں دو قیدی دبا رہے تھے اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"حاجی صاحب۔"

جواب میں بشیرا ماچھی ٹسوے بہاتا حاجی صاحب کے قدموں سے لپٹ گیا۔ وہ کسی خارش زدہ کتے کی طرح ان کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔

"اوئے کیا ہوا کیوں مر رہا ہے۔ کچھ بولے گا بھی۔"

حاجی صاحب نے بمشکل اپنے پاؤں ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

بشیرا ماچھی کو اس بات کا علم تھا کہ "خاندانی بدمعاشوں" کی طرح حاجی صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے ساتھ کسی بھی مرحلے پر احسان کرنے والے کو کبھی نہیں بھولتے تھے جس طرح وہ اپنے کسی احسان فراموش کو کسی قیمت پر معاف نہیں کرتے تھے۔

"حاجی صاحب خدا بیڑہ غرق کرے اُس بلبل شاہ کا جس نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ اُس نے آپ کے ساتھ نیکی کرنے کا مجھے یہ انعام دلایا ہے۔"

اتنا کہہ کر اُس نے پھر مکاری سے ٹسوے بہانے شروع کیے اور حاجی صاحب کو روتے ہوئے اپنے ساتھ ظلم و ستم کی کہانی سُنادی جس میں حاجی صاحب پر یہ ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی کہ اُس کے حکم کی تعمیل کی وجہ سے اُسے نہ صرف اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں بلکہ زندگی میں پہلی مرتبہ جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی ہے۔ اور اس سب کچھ کا ذمہ دار بلبل شاہ ہے۔

"بشیرے فکر نہ کر۔ تیری ضمانت ہو جائے گی۔ میں اپنے دوستوں کا احسان نہیں رکھتا اور اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ بلبل شاہ کا انجام اتنا بھیانک ہوگا کہ وہ پولیس کے محکمے کے لیے مثال بن جائے گا۔"

اُس کی گریہ زاری کے خاتمے پر حاجی نے کہا۔

"حاجی صاحب خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ہم غریبوں کی دعائیں ہمیشہ آپ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ رہیں گی۔"

اُس نے دوبارہ حاجی صاحب کے قدموں کو چھوا۔

"جاؤ موج میلہ کرو ـــــ پرسوں تمہاری ضمانت ہو جائے گی۔"

حاجی نے اُسے کہا اور ایک پہرے دار اُسے لے کر باہر چلا گیا۔

بشیر ماچھی کی "گنتی" حاجی صاحب نے ہسپتال میں ڈلوا دی تھی۔ تیسرے روز انہوں نے جو کہا تھا وہ کر کے دکھا دیا۔ پولیس کے وکیل کی تمام دلیلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جج نے کہا تھا کہ پولیس کے الزام کو اگر صحیح بھی تصور کر لیا جائے تو بھی بادی النظر میں بشیر ماچھی نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جو قابلِ ضمانت نہ ہو۔ وہ رہا ہونے کے بعد بھی پولیس کی تفتیش پر اثر انداز ہونے کی قوت نہیں رکھتا۔

بُلبل شاہ

ریجنٹ پارک کے جس گوشے میں وہ تنویر سے ملا کرتی تھی وہ قدرے ویران رہتا تھا اور دوپہر کے اس عالم میں جب گرمیوں کی دھوپ سے لوگوں کے بدن جھلسنے لگتے تھے وہاں دور دور تک کسی ذی ہوش کا نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بڑے اعتماد سے وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ اور اب تنویر کی منتظر تھی۔ وہ بہر حال ایک اعلیٰ پولیس افسر کی بیٹی تھی اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا بھی جانتی تھی۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر تنویر نے اُسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو اسے یہیں گولی مار کر ڈھیر کر دے گی۔ کم از کم اپنی زندگی کے اس تاریک رُخ سے وہ جیتے جی اپنے والدین کو آگاہ ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

حال ہی میں وہ جس عذاب سے گزری تھی اس نے پہلے ہی اس کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کی زندگی بھی جہنم بنا کر رکھ دی تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے اُس کی ڈاکٹر آنٹی کا جس نے اُسے دوبارہ جنم دیا تھا۔

اور اب جبکہ اس نے موت کے صحرا کو عبور کر لیا تھا تو تنویر کسی بدروح کی طرح اپنے تابوت کا ڈھکن اٹھا کر اس کی رگوں میں دانت گاڑنے آ گیا تھا۔

تنویر اُسے حسبِ معمول ایک گھنے درخت کے نیچے رکھے بنچ پر سر جھکائے بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات ایسے بنا رکھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے جیسے ابھی ابھی اپنے کسی انتہائی عزیز کو قبرستان میں سپردِ خاک کر کے واپس آیا ہو۔

"کیا بات ہے؟"

فاخرہ نے اس سے بڑے اکھڑے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

"فاخرہ مجھے بے حد افسوس ہے کہ تمہیں اس طرح بلایا لیکن میں تمہیں حلفاً یہ بات کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارا دشمن نہیں نہ ہی تمہارا بُرا چاہتا ہوں۔ مجھے تو جلد یا بدیر مرنا ہی ہے لیکن تم بے موت کیوں ماری جاؤ ——— فاخرہ میرے ساتھ تمہاری طرح بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے ———؟"

اُس نے ٹسوے بہانے شروع کیے۔

فاخرہ ایک منٹ کے لیے تو سوچ میں پڑ گئی۔

"تنویر میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی ہے؟"

اُس نے دوبارہ سنبھل کر اپنے لہجے کی درشتی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم بتاتے ہیں بی بی ——— یہ بے چارہ کیا بتائے گا ———"

اُسے اپنی پشت پر آواز سنائی دی اور جیسے ہی فاخرہ نے اس طرف نظر گھمائی اس کے منہ پر ایک مضبوط ہاتھ جم گیا۔ جب کہ دوسرے چاروں ہاتھوں نے اس کی قوتِ مزاحمت کو اس وقت تک قابو کیے رکھا جب تک کہ وہ بے ہوش نہیں ہو گئی۔

خدا جانے وہ لوگ یہاں تک کار کس طرح لے آئے تھے۔

بے ہوش فاخرہ کو انہوں نے کار کی پچھلی سیٹ پر پھینکا تنویر اس کے ساتھ اس طرح بیٹھ گیا جیسے کسی بیمار کے ساتھ بیٹھا جاتا ہے۔ دونوں حملہ آوروں نے

اگلی سیٹیں سنبھالیں اور گاڑی چل دی۔

ویران اور شدید گرمی کی وجہ سے سنسان پارک میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ یہاں کیا قیامت گزر گئی ہے۔

ریجنٹ پارک سے ملحقہ شہر کی انتہائی جدید آبادی کے ایک بڑے شاندار بنگلے کے دروازے پر پہنچ کر گاڑی رُکی اور دروازہ کھل گیا۔

بے ہوش فاخرہ سمیت وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے فاخرہ کو ڈنڈا ڈولی کر کے ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا۔ جو اس بنگلے کے بیسمنٹ میں بنایا گیا تھا ——— جہاں سے فاخرہ کی آواز باہر جانے کا بھی کوئی چانس باقی نہیں بچتا تھا۔

فاخرہ کو ہوش آیا تو ایک درمیانی عمر کی فاحشہ اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔

اُس نے لاشعوری طور پر پہلے اپنے اردگرد کا جائزہ لے کر اپنے سرہانے موجود تپائی سے اپنا ہینڈ بیگ جھپٹ کر اُٹھایا پھر اُسے وہ عورت دکھائی دی جو اس کے سرہانے کھڑی تھی۔

"مم میں کہاں ہوں ——— تم کون ہو؟"

اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہوش آ گیا میری نورانی کو ———"

عورت نے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا۔

دوسرے ہی لمحے فاخرہ کو سمجھ آ گئی کہ وہ کہاں ہے ———؟

اُس کے حواس بحال ہوتے ہی اُسے بھولی ہوئی کہانی یاد آ گئی۔ اُسے یاد آ گیا کہ آخری لمحات میں کسی نے اس کے منہ پر بھیگا ہوا رومال رکھ کر اس کا منہ زور سے بند کیا تھا ——— اس کے بعد شاید وہ بے ہوش ہو گئی تھی ———

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا مطلب یہی تھا کہ اُن لوگوں نے سارا کھڑاگ صرف اُسے اغوا کرنے کے لیے پھیلایا تھا۔

اُس نے گھبراہٹ اور غصے کی حالت میں اپنے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اپنا ہینڈ بیگ اُٹھا کر فاخرہ نے بڑی تیزی سے کھولا جس میں باقی سب کچھ موجود تھا لیکن پستول اس میں سے غائب تھا۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ تو اُس کے والد کا سرکاری پستول تھا۔ اس دوران وہاں موجود حرافہ بڑی دلچسپی سے اُس کی حرکات کا جائزہ لیتی رہی۔

"کچھ کم ہے کیا اُس میں؟"

اُس نے فاخرہ کی بے بسی کا مذاق اُڑایا۔۔۔

"دیکھو تم لوگ جو کوئی بھی ہو۔ تم... تم مجھے کیوں یہاں لائے ہو؟"

غصے اور خوف کے ملے جلے جذبات سے اُس نے چلاتے ہوئے کہا۔ اپنی بات کہنے کے لیے اُسے ڈھنگ کے الفاظ بھی میسر نہیں آرہے تھے۔

"ہمیں تم سے محبت ہوگئی ہے ۔۔۔ تمہیں بلایا تھا تو تم آئی نہیں، اس لیے خود لے آئے۔"

عورت نے اس کی طرف بڑی گمراہ نظروں سے دیکھتے ہوئے فاحشاؤں کی طرح آنکھ دبائی۔۔۔

اس عورت کی ان حرکات اور انداز سے فاخرہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ اسے اپنے دماغ کی رگیں کھنچنے کا احساس ہونے لگا تھا۔ یہ تو کوئی وحشی قسم کے لوگ دکھائی دے رہے تھے جو اپنے شکار کی بے بسی کا مزہ لے کر اپنی کسی حس کو تسکین دینا چاہتے تھے۔

فاخرہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ یہاں تو اُسے اپنے سوالات کے

جوابات بھی ڈھنگ سے نہیں مل رہے تھے۔

اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔

دروازہ شاید باہر سے لاک تھا اسی لیے اندر داخل ہونے والے نے پہلے اس کا لاک باہر سے گھمایا تھا۔

"کون ہو تم ۔۔۔ یہ کیا بکواس ہے۔؟"

فاخرہ نے نووارد کی طرف جو شکل ہی سے کوئی چھٹا ہوا غنڈہ دکھائی دیتا تھا بڑھتے ہوئے غصے سے پوچھا۔

لیکن ۔۔۔

جواب اُس کی توقعات سے بڑھ کر سخت ملا تھا۔

اندر آنے والے نے آگے بڑھتی ہوئی فاخرہ کو اتنی زور سے دھکا دیا تھا کہ وہ دیوار سے ٹکرا کر مسہری پر جا گری۔

یہ ردِعمل اتنا اچانک تھا کہ خوف کے مارے فاخرہ کو اپنی چوٹ کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا ۔۔۔!

عورت کا قہقہہ اچانک بلند ہوا۔

"یہاں سب میرے جیسے شریف لوگ نہیں ہیں مس فاخرہ ۔۔۔ ذرا تمیز سے بات کرو۔"

اُس نے فاخرہ کو جس کے لیے مسہری سے اُٹھنا محال ہو رہا تھا بالوں سے پکڑ کر اس طرح جھٹکا دیا کہ بے ساختہ اُس کی چیخ نکل گئی اور وہ یوں اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے اُسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

غصے اور تکلیف کے احساس سے چیختے ہوئے اُس نے عورت کی طرف بڑھنا چاہا جس نے اچانک ایک طرف ہٹتے ہوئے تجربہ کار کھلاڑیوں کی طرح اس کے ایک بازو کو جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا اور دوسرے ہی لمحے بے بس کر کے سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پلنگ پر دوبارہ پھینک دیا۔

"لڑکی یہ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے۔ ہوش میں رہو۔ ہمیں مجبور نہ کرو کہ پہلے تمہیں تمہاری حیثیت کا احساس دلائیں۔"

اس مرتبہ اندر آنے والے مرد نے کہا جو شکل ہی سے کوئی درندہ دکھائی دے رہا تھا اور بظاہر اس تمام صورتِ حال سے لاتعلق کھڑکی کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

فاخرہ نے بے بسی سے روتے ہوئے کہا۔

"یہ ہوئی ناں بات۔ فی الوقت تو ہم صرف یہ چاہیں گے کہ تم اپنے والد کو یہ بتا دو کہ تم ہمارے قبضے میں ہو اور اگر اُسے تمہاری جان عزیز ہے یا تم سے محبت ہے تو وہ ہماری بات مان لے۔ بصورت دیگر ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے لیکن تمہیں عبرت کا نمونہ بنا کر سڑک پر پھینک دیں گے —— جہاں تمام اخبارات کے فوٹوگرافر تمہارے منتظر ہوں گے اور تم شراب کے نشے میں دھت نیم برہنہ حالت میں اُن کے کیمروں کی فلیش لائٹ کے سامنے اور تمہارا باپ..."

اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس بات کا احساس تو فاخرہ کو بخوبی ہو چکا تھا کہ یہ لوگ معمولی اٹھائی گیرے نہیں نا ہی انہیں اس کے عوض دولت حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی ہے کہ اُسے یرغمال بنا کر رکھیں شاید یہ اُس کے والد سے کچھ اور ہی چاہتے تھے۔ کوئی ایسا ناجائز کام جس کے لیے انہیں پولیس افسر کی بیٹی کو اغوا کرنا پڑا۔

"تم مجھے کیا کرنا ہوگا ——؟"

تکلیف کے احساس پر اب خوف غلبہ پانے لگا تھا۔

"اپنے باپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ وہ ہماری بات مان لے۔ اُسے یقین دلا

دو کہ اگر اس نے ہماری بات نہ مانی تو ہم اُسے برباد کر دیں گے اور تمہارے باپ کے لیے سوائے خودکشی کے کوئی راستہ باقی نہ رہ جائے گا —— سمجھی تم؟"

اس آدمی نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے فاخرہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

انہوں نے فاخرہ کے نارمل ہونے کا انتظار کیا تھا اور اب اُس کے کمرے میں ایک ٹیلی فون آ گیا تھا۔ فاخرہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس ٹیلی فون پر کہیں بھی فون نمبر کی سلپ نہیں لگی —— تاکہ وہ نمبر بھی یاد نہ رکھ سکے اور جگہ کا تو اُسے علم ہی نہیں تھا۔

"میری بات سمجھ آ گئی ناں ——"

یہاں موجود اُس شخص نے دوبارہ فاخرہ کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"ہاں۔ ہاں۔"

فاخرہ کی حالت خوفزدہ مرغی جیسی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے اندر ہی خود کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

"شاباش —— بڑی اچھی بچی ہے۔ ہمارا کہنا ضرور مانے گی۔"

اس مرتبہ اس حرافہ نے فاخرہ کو مخاطب کیا تھا۔

"یہ لو فون تمہارا باپ لائن پہ آ رہا ہے ——"

اس نے کمرے کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر کوئی نمبر ملایا تھا اور اب فون اُسے تھما دیا تھا۔ فاخرہ نے اندازہ کر لیا کہ دوسری طرف نہ تو اُس کے گھر کا نمبر ملایا گیا تھا نہ ہی اُس کے والد کے آفس کا —— شاید ان لوگوں نے فون ٹیپ ہونے کے خطرے کو نظرانداز نہیں کیا تھا اور کسی ایسی جگہ فون کیا تھا جہاں اس وقت اس کے والد موجود تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہیلو ــــ"

دوسری طرف سے اپنے باپ کی بھاری بھرکم آواز اُس نے پہچان لی۔

"ابو ــــ"

وہ بچوں کی طرف پھوٹ پڑی۔

"کیا بات ہے بیٹی تم کہاں ہو۔ حوصلہ کرو۔ شاباش گھبراؤ نہیں۔ شاباش"

دوسری طرف سے ایس پی صاحب نے اُسے تسلی دینا چاہی۔

"ابو! یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔ اگر آپ نے ان کی بات نہ مانی تو یہ بڑا گھناؤنا انتقام لیں گے۔ ابو یہ ہم سب کو برباد کر دیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

اچانک ہی فون اُس کے ہاتھ سے کمرے میں موجود درندے نے جھپٹ لیا تھا۔

"جی ایس ایس پی صاحب ــــ اُمید ہے آپ کو ہماری بات سمجھ آ گئی ہو گی۔ ایک بات کا خیال رہے کہ یہ ہمارا پہلا اور آخری رابطہ ہے۔ ہم ۴۸ گھنٹے انتظار کریں گے۔ جس کے بعد تمہاری بیٹی تمہیں زندہ ضرور مل جائے گی لیکن اس حالت میں کہ شاید تم میں سے کوئی پھر جی نہ پائے ــــ میری بات غور سے سنو ــــ ہمارا اس کے سوا کوئی مطالبہ نہیں کہ تم حاجی صاحب کی تفتیش تبدیل کر دو ــــ اس کے لیے کسی تردد کی ضرورت بھی نہیں ــــ پریس اور عوام نے مسئلے کو پہلے ہی سر پہ اُٹھا رکھا ہے تم آسانی باجوہ کو جانبدار قرار دے سکتے ہو ــــ تفتیش اپنے ہاتھ میں لو یا کسی اور کے ہاتھ میں دو ــــ حاجی صاحب کو بے گناہ قرار پانا چاہیے ــــ سمجھ گئے ناں ــــ اور ہاں یہ ہمارا پہلا اور آخری رابطہ ہے ــــ وقت دیکھ لو ــــ شام کے تین بجے ہیں۔ پرسوں شام تین بجے تک ہمیں علم ہو جانا چاہیے۔"

ورنہ.....؟

"ہیلو ــ ہیلو ــــ دیکھو میری بات سنو ــــ"

ایس ایس پی صاحب کہتے رہ گئے۔

لیکن ــــ

دوسری طرف سے رابطہ کٹ گیا۔

بڑے مکار مجرم تھے۔ اُن کی توقعات سے بڑھ کر خطرناک۔ اُن کی بیگم نے فاخرہ کے گھر سے اچانک غائب ہو جانے کی اطلاع تو فون پہ دی تھی لیکن اس کے اغوا کا معمولی سا خدشہ بھی ظاہر نہیں کیا تھا۔

کیا فاخرہ حاجی کے گینگ کے ہاتھ لگ گئی ہے؟

حاجی جیل میں بند تھا۔

اُس کا ریمانڈ لینا ہی کا ردِعمل ہوتا۔ ایس ایس پی صاحب کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کریں۔ ایک بات کا تو اُنہیں ایمان کی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ پریس میں حاجی کے زر خرید ٹٹو موجود ہیں جنہوں نے اُس مسئلے کو ہوا دے کر اُسے خوامخواہ میں ہیرو بنا رکھا ہے اور یہ لوگ اب بھی اُس سے ہر مرحلے پہ تعاون کریں گے۔ کیونکہ اُن کے لیے پولیس یا قانون سے زیادہ وہ پیسہ اہم تھا جو اُن خدمات کے صلے میں حاجی صاحب کی طرف سے انہیں ملتا آیا تھا اور آئندہ ملتا رہتا۔

اگر وہ حاجی پہ "آف دی ریکارڈ" دباؤ ڈالتے تو بھی اُن لوگوں کو خبر ہو جاتی اور خدانخواستہ وہ ان کی بیٹی....

اس سے آگے سوچنے کی ہمت اُن میں نہیں تھی۔

ایس ایس پی خان صاحب کا شمار بڑے دلیر اور بہادر پولیس افسران میں

وَن اُردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ اتنے سمارٹ تھے کہ عام پولیس آفیسر اُن کے سامنے زیادہ عمر کے دکھائی دیتے تھے۔

لیکن ـــــ

جس منجدھار میں انہیں حالات نے لا کر پھینک دیا تھا اس سے نکلنے کا سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ مجرموں کے حکم پر عمل کرتے ہوئے حاجی کی تفتیش بدل دیں بصورتِ دیگر ایک ذلت آمیز موت اُن پر مسلط ہو جاتی۔

"اُف میرے خدایا ـــــ میں تو اس کی ماں کو بیٹی کے اغوا کی خبر بھی نہیں دے سکتا۔"

انہیں جو کچھ بھی کرنا تھا خود ہی کرنا تھا اور جلدی۔ جتنی زیادہ دیر اُن کی بیٹی ان موذیوں کے قبضے میں رہتی اتنی زیادہ اذیت سے انہیں دوچار ہونا پڑتا۔

یہی سوچتے ہوئے انہوں نے اپنے دفتر کا رُخ کیا۔

جہاں یہ پیغام موجود تھا کہ گھر سے اب تک چار مرتبہ فون آ چکا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے گھر فون کر کے اپنی بیوی کو مطمئن کیا۔

بیگم صاحبہ نے اپنے خاوند کے اطمینان دلانے کے انداز ہی سے اندازہ کر لیا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

لیکن ـــــ

اگر ایسا کچھ ہو بھی گیا تھا تو سوائے وہ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنے کے اور کیا کر سکتے تھے۔

بیگم صاحبہ کو دل ڈوبنے کا احساس ہو رہا تھا۔ اگر فاخرہ کے ساتھ کچھ بھی حادثہ گزرا تو اُس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ خاوند کو تو سرکاری کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی ـــــ بچوں کی تربیت میں کوتاہی کی ذمہ داری سراسر

اُن کے سر عاید ہوتی تھی۔ انہوں نے تو ابھی تک اپنے خاوند کو بیٹی کے کرتوت سے آگاہ نہیں کیا تھا اور بڑی کامیابی سے رازداری کے ساتھ بیٹی کا علاج بھی کروا لیا تھا۔

اس درمیان ایک ایک پل انہوں نے پیچیدہ اور جان لیوا امراض والے مریضوں کی طرح گزارا تھا۔

ہر لمحے اُن کے دل کو یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں خانصاحب کو اس بات کی بھنک نہ پڑ جائے۔ انہوں نے ساری زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے خاوند سے منافقت نہیں کی تھی۔ جھوٹ نہیں بولا تھا اور آج ـــــ اس سے آگے ان کی سوچیں منجمد ہو گئیں۔ وہ لرز کر رہ ہی تو رہ گئیں۔

یا اللہ رحم کر دے۔"

اُن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ انہیں اپنے گلے میں ایک پھانس سی اُترنے کا احساس ہوا۔ اپنے کمرے میں وہ خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی کہ وہی ایک ایسی ذات تھی جو انہیں ان مصائب سے نجات دلا سکتی۔

دیر گئے تک وہ خدا کے حضور سجدہ ریز گڑگڑاتی رہیں۔

لیکن ـــــ

مکافاتِ عمل کا احساس انہیں بھی بہرحال ہو چکا تھا۔ وہ جان گئی تھیں کہ انہوں نے بھی بیٹی کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔ اگر خان صاحب ایک معروف اور بڑے اہم عہدے پر فائز سرکاری افسر تھے تو اولاد کی تربیت کی ذمہ داری اُن کے بعد پھر بیگم صاحبہ ہی کو سنبھالنی تھی۔

انہیں رہ رہ کر اس لمحے پر پچھتاوا ہو رہا تھا جب انہوں نے فاخرہ کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اسے اک ماڈرن کالج میں داخلہ دلوایا اور نہ صرف یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلکہ اُس کی بے جا آمدورفت کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔
کچھ بھی تھا۔ انہیں بہرحال حالات کا مقابلہ صبر اور ہمت سے کرنا تھا کیونکہ اب سوائے اس کے کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔

ایس ایس پی خان صاحب آدھ گھنٹہ تک اپنے کمرے میں بے چینی سے کبھی اُٹھ کر ٹہلتے اور پھر بیٹھ جاتے۔ بالآخر وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ انہیں فی الوقت ملزموں کی ضد کے سامنے ہتھیار پھینکنے ہی پڑیں گے البتہ مستقبل میں وہ اس زیادتی کا ازالہ ضرور کر لیں گے۔

یہ سوچتے ہوئے انہوں نے ڈی آئی جی صاحب کا نمبر ملایا۔

"یس" ــــ

دوسری لائن پر ڈی آئی جی صاحب موجود تھے۔

"سر ــــ باجوہ کے مسئلے پر دباؤ بہت بڑھ رہا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ گزشتہ ہفتے دو تین واقعات بدقسمتی سے رونما ہوئے ہیں اور ہماری پوزیشن پہلے ہی بہت خراب ہے۔ میرے خیال سے ہمیں صورتِ حال کو مزید بگڑنے سے روکنا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں جناب کہ انتخابات سر پہ ہیں اور حکومت کی طرف سے بہت دباؤ آ رہا ہے ــــ وہ لوگ بہرصورت امن و امان چاہتے ہیں۔"

انہوں نے بات بڑھائی۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے خان صاحب لیکن اس طرح تو یہ غنڈے جب چاہیں گے اپنی بات منوا لیا کریں گے۔ اس ملک کے صحافیوں کو خریدنا تو اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن کر رہ گیا ہے۔"

ڈی آئی جی صاحب نے تشویش ظاہر کی۔

"مجھے احساس ہے سر ــــ لیکن فی الوقت ہمیں مصلحت ہی سے کام لینا ہوگا۔

اگر ان بدمعاشوں نے جلوسوں کا سلسلہ شروع کروا دیا تو صورتِ حال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ ہمارے پاس فورس کی کیا پوزیشن ہے۔ آپ اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اور پھر جناب ہم کوئی اس بدمعاش کو رہا کرنے تو نہیں جا رہے۔ تفتیش ہی بدلنی ہے کسی دوسرے افسر کو دے دیتے ہیں۔ آخر کرائم برانچ بھی پولیس ہی کا حصہ ہے۔"

خان صاحب نے اُمید دلائی۔

"ہوں ں ں ــــ"

ڈی آئی جی صاحب شاید کسی سوچ میں ڈوبے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں شاید باجوہ کے سامنے ممکنہ شرمندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔

لیکن ــــ

اُن کے کندھوں پر بڑی ذمہ داری کا بوجھ تھا۔ انہیں پورے ضلع میں امن و امان قائم رکھنا تھا۔ یہ کمبخت ڈرگ مافیا کے لوگ تھے جو اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر طوفان کھڑا کر سکتے تھے۔

ملک میں پہلے ہی سیاسی انارکی بڑھ رہی تھی اور پولیس کی آدھی سے زیادہ نفری اپوزیشن اور حکومت کے لیڈروں کی حفاظت پر مامور تھی۔ ان حالات میں وہ ملک کے اس سب سے بڑے اور اہم شہر میں اچانک سر اُٹھانے والے سیلاب کے سامنے کیسے بند باندھ سکتے تھے۔

خان صاحب کی بات میں دلیل تو موجود تھی۔ پھر یوں بھی انہوں نے کوئی حاجی کو رہا کرنے کا مشورہ تو نہیں دیا تھا۔ صرف یہی کہا تھا کہ انہیں تفتیش بدلنی ہے اور کچھ نہیں کرنا۔

آخر تفتیش بھی پولیس نے ہی کرنی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میرے خیال سے یہی مناسب رہے گا۔ تم کسی ایماندار افسر کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیس ریفر کر دو۔"

ڈی آئی جی صاحب نے بالآخر سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"جنابِ والا ــــ میں ڈی آئی جی سپیشل برانچ کو یہ ذمہ داری سونپتا ہوں وہ اپنے لوگوں کو زیادہ بہتر جانتے ہوں گے۔"

خان صاحب نے اس مرحلے پر بھی مستقبل کے خدشات کو نظر انداز نہیں کیا تھا اور بندر کی بلا اپنی دانست میں طویلے کے سر منڈھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اُسی روز شام کے بعد پولیس کے ترجمان نے ایک بیان جاری کر دیا جس میں کہا گیا کہ پولیس نے عوامی مطالبہ مانتے ہوئے ملزم حاجی محمد دین کی تفتیش اس کے وکلا کی خواہش پر سپیشل برانچ کو سونپ دی ہے۔

لیکن ــــ

پولیس کے ترجمان نے بھی اس مرحلے پر تفتیشی افسر کا نام بتانے سے معذوری ظاہر کی اور یہی کہا کہ یہ کوئی ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں جس کا علم بعد میں پریس کو نہ ہونے پائے۔

○

اے ایس آئی بلبل شاہ معمول کے مطابق ہی رات گئے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ رات کا ایک پہر ڈھل چکا تھا۔ اس کی ڈیوٹی تو رات دس بجے ختم ہو گئی تھی لیکن اگلے روز چونکہ اس کا "ریسٹ" تھا اس لیے اُسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ میں معمول سے کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا تھا۔

اُس نے حال ہی میں پولیس لائن سے کچھ فاصلے پر ایک آبادی میں کرائے کا مکان لیا تھا اور اپنے بچوں کو شہر بلانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

بلبل شاہ عموماً یہاں سے پیدل اپنے گھر جایا کرتا تھا۔ تین چار کلومیٹر اس کے لیے کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ اُسے یوں بھی صبح اُٹھ کر پانچ سات میل دوڑ لگانی ہوتی تھی۔

لیکن ــــ

آج وہ دیر ہو جانے کی وجہ سے اپنے ایک ساتھی کی سائیکل مستعار لے آیا تھا کیونکہ گھر پر اس کا ایک عزیز گاؤں سے آیا ہوا تھا جس کے ساتھ اگلے روز اُسے کسی کام سے بھی جانا تھا۔ اس خیال کے پیش نظر کہ کہیں وہ اکیلا پریشان نہ ہو رہا ہو۔ بلبل شاہ نے سائیکل سنبھال لی تھی۔

سی آئی اے سٹاف کی عمارت سے کچھ فاصلے پر واقع ایک سٹور کے سامنے موجود کار میں بیٹھے ایک نوجوان نے جیسے ہی اُسے سڑک کے اس طرف آتے دیکھا اس کی باچھیں کھل اُٹھیں اُس نے اپنے پہلو میں رکھے سیلولر فون پر ایک نمبر ملایا اور دوسری طرف سے "ہیلو" کی آواز سن کر صرف دو الفاظ ادا کیے۔

"چل پڑا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس نوجوان نے جو شکل ہی سے کوئی تیسرے درجے کا غنڈہ دکھائی دے رہا تھا جس شخص کا نمبر ملایا تھا وہ بھی کوئی کار سوار تھا۔

لیکن ــــ

وہ کار میں اکیلا نہیں تھا۔

اُس کے ساتھ کار میں تین مسلح بدمعاش موجود تھے۔ انہوں نے سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک قدرے محفوظ کنج میں گاڑی کھڑی کی ہوئی تھی۔ یہ کوئی معروف شاہراہ تو تھی نہیں۔ عام سا راستہ تھا جو مافوق آبادیوں میں سے گزر کر نواحی بستی کی طرف جاتا تھا۔ جہاں بلبل شاہ نے کرائے کا مکان لیا تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سڑک پہ کبھی کبھی کوئی اِکا دُکا گاڑی ہی گزرتی تھی۔

سردیوں کی طویل رات نے سارے ماحول کو منجمد کر رکھا تھا۔ آج سردی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی اور بُلبل شاہ کو بھی اپنی ہڈیاں ٹھٹھرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس نے سائیکل کے پیڈل تیز گھمانے شروع کر دیئے۔ اس طرح وہ شاید لاشعوری طور پر اپنے جسم کو گرم رکھنا چاہتا تھا۔

بُلبل شاہ نے اپنے گھر کی طرف جانے والا قریباً نصف فاصلہ طے کر لیا تھا اور اب وہ اس سڑک کی طرف گھوم رہا تھا جو نواحی بستی کو جاتی تھی۔

اچانک ہی درختوں کے جھنڈ سے کار نمودار ہوئی جس کے ڈرائیور نے بُلبل شاہ کو پیچھے سے ٹکر ماری اور وہ سائیکل سمیت سڑک پر قلابازیاں کھانے لگا۔ گرتے گرتے بُلبل شاہ کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ ٹکر جان بوجھ کر ماری گئی ہے۔ اُس کے زمین سے اُٹھنے سے پہلے ہی تین بندوقوں کی نالیاں اُس کی طرف تن گئیں۔

"اُٹھ اوئے۔ کھڑا ہو جا ــــ"

اُس کے پہلو میں ایک بدمعاش نے زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

بُلبل شاہ کو ابھی تک اپنا سر گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک گرنے سے اُس کی کمر میں زبردست چوٹ آئی تھی لیکن اُس کے حواس ابھی قائم تھے۔ اُس کا جی تو چاہتا تھا کہ ان کی بوٹیاں نوچ لے۔

لیکن ــــ

اپنی طرف اُٹھی کلاشنکوف کی نالیوں نے اس کا دماغ ٹھنڈا کر دیا۔

جیسے ہی بُلبل شاہ اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ ایک بدمعاش نے اُس کے پہلو میں موجود ہولسٹر سے سرکاری ریوالور نکال کر اپنے قبضے میں لے لیا۔

اس دوران وہ کار بھی وہاں آ گئی تھی جس میں اکیلا بدمعاش موجود تھا۔ اُس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق گاڑی کھڑی کی اور اس کا اگلا دروازہ کھول دیا لڑکھڑاتے ہوئے بُلبل شاہ کو انہوں نے دھکا دیا اور اگلی سیٹ پر پھینک دیا۔ تینوں مسلح غنڈے پچھلی سیٹ پہ بیٹھ گئے۔

اچانک ہی بُلبل شاہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

گاڑی کی پچھلی سیٹ پر موجود کسی تربیت یافتہ غنڈے نے شاید اس کی کنپٹی پر ضرب لگائی تھی۔ اُس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

بُلبل شاہ کی آنکھیں شاید ہوش دلانے سے ہی کھلی تھیں۔ سب سے پہلے اُسے اپنے جسم سے اُٹھتی درد کی اُن لہروں کا احساس ہوا جنہوں نے اُسے تڑپا کر رکھ دیا۔

لیکن ــــ

اس شدتِ درد پر اب حیرت غالب آنے لگی تھی کیونکہ اُس کے سامنے ملک کا مشہور سمگلر حاجی صاحب تین مسلح غنڈوں کے جھرمٹ میں ایک کرسی پر براجمان تھا۔

بُلبل شاہ کو حیرت اس بات کی تھی کہ حاجی تو جیل میں بند تھا۔ یہاں کیسے آ گیا ــــ؟ پھر اُسے خود ہی ساری بات سمجھ گئی۔ یہ اُس کے محکمے کی کسی کالی بھیڑ کا کانعادن تھا ــــ رات کے اندھیرے میں بُلبل شاہ کا شکار کھیلنے کے لیے اس موذی کو "آف دی ریکارڈ" جیل سے باہر نکالا تھا۔

بُلبل شاہ نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہونا چاہا۔

لیکن ــــ

اُٹھ نہ سکا۔ اُس کی دونوں ٹانگوں کو لوہے کی زنجیر سے جکڑا گیا تھا۔ بُلبل شاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اندازہ کر لیا کہ یہاں مزاحمت کام نہیں آسکے گی۔ اُن لوگوں نے ابھی تک اُسے ایک لمحے کو بھی سنبھلنے کی مہلت نہیں دی تھی۔

"سناؤ بلبل شاہ —— مجھے تو پہچان لیا ہو گا ——

حاجی کی زہریلی پھنکار اُس کے کانوں میں گونجی۔

"تجھے پہچان بھی لیا ہے اور جان بھی لیا ہے کہ تجھ سے گھٹیا اور ذلیل انسان کم از کم اس شہر میں اور کوئی نہیں۔ اگر تجھ میں تھوڑی سی بھی غیرت ہے تو میرے پاؤں کھول دے پھر تجھے تیری اوقات بتاتا ہوں۔"

بلبل شاہ دھاڑا۔

"رسی جل گئی پر بل نہ گئے۔ بلبل شاہ میں نے تجھے کہا تھا ناں کہ تجھے میرے ساتھ گزارے ایک ایک پل کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

حاجی پھر پھنکارا۔

"اگر تجھے زندہ رہنا ہے تو مجھے یہاں سے زندہ نہ جانے دینا حاجی ——
ورنہ یاد رکھنا میں تجھے کتے کی موت مار ڈالوں گا ——"

بلبل شاہ شیر کی طرح گرجا۔

حاجی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ باقی تینوں جانوروں نے بھی اُس کا پورا پورا ساتھ دیا۔

"تو یہاں سے زندہ جائے گا بلبل شاہ —— لیکن محتاج بن کر —— میں تیرے دونوں ہاتھ توڑ دوں گا۔ جن ہاتھوں سے تُو نے میرے بدن کو چھوا تھا۔ میں انہیں تیرے وجود سے الگ کر دوں گا —— تو چیخ چیخ کر دنیا کو بتائے گا کہ تیرے ساتھ کیا ظلم ہوا لیکن میرا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔ کیونکہ میں تو جیل میں بند ہوں۔ کیوں بھئی جوانو!"

حاجی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور تمام شیطان پھر وحشیوں کی

طرح قہقہے لگانے لگے۔

"تم سب کتے کی موت مروگے!"

بلبل شاہ نے دیوانہ وار پاؤں سے اُلجھی زنجیروں سے زور آزمائی شروع کر دی لیکن اُن لوگوں نے بیہوشی کی حالت میں اسے اس بُری طرح جکڑا تھا کہ بلبل شاہ سرکس کے شیر کی طرح بے بس ہو کر رہ گیا۔

اس کے ساتھ ہی حاجی پر جیسے جنون کا دورہ پڑا۔ اُس نے پہلے سے وہاں رکھا ایک بڑا سا ڈنڈا اٹھا کر لوہے کی زنجیر میں جکڑے بلبل شاہ کو دیوانہ وار پیٹنا شروع کر دیا۔

بلبل شاہ کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ جنونیوں کے قبضے میں آگیا ہے اور یہ لوگ جو بھی چاہیں گے کر گزریں گے ——!

وہ بڑا جی دار کھلاڑی تھا۔

اُس نے زندگی میں کبھی شکست تسلیم نہیں کی تھی۔

لیکن ——

اپنے ملک کے لیے سونے کا تمغہ جیتنے والا اے ایس آئی بلبل شاہ اپنے ہی محکمے کی کالی بھیڑوں کی غداری کا خمیازہ بڑی بے بسی سے بھگت رہا تھا۔ اس نے اپنی زبان اپنے دانتوں تلے دبا لی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ظلم و بہیمیت پر چیخ چلا کر ان درندوں کی حس درندگی کو تسکین پہنچائے۔

بلبل شاہ کب بے ہوش ہوا۔

اُسے کب ہوش آیا —؟ اُسے کچھ علم نہ ہو سکا۔

اُس کی آنکھ ہسپتال کے بستر پر کھلی۔

بلبل شاہ کو یہاں کسی نے نہیں بتایا کہ وہ گزشتہ تیس گھنٹے سے بیہوش تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس درمیان شہر کے بہترین ڈاکٹروں نے ہر ممکن کوشش سے اُس کی جان تو بچالی تھی لیکن اس کے ہاتھ نہ بچاسکے۔

ڈرگ مافیا نے جو کہا کر کے دکھا دیا۔

ایس پی باجوہ ساری رات اُس کے کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھا رہا۔ رہ رہ کر یہ پچھتاوا اُس کی جان کو آرہا تھا کہ وہ کٹے ہوئے ہاتھوں والے بُلبل شاہ اے ایس آئی کا سامنا کیسے کرے گا؟

ظالموں نے کتنا بھیانک انتقام لیا تھا۔

اُسے احساس تو تھا کہ یہ گھٹیا کارنامہ کن درندوں نے انجام دیا ہے لیکن ابھی تک وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اُس سے حاجی کی تفتیش واپس لے کر ایک بدنام زمانہ کرائمز برانچ کے ڈی ایس پی کو سونپ دی گئی تھی۔ باجوہ یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ ڈرگ مافیا کی طرف سے عوامی اور پریس دباؤ کا نتیجہ ہے۔ ابھی تک اُسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اُن وحشیوں نے کیا گھناؤنے کام کر ڈالے ہیں۔

ایس ایس پی کے ساتھ کیا قیامت گزر گئی ہے ــــ!

حاجی ابھی تک جیل میں تھا لیکن کب تک؟ ان لوگوں کے کتنے لمبے ہاتھ تھے اس کا اندازہ اُسے ہو چکا تھا۔ یہ لوگ تو جب چاہتے حاجی کو قانون اور انصاف کی اس دلدل سے یوں نکال لے جاتے جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔

بُلبل شاہ پولیس کو ایک ویران جگہ بے ہوشی کی حالت میں اس طرح ملا تھا کہ اُس کے دونوں ہاتھ ناکارہ کر دیئے گئے تھے۔ گو کہ اُس کے ہاتھ جسم کے ساتھ موجود تھے۔

لیکن ــــ

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ ہاتھ اب شاید حرکت نہیں کر سکیں گے۔ کسی نے ٹیلی فون پر اطلاع دی تھی جس پر پولیس نے فوراً عمل کیا۔ اگر کچھ منٹ کی اور تاخیر ہو جاتی تو شاید خون زیادہ بہہ جانے کے سبب بُلبل شاہ کو اپنی جان ہی سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

بُلبل شاہ کو دس گھنٹے کی مسلسل بے ہوشی کے بعد ہوش آیا اور اس نے سب سے پہلے سلیم باجوہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی حالانکہ جس علاقے سے اُسے برآمد کیا گیا تھا وہاں کی پولیس کا متعلقہ عملہ صبح ہی سے اس کے کمرے کے باہر موجود تھا۔ متعلقہ ایس ایچ او اس کا بیان لینا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کی غم و غصہ سے حالت بگڑ رہی تھی۔ بُلبل شاہ اُن کا بیٹی بھائی ہی نہیں اس ملک کا بھی ہیرا تھا۔ اُس نے اپنے ملک کے لیے سونے کا تمغہ جیتا تھا اور مستقبل میں اس سے ایسے کئی تمغے حاصل کرنے کی اُمیدیں وابستہ کی جا رہی تھیں۔ اور موذیوں نے اس کے دونوں ہاتھ توڑ کر اُسے ناکارہ کر دیا تھا۔

پولیس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد اس مجرم کا پتہ لگائے جس نے اس کے ملک کے قابلِ فخر سپوت کے خلاف یہ گھناؤنا جرم کیا تھا۔

"سر! میرے ہاتھ!...."

باجوہ کی شکل پر نظر پڑتے ہی بُلبل شاہ نے فریادی لہجے میں دریافت کیا۔

"ٹھیک ہو جائیں گے بُلبل شاہ ــــ حوصلہ کرو ــــ تم کھلاڑی ہو۔ ہم سے زیادہ شکست کا صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو ــــ"

باجوہ کے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

بُلبل شاہ نے جن زخمی نظروں سے دوبارہ اس کی طرف دیکھا اُن سے آنکھیں دوچار کرنے کی ہمت سلیم باجوہ میں نہیں تھی۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

بُلبل شاہ نے اُسے سارے واقعات بتا دیئے تھے۔ وہ کمال ضبط کا مظاہرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہا تھا۔ اُس کا جسم پٹیوں میں جکڑا تھا اور ہاتھوں کو ڈاکٹروں نے اس امید پہ مخصوص انداز سے باندھ دیا تھا کہ شاید کوئی ماہر سرجن اُن رگوں کا رابطہ دوبارہ جسم سے جوڑ دے جو بظاہر مردہ ہو چکی تھیں۔

"حاجی — میں تجھے کتے کی موت مار ڈالوں گا — تو نے قانونی جنگ کو ذاتی جنگ میں تبدیل کروا لیا ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ تجھے کون بچاتا ہے"۔

سلیم باجوہ دانت پیستے ہوئے بڑبڑایا۔

"سر — میں دشمن کو دھوکا دے کر مارنے کا عادی نہیں — میں تو کبڈی کھیلتا ہوں سر! ہم للکار کر جاتے ہیں اور للکار کر آنے والے کو پکڑتے ہیں۔ لیکن اس موذی نے مجھے دھوکے سے باندھ کر مارا ہے — میں مر جاتا سر! لیکن اپنے ہاتھ..."

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اس کی آواز بھرا گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہنے لگے تھے۔ ایس پی سلیم باجوہ نے اپنے رومال سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔

"بُلبل شاہ۔ میں تمہارے ہاتھ واپس دلاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں جہاں بھی آپریشن ممکن ہوا میں تمہیں بھیجوں گا۔ یہ کسی ایس پی کا نہیں تمہارے ایک بھائی کا وعدہ ہے۔ ایک جٹ کا وعدہ — مطمئن رہنا — اور ہاں ایک میری درخواست ہے — جب تم اپنا بیان لکھواؤ گے تو اس میں حاجی کا نام نہ لکھوانا — اب یہ میری اور اس کی براہِ راست جنگ ہے۔ اس میں کوئی تیسرا فریق نہ آئے —"

سلیم باجوہ نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سر! میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔ آپ سے اس ملک کو بہت اُمیدیں وابستہ ہیں۔ آپ نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے سر! خدا کے لیے ان لوگوں کو "انڈر ایسٹیمیٹ" نہ کریں۔ یہ بہت طاقتور ہے — بہت زیادہ طاقتور — انہوں نے اپنی دولت سے اس ملک کے سیاستدان تو خریدے ہی تھے۔ یہاں کا میڈیا بھی خرید لیا ہے۔ یہ جس سچ کو چاہیں جھوٹ اور جس جھوٹ کو چاہیں سچ بنا سکتے ہیں — آپ محتاط رہیے سر — !"

بُلبل شاہ نے کہا

"بُلبل شاہ میں تو یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کتنے طاقتور ہیں — ان میں جھوٹ کو سچ میں بدل کر رکھنے کی کتنی زیادہ طاقت ہے۔ مجھے بھی تو خود کو آزمانا ہے۔ تم ایک بھائی کی حیثیت سے میری ہدایت پر عمل کرو۔ اسے میری درخواست سمجھنا —"

"آل رائٹ سر! — جیسے آپ کا حکم"

بُلبل شاہ ابھی تک اس کا اطاعت گزار تھا۔

ڈاکٹر نے انہیں زیادہ دیر گفتگو سے منع کیا تھا۔ سلیم باجوہ باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مقامی ایس ایچ او نے اس کا بیان قلمبند کر لیا۔

بُلبل شاہ نے واقعات صحیح بتائے تھے لیکن حاجی کا اُن میں کہیں ذکر نہیں تھا۔ یہی بتایا کہ مجرموں نے اس سے کس بات کا انتقام لیا ہے۔ وہ کسی مجرم کی نشاندہی سے بھی قاصر تھا۔ البتہ اس نے دو تین کے حلیے ضرور لکھوا دیے۔

○

فاخرہ کو آج یہاں دوسرا روز تھا۔

وقت کا اندازہ اُسے اس کمرے کی دیوار سے لگی گھڑی سے ہو سکتا تھا۔ خدا جانے اُن لوگوں نے یہ گھڑی یہاں کیوں لگائی تھی۔ اس دوران انہوں نے فاخرہ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ کھلانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی لیکن اُس نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ البتہ کمرے میں موجود فرج سے اُس نے پانی ضرور پیا تھا۔

وہی منحوس صورت عورت اُس کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی وہ اُسے تنہا چھوڑ کر باہر نکل جاتی۔ اس دوران فاخرہ ایک بت کی طرح خاموشی سے کبھی صوفے پر بیٹھ جاتی اور کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ مسلسل سوچنے سے اُس کو اپنے دماغ کی رگیں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اُن لوگوں نے اب تک صرف ایک مرتبہ اس کی بات فاخرہ کے والد سے کروائی تھی۔ اس بات کی تو اُسے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ یہ لوگ اُس کے والد سے ضرور کوئی ناجائز مطالبہ پورا کروانا چاہتے ہیں۔ شاید اس لیے انہوں نے فاخرہ کو یرغمال بنایا تھا۔

لیکن ——

اگر اس کے والد صاحب نے یہ مطالبہ پورا نہیں کیا تھا تو یہ لوگ دوبارہ اس کے والد سے اس کی بات ضرور کرواتے کیونکہ ایس ایس پی کی واحد کمزوری اُن کے پاس فاخرہ ہی کی شکل میں موجود تھی۔ یقیناً انہوں نے اپنی بات منوالی تھی۔ پھر اب تک انہوں نے اُسے رہا کیوں نہیں کیا؟

یہ سوچ سوچ کر وہ باؤلی ہو رہی تھی۔

"کہیں یہ لوگ ڈبل گیم تو نہیں کر رہے۔ اُس کے والد سے تاوان وصول کرنے کے بعد بھی اُسے ....."

اس سے آگے اُس کی سوچیں منجمد ہو گئیں۔

وہ نڈھال سی ہو کر صوفے پر گر گئی۔ اس کی نگرانی پر مامور حرافہ اس وقت کمرے میں نہیں تھی۔

کبھی کبھی وہ تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر چلی جایا کرتی تھی۔

اچانک ہی سامنے والا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئی لیکن اکیلی نہیں۔ اس کے تعاقب میں وہ بھیانک شکل والا درندہ بھی اندر گھس آیا جس نے کل اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ یہ وحشی نشے میں دھت دکھائی دے رہا تھا جس کا ثبوت اُس کے کمرے میں گھسنے کے ساتھ ہی وہاں پھیلنے والی مخصوص قسم کی بدبو تھی۔

تھرڈ کلاس غنڈوں کی طرح اُس نے اپنے گلے میں پستول لٹکا رکھا تھا شاید یہ اُس کے ہولسٹر میں لگا ہوگا جسے اُس نے ہار کی صورت گلے میں لٹکا لیا۔

وہ حرافہ بھی نشے میں بدمست تھی جس کا اندازہ اُس کی چال کی ڈگمگاہٹ ہی سے فاخرہ لگا سکی تھی۔

"چلو تمہیں رہا کر دیں ——"

اُس نے لڑکھڑاتی زبان میں فاخرہ سے کہا اور اس کی طرف بڑھی۔

"ہٹو —— ذلیل گھٹیا عورت ——"

فاخرہ کو اس سے گھن سی آنے لگی تھی۔

"اے لڑکی جیسا کہتی ہے اس کا حکم مان ——"

غنڈے نے اس کی طرف پستول لہراتے ہوئے کہا۔

"شٹ اپ ——"

فاخرہ اپنی جگہ اچانک کھڑے ہو کر دھاڑی۔

"سالی بڑی انگریزی بولتی ہے۔ ابھی تک اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہوا۔"

یہ کہتے ہوئے حرافہ کے تعاقب میں غنڈہ اُس کی طرف بڑھا۔

فاخرہ نے اُن کے گھناؤنے عزائم بھانپ لیے تھے۔ اب وہ ایک بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ان وحشیوں کو اپنے جسم کو چھونے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں دے گی۔"

"ادھر آ ـــــ"

حرافہ نے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

عین انہی لمحات میں فاخرہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے جسم میں برقی رَو دوڑ گئی ہے۔ وہ غم و غصے سے بدحال ہوئی جاتی تھی۔ اُس نے اپنا بازو چھڑا کر حرافہ کو دھکا دیا اور وہ دیوار سے ٹکرا کر گر گئی۔

اپنی عزت کی حفاظت کے لیے اُس کے بازوؤں میں بجلیاں بھر گئیں۔ برق رفتاری سے وہ غنڈے کی طرف بڑھی اور اُس کے ہاتھ میں ڈھیلے سے انداز سے پکڑا ریوالور چھین لیا ـــــ فاخرہ نے اتنے زور سے ریوالور کو جھٹکا دیا تھا کہ غنڈا لڑکھڑا کر گر پڑا لیکن ریوالور جس نیلی سی مضبوط ڈوری سے بندھا تھا وہ ابھی تک اُس کے گلے میں اٹکی تھی۔

فاخرہ نے چاہا کہ جھٹکا دے کر ریوالور باہر نکالے لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

زمین پر گرا غنڈہ اور اُس سے چند گز دور گری حرافہ دونوں ہی اب بڑے خطرناک ہو رہے تھے۔ اُسے چند لمحوں میں فیصلہ کرنا تھا اُن کی درندگی کی بھینٹ چڑھنے یا پھر انہیں مار ڈالنے کا فیصلہ ـــــ!

اور ان مضبوط لمحات میں وہ چٹان کی طرح ڈٹ گئی۔

اُس نے قریباً جھکتے ہوئے ریوالور سیدھا کیا اور اُس کا رُخ غنڈے کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ شاید اُس بدبخت نے نشے کی حالت میں ریوالور کا سیفٹی لاک نہیں لگایا تھا۔ پہلی ہی گولی اُس کے بھیجے کے آر پار ہو گئی۔

دوسری گولی چلانے سے پہلے فاخرہ عالم ہوش میں واپس لوٹ آئی۔

اُس نے آخری منظر بھی دیکھا کہ حرافہ خوفزدہ ہو کر چیختی ہوئے کمرے کے دوسرے کونے کی طرف موجود باتھ روم کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اور غنڈے کا سارا چہرہ خون سے تر تھا۔

سامنے دروازہ کھلا تھا۔

فاخرہ نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر باہر چھلانگ لگائی اور بھاگتی چلی گئی۔ اُسے اس بات کا احساس ہی نہ ہو سکا کہ اوپر والی منزل تک کیسے پہنچی اور پھر کوٹھی کے مین گیٹ پر موجود چوکیدار کے سر پر وہاں رکھا گملا اٹھا کر اُس نے کس طرح مارا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مین گیٹ سے ملحقہ چھوٹے دروازے سے کود کر باہر گری۔ اندھیرے نے اُسے بانہیں پھیلا کر اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ ابھی تک اسے اس بات کا بھی احساس نہیں ہو سکا تھا کہ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگی جا رہی ہے۔

گیٹ کو چونکہ اندر سے بھی تالا لگا ہوا تھا۔ اُس نے دیوانگی کے عالم میں گیٹ پھلانگا تھا۔ اُسے خود علم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کبھی اتنی طاقت ور بھی رہی تھی۔ خدا جانے اس کے بدن میں اُس لمحے کون سی قوت سما گئی تھی۔

گیٹ سے گرتے ہوئے اُس کی قمیص شاید کہیں اُلجھ گئی تھی۔ اور بازو پر ایک لمبی خراش خون کی لکیر کے ساتھ ہی پھیلتی چلی گئی تھی۔

زمین سے اُٹھتے اُٹھتے اُس نے ایک سرسری نظر اپنے وجود پر ڈالی اور لرز کر رہ گئی۔

اس کے ساتھ ہی اُس نے دیوانہ وار بھاگنا شروع کر دیا۔

خدا جانے یہ کون سا علاقہ تھا؟

وہ کہاں تھی اور یہ راستہ کس طرف جاتا تھا۔ جس طرف اُس کا منہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُٹھا وہ بھاگتی چلی گئی۔ یہ کوئی ماڈرن کالونی تھی جس کی اندرونی سڑکوں پر وہ بھاگ رہی تھی۔

رات شاید ایک پہر ڈھل چکی تھی۔ کوٹھیوں کے بڑے بڑے گیٹ بند تھے اور اُن کے مکینوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ باہر کوئی اپنی عزت اور زندگی کی بقا کی جنگ میں جیتتا ہے یا ہارتا۔

خوفزدہ ہرنی کی طرح وہ بار بار گردن گھما کر پیچھے بھی دیکھ لیتی اُس کی خوش قسمتی تھی کہ کوئی اُس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ شاید اُن لوگوں کے لیے اب اس کو دوبارہ قابو کرنے سے اپنی جان بچا کر یہاں سے بھاگ جانا زیادہ ضروری ہو گیا تھا۔

اُس کے بدن سے ٹیسیں اُٹھ اُٹھ کر اُسے بے حال کرنے لگی تھیں اور فاخرہ کو اچانک ہی ایسے لگا جیسے اُس کا بایاں بازو جسم سے الگ ہو گیا ہو۔ اور کچھ نہ سوجھا تو اپنے سامنے موجود کوٹھی کی اطلاعی گھنٹی پر اُس نے ہاتھ رکھا اور اپنی انگلی کا دباؤ اُس وقت تک بڑھاتی چلی گئی جب تک کہ کوٹھی کا دروازہ اُس پر کھل نہیں گیا۔

"ارے یہ تو شاید رضیہ کی بیٹی ہے ۔۔۔"

یہ تھے وہ آخری الفاظ جو اُس کے کانوں نے سنے جس کے بعد اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

وہ بے ہوش ہو چکی تھی ۔۔۔!

O

خان صاحب اپنی پریشان حال بیوی کو بمشکل سنبھال پا رہے تھے۔

"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں ۔۔۔؟"

بار بار وہ ایک ہی بات دہرا رہی تھیں۔

"رضیہ میں تم سے کیا چھپاؤں گا ۔۔۔ لیکن تمہیں بتاؤں بھی کیا۔ بس خدا سے دعا کرو کہ آج رات تک فاخرہ آ جائے ۔۔۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

بالآخر ایس ایس پی صاحب نے زچ ہو کر کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا ۔۔۔ وہ کہاں گئی ہے ۔۔۔ کہاں سے آئے گی؟"

بیگم صاحبہ نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

جواب میں خان صاحب نے دوبارہ لمبی خاموشی اختیار کر لی۔

لیکن ۔۔۔

بیگم صاحبہ کی حالت اُن سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ خود پر ضبط کرنے کی کوشش میں بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رو رہی تھیں۔ اُن کا دل دکھ سے پھٹا جا رہا تھا۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو انہوں نے خدا کے حضور گڑگڑا کر اپنے اور فاخرہ کے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے اُس کے لیے نئی زندگی طلب کی تھی۔

اُن کی بیٹی راہِ راست پر آئی تو یہ قیامت اُن پر ٹوٹ پڑی۔

خدا جانے اُن سے کون سی ایسی نیکی سرزد ہو گئی تھی جو اللہ تعالیٰ اُن کی آزمائش پر تُل گئے تھے۔ انہوں نے تو کبھی پارسائی کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ کبھی خود کو خدا کے امتحان کے قابل نہیں جانا تھا۔

اچانک ہی ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز نے اُنہیں چونکا دیا۔

بیگم بیقراری سے فون کی طرف بڑھیں۔

لیکن ۔۔۔

اس سے پہلے ہی خان صاحب نے اُن کا بازو پکڑ کر خاموش رہنے اور پیچھے ہٹنے کا اشارہ کر دیا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے فون اُٹھانے سے پہلے فون کے ایک طرف موجود بٹن دبا دیا تھا۔

شاید یہ فون خصوصی حالات کے لیے بنایا گیا تھا جو وہ آج صبح ہی گھر لائے تھے اور اُسے گھر کے فون سے منسلک کر دیا تھا۔

فون خان صاحب نے خود اُٹھایا تھا۔

"ہیلو ــــ"

انہوں نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

لیکن ــــ

دوسری طرف سے خلافِ توقع وہ آواز نہیں آ رہی تھی جس کی انہیں توقع تھی۔

"بھائی جان میں عائشہ بول رہی ہوں بھابی کہاں ہیں۔"

یہ ڈاکٹر نسرین کی بہن کا فون تھا۔ خدا جانے اُس نے کس لیے فون کیا تھا۔

خان صاحب کو تو کسی اور فون کا انتظار تھا۔ انہوں نے اپنی دانست میں قدرے مایوسی کے عالم میں فون اپنی بیوی کی طرف بڑھایا تھا۔

"باجی رضیہ میں عائشہ بول رہی ہوں۔ گھبرانا نہیں لیکن فوراً میرے گھر چلی آؤ۔ تمہیں گھر یاد ہے ناں ــــ فاخرہ بیٹی ہمارے پاس بخیر وعافیت موجود ہے۔"

دوسری طرف سے آنے والی آواز نے بیگم صاحبہ پر خوشی اور حیرت سے لرزہ طاری کر دیا تھا۔

"ت ت تم ٹھیک کہہ رہی ہو ناں عائشہ۔ میں آتی ہوں۔ ابھی آتی ہوں۔ اُسے جانے نہ دینا۔ اپنے پاس رکھنا۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں ــــ"

انہوں نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"باجی رضیہ خدا کے لیے خود پر کنٹرول کرو۔ میں نے کہا ناں کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

دوسری طرف سے عائشہ نے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔

"میری بات کرواؤ اس سے ــــ مجھے یقین نہیں آ رہا ــــ"

انہوں نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"دیکھو وہ تھکی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے دوا دے کر دوسرے کمرے میں سُلا دیا ہے۔ تم بحث کرنے کے بجائے میرے پاس آ کر اُس سے مل لو۔ اچھا خدا حافظ۔"

عائشہ نے دوسری طرف سے فون بند کر دیا۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہوا فاخرہ کو ــــ"

خان صاحب نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"وہ رضیہ کے گھر ہے ــــ نسرین کی بہن کے گھر ــــ ابھی چلیں۔ آپ بھی چلیں ــــ اُسے لے آئیں۔"

بیگم صاحبہ حواس باختہ ہو رہی تھیں۔

خان صاحب کے لیے اپنی بیگم سے زیادہ خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

"چلو ــــ چلتے ہیں ــــ چلو ابھی چلتے ہیں ــــ"

وہ حیران تھے کہ فاخرہ وہاں کیسے پہنچ گئی۔

عائشہ کے گھر اُن کا زیادہ آنا جانا تو نہیں تھا۔ اُس نے چند ماہ پہلے ہی اپنا گھر بدلا تھا۔ انہیں تو ڈھنگ سے اُس جگہ کا نام بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ جہاں عائشہ رہتی تھی۔ بس کچھ اندازہ سا تھا۔

اپنی بیگم کے ساتھ وہ دوسرے کمرے تک آئے جہاں انہوں نے بیگم صاحبہ کو اپنی حالت پر قابو پانے، خود کو نارمل کرنے کی تلقین کرتے ہوئے سمجھایا کہ اگر انہوں نے خود پر قابو نہ پایا تو بچی کی زندگی تباہ ہونے کا خطرہ بھی موجود ہے۔

اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے فون پر اپنے لوگوں کو کچھ ہدایات جاری کیں

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اپنی بیوی کے ساتھ سول کپڑوں میں نیچے آ گئے۔

صبح کی اذان ہو رہی تھی جب وہ عائشہ کے گھر پہنچے جہاں ان کی آمد سے پہلے ہی ڈاکٹر نسرین بھی پہنچ چکی تھیں۔ عائشہ نے اپنی بہن کو احتیاطاً بُلا لیا تھا۔ جس نے فاخرہ کو نیند آور گولی دے کر سُلا دیا تھا کیونکہ جب وہ یہاں پہنچی تھی تو فاخرہ کی ذہنی حالت جسمانی حالت سے زیادہ ابتر تھی۔

○

"کہاں ہے فاخرہ ــــــ"

بیگم صاحبہ نے اندر داخل ہوتے ہی بے چینی سے پوچھا۔

"رضیہ نارمل رہو ــــــ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ نیند سے اُسے خود ہی بیدار ہونے دینا۔ تم اُسے نہ جگانا۔ وہ بہت خوفزدہ تھی۔ شاید کسی کی گرفت سے بھاگ کر آئی ہے۔ میں نے اسے نیند آور دوا دے کر سُلا دیا ہے۔"

ڈاکٹر نسرین نے اسے مختصر الفاظ میں سمجھایا۔

"شکریہ بہن جی ــــــ کوئی خطرناک بات تو نہیں ــــــ"

اس مرتبہ ایس ایس پی صاحب نے خود دریافت کیا تھا۔

"فی الوقت تو بھائی صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔ اُسے ذہنی صدمہ پہنچا ہے اور بچی بہت پریشان اور گھبرائی ہوئی ہے لیکن میرے خیال سے اب وہ نارمل ہو جائے گی۔ میری آپ سے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے یہی درخواست ہو گی کہ فی الوقت آپ پولیس آفیسر کے بجائے صرف ایک باپ بن کر اسے ڈیل کریں۔ بصورت دیگر کچھ بھی ممکن ہے ــــــ"

ڈاکٹر نسرین نے اُنہیں سمجھایا۔

انہوں نے بیگم صاحبہ کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے انہیں فاخرہ کے

بستر کے پاس بیٹھنے کی اجازت دی تھی۔ جو خود گہری نیند سو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد خان صاحب بھی ڈاکٹر نسرین سمیت اس کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ عائشہ اُن کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔

بیٹی کو زندہ سلامت دیکھ کر دونوں میاں بیوی قدرے نارمل ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر نسرین نے اُس کی معمولی سی مرہم پٹی کر دی تھی۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑے بھی تبدیل کر دیئے تھے۔

خان صاحب کے دل پر پڑی چٹان اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی۔

انہوں نے اس بات کا اندازہ اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر اور عائشہ کی زبانی واقعات سُن کر لگا لیا تھا کہ فاخرہ کو ان غنڈوں نے خود سے رہا نہیں کیا بلکہ وہ خود فرار ہوئی ہے۔ اگر وہ اُسے رہا کرتے تو اس کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی۔

حاجی اتنا گھٹیا مجرم تھا۔

ایس ایس پی صاحب کا جی چاہتا تھا اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں لیکن فی الوقت سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ کیس ضرورت سے زیادہ شہرت اختیار کر گیا تھا اور پولیس کے ترجمان کی طرف سے باقاعدہ پریس کانفرنس میں اعلان کیا گیا تھا کہ کیس کرائمز برانچ کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ ان بدمعاشوں نے جب محض کیس باجوہ سے منتقل کروانے کے لیے اتنا خطرناک اور گھناؤنا قدم اٹھایا تھا تو یقیناً اُن کا کوئی اہم سورس کرائمز برانچ میں رہا ہو گا اور وہ شاید قانونی طور پر ہی معاملات کو ختم کرنے کے لیے کوشاں تھے ــــــ!

"دیکھوں گا تمہیں حاجی ــــــ میں تمہیں دیکھوں گا ــــــ"

ایس ایس پی صاحب دانت پیستے ہوئے بڑبڑائے۔

قریباً ایک گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ہی فاخرہ نیند سے بیدار ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ اپنے والدین کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہ چیختی ہوئی اپنی ماں سے لپٹ گئی۔

"میں نے اُسے نہیں مارا ــــ میں نے اُسے نہیں مارا ــــ"

اُس نے باپ کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے چلّانا شروع کر دیا۔

"بیٹی تم سے کون کہتا ہے کہ تم نے اُسے مارا ہے ــــ یہ لوگ تو تمہاری تیمارداری کو آئے ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہُوا۔ تم نے کسی کو نہیں مارا ــــ"

ڈاکٹر نسرین نے اُس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے نارمل کیا۔

وہ بڑی سہمی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

اس فقرے کے تکرار سے خان صاحب کا ماتھا ٹھنکا ــــ!

اُن کے تجربے نے انہیں بتا دیا کہ اُن کی بیٹی کے ہاتھوں قتل ہوگیا ہے لیکن ــــ

ایک باپ کی حیثیت سے انہیں اس بات کا علم تھا کہ اُن کی بیٹی کبھی دانستہ قتل نہیں کر سکتی۔ خدا جانے کن حالات میں یہ سب کچھ ہُوا ہے۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد فاخرہ نارمل ہوئی اور ڈاکٹر نسرین اور والدین کے بضد ہونے پر اُس نے چائے پی اور انہیں رات کے واقعات سے آگاہ کیا۔

فاخرہ نے اُنہیں بتایا کہ اُسے نامعلوم لوگوں نے اغوا کر لیا تھا۔ انہوں نے ہی اس کے والد کو فون کروایا تھا اور اب وہ انہی کی گرفت سے فرار ہو کر یہاں تک پہنچی ہے۔ اُسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ آنٹی عائشہ کے گھر پہنچ چکی ہے۔

اُس کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے خانصاحب نے فی الوقت اُسے صرف مطمئن کرنا کافی جانا۔ انہیں ابھی تک اپنی بیٹی کا پس منظر معلوم نہیں تھا اور ایک

باپ ہونے کے ناطے وہ اپنی بیٹی پر ٹوٹنے والی اس قیامت کا ذمہ دار بھی خود ہی کو گردانتے تھے۔

"تم نے بہت اچھا کیا بیٹی ــــ شاباش۔ مجھے اپنی بہادر بیٹی سے یہی اُمید تھی۔ اب تم بالکل نارمل ہو جاؤ۔ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں ہوں ناں بیٹی۔"

انہوں نے شفقت سے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ روتے ہوئے باپ کے سینے سے لپٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد خان صاحب اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے اپنی بیٹی سے بمشکل تین چار سوالات ہی بڑے نامحسوس انداز میں دریافت کیے تھے۔

اچانک ہی انہوں نے بڑے آرام سے پوچھا۔

"بیٹی تم اندازہ کر سکتی ہو کہ کس سمت سے بھاگتی یہاں تک پہنچی تھی ــــ"

"شاید اس سمت سے ــــ"

گھر سے باہر آ کر اُس نے ایک طرف اشارہ کیا تو خان صاحب نے گاڑی کا رُخ اُس طرف موڑ لیا۔ ایک دو سرکل پر اندازے سے گھومتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کی بیٹی بڑی اُلجھن محسوس کر رہی ہے اور اُسے شاید بھاگتے ہوئے راستہ بھی یاد نہیں رہا۔

کسی مزید قباحت سے بچنے کے لیے انہوں نے گاڑی کا رُخ گھر کی طرف موڑ دیا۔

"اپنے بہن بھائیوں کو مطمئن کر دینا۔ کسی سے اس مسئلے پر بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے ــــ!"

انہوں نے اپنی بیٹی اور بیوی کو گھر پر چھوڑا اور اپنے آفس کا رُخ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈبل گیم

تھوڑی دیر بعد ہی اُن کی ہدایت پر پولیس کے مستعد اہلکاروں نے سفید کپڑوں میں اُس مخصوص علاقے کو گھیرے میں لے کر گھروں کی نگرانی شروع کر دی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹہ بعد خان صاحب جائے واردات پر پہنچ چکے تھے۔ یہ کوٹھی کسی نے دو ماہ پہلے کرائے پر لی تھی اور آج جب مالک مکان کسی ضروری کام سے کرایہ داروں کے ہاں پہنچا تو کوٹھی خالی تھی اور وہاں ایک لاش اُن کی منتظر تھی۔

جس پر اُس نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔

ایس ایس پی صاحب نے یہاں کی صورتِ حال کو جوں کا توں رکھا تھا۔ انہوں نے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں سے فرار ہونے کے لیے اُن کی بیٹی کو زبردست جدوجہد کرنی پڑی ہے۔

موقع واردات سے مقامی تھانے کے انچارج نے جو چیزیں اپنے قبضے میں لی تھیں اُن میں اُن کی بیٹی کا پرس بھی موجود تھا۔

قانون کے ایک محافظ کی حیثیت سے انہوں نے اپنا فرض نہیں بھلایا تھا اور تھانے میں رپورٹ درج کروانے کے بعد وہ سیدھے آئی جی صاحب کے پاس پہنچے تھے ـــــ!!

جہاں اُن کی آمد پر سب سے پہلے انہیں اپنے لیے فون کی اطلاع ملی تھی۔

خان صاحب نے یہ فون اپنے ماتحت کا جان کر ہی وصول کیا تھا۔

لیکن ـــــ

دوسری طرف کوئی اور ہی اُن سے مخاطب تھا۔

"ایس ایس پی صاحب مبارک ہو بیٹی گھر پہنچ گئی ـــــ ہمارا ایک آدمی بلا وجہ مارا گیا لیکن کوئی بات نہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپ کی بیٹی بخیر و عافیت پہنچ گئی ہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا تھا کہ حاجی صاحب والی "ڈیل" میں اگر آپ کی طرف سے کوئی گڑبڑ پیدا کی گئی تو آپ کی صاحبزادی کی ایک بہت شاندار ویڈیو فلم ہمارے پاس آپ کی امانت کے طور پر محفوظ ہے وہ ہم فوراً پریس کو دے دیں گے ـــــ آپ میری بات سمجھ گئے نا۔"

ایس ایس پی صاحب کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ غصے سے اُن کے دماغ کی رگیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔

"شٹ اپ ـــ"

انہوں نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

"خان صاحب ذرا تحمل سے کام لیجیے۔ یہ مت بھولیے کہ آپ ایک بیٹی کے باپ ہیں۔ ہم نے آپ سے شریفانہ معاہدہ کیا ہے۔ ہمارا ایک آدمی مارا گیا ہے اور ہم خاموش ہیں ـــــ آپ کو بھی خاموش رہنا ہوگا۔ ورنہ نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

اس سے پہلے کہ خان صاحب کچھ اور کہتے دوسری طرف سے رابطہ کٹ گیا۔

خان صاحب کو حالات کی سنگینی کا مزید شدت سے احساس دلا دیا گیا تھا۔

لیکن ـــــ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ایک ایماندار اور اپنے اصولوں پر کاربند رہنے والے پولیس افسر تھے۔ اُن کے لیے اپنی بیٹی کی عزت بے حد عزیز تھی اور اس کے لیے وہ اپنی جان پر بھی کھیل سکتے تھے لیکن اپنی سرکاری حیثیت کو نظر انداز کر کے کچھ کر گزرنا بھی ان کے لیے ناممکن نہیں تھا۔

عین آخری لمحات میں ملنے والی وارننگ سے انہوں نے اس بات کا اندازہ تو بخوبی کر لیا تھا کہ ضرور ان کے اپنے آفس میں کوئی کالی بھیڑ موجود ہے۔ جو ان مجرموں کا کرائے کا ٹٹو ہے ورنہ تو انہیں اس بات کا علم نہیں ہو سکتا تھا کہ اس وقت وہ آئی جی صاحب سے ملاقات کرنے جا رہے ہیں!

انہیں اب بہت محتاط ہو کر چلنا تھا۔

پھونک پھونک کر قدم اُٹھانے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ڈرگ مافیا کے کچھ لوگ ہاتھ آ جانے کے بعد انہیں دوبارہ ہاتھ سے نکل جانے کا موقع دیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ بڑے پُر اعتماد ہو کر آئی جی صاحب سے ملاقات کر رہے تھے۔ ان کی درخواست پر آئی جی صاحب نے فی الوقت اپنے پی اے سے "مکمل تنہائی" کے لیے کہہ دیا تھا۔

"کون ہے مرنے والا۔ کیا مسئلہ ہے۔ کچھ پتہ لگا۔"

آئی جی نے ان کی خیریت دریافت کرنے کے بعد فوراً ہی رات کے واقعات کے حوالے سے سوال داغ دیا۔

"سر! میں مقتول کو تو فی الوقت نہیں جانتا لیکن قاتل میرے پاس بلکہ میرے گھر میں موجود ہے۔"

ایس ایس پی صاحب نے کمال حوصلہ مندی سے کہا۔

"کون؟"

آئی جی صاحب نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

"میری بیٹی فاخرہ ــــــ!"

ایس ایس پی کے جواب نے آئی جی صاحب کو ایک مرتبہ تو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں خانصاحب۔ آپ کے حواس تو ٹھیک ہیں۔"

آئی جی صاحب نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

"یس سر! میں بقائمی ہوش و حواس یہ بات کہہ رہا ہوں۔"

خان صاحب نے مؤدب لہجے میں کہا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی خان صاحب۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ فاخرہ آپ کی ہی نہیں۔ میری بھی بیٹی ہے اور آپ اتنی آسانی سے ....."

انہوں نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

"سر! میں نے یہ بات اپنی جان پر کھیل کر کہی ہے۔ آسانی سے نہیں کہی۔ محض اس اقرار کی ہی جانے کتنی قیمت ادا کرنی پڑے گی، اس کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں!"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے آئی جی صاحب کو ساری کہانی سُنا دی۔

"شکر ہے خدایا تیرا ــــ میرے اللہ۔ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔"

آئی جی نے ساری بات سُن کر کہا۔

انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ قتلِ عمد ہرگز نہیں اور خان صاحب کی بیٹی کم از کم اس طرح کے قتل پر سزا کے بجائے انعام کی مستحق تھی۔

"میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں خان صاحب کہ آپ نے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایماندار پولیس آفیسر کی طرح سارے واقعات مجھے بتا دیے ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ قتل "سیلف ڈیفنس" ہے۔ احتیاطاً آپ فاخرہ بیٹی کی "انیٹرم" (ضمانت قبل از گرفتاری) کروالیں ـــــ ایس پی لیگل سے مشورہ بھی کر لیں ـــــ اور متعلقہ آفیسر کو تلقین کر دیں کہ وہ ابھی صحیح واقعات کسی کو نہ بتائیں۔ خدانخواستہ اگر اُن لوگوں کو اصلیت کا علم ہو گیا تو عین ممکن ہے کہ وہ کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ تمہارے ایک ساتھی کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں تمہارے خاندان کو مکمل تحفظ دوں۔ اگر خدانخواستہ فاخرہ بیٹی پر کوئی حرف آ گیا تو اس ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں کا ہم پر سے اعتماد اُٹھ جائے گا ـــــ یوں بھی اُس نے کوئی جرم نہیں کیا ـــــ بہادری کی ہے ـــــ مجھے ایس ایس پی خان صاحب کی بیٹی سے یہی اُمید تھی کہ وہ ان حالات میں یہی کچھ کرتی۔ اگر خدانخواستہ وہ اُن موذیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی تو..."

آئی جی صاحب خاموش ہو گئے۔

خان صاحب کے کلیجے پر رکھی بھاری چٹان اپنی جگہ سے سرک گئی تھی۔

وہ مطمئن ہو گئے تھے ـــ

آئی جی صاحب نے ایس پی لیگل کو وہیں طلب کر لیا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹہ تک وہ لوگ آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ پھر وہاں سے ایک منصوبے پر اتفاق کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اس منصوبے کے مطابق:

اُس روز قریباً دو ڈھائی گھنٹے بعد فاخرہ کی ضمانت قبل از گرفتاری ہو گئی۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔

پولیس نے اپنی تفتیش مکمل کر لی۔

ایف آئی آر ملزمان کی گرفتاری کے لیے سیل کر دی گئی۔

ایس ایس پی خان صاحب چھٹی کی درخواست منظور ہونے پر اپنے بچوں کے ساتھ عمرہ کرنے چلے گئے۔

دوپہر کے بعد آئی جی صاحب نے ایس پی باجوہ کو طلب کر لیا۔ انہوں نے باجوہ کو اعتماد میں لے کر ایس ایس پی پر گزرنے والی قیامت سے آگاہ کر دیا۔ باجوہ کے دل میں پہلے ہی خان صاحب کے لیے خاص عزت موجود تھی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ خانصاحب کے کہنے پر انکوائری تبدیل کی گئی ہے۔ تب چند لمحوں کے لیے اسے بدگمانی ضرور ہوئی تھی۔

لیکن ـــــ

پھر اُس کے ذہن نے جو رائے قائم کی تھی وہی سچ ثابت ہوئی۔ اُن موذیوں نے خان صاحب کو بھی جکڑ کر ان سے یہ فیصلہ کروایا تھا۔ جس سے ان کی طاقت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ یہ لوگ اتنے متکبر اور اپنی طاقت کے نشے میں بدمست تھے کہ انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ باجوہ سے انکوائری تبدیل کروانے کے بعد وہ ہر اُس افسر کو خرید سکیں گے جس کے ذمہ انکوائری لگائی جائے گی۔!

"فی الوقت ہمیں ویسا ہی کرنا ہے جس کا مطالبہ اُن لوگوں نے خانصاحب سے کیا تھا۔ انہیں احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس کیس میں موجود ہو۔"

آئی جی صاحب نے اُسے سمجھایا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے جناب ـــــ"

ایس پی سلیم باجوہ نے آئی جی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے مودب لہجے میں دریافت کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"گو آ ہیڈ پلیز۔ اینڈ ٹیک کیئر۔"

انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔

باجوہ نے پاؤں کی ایڑیاں جماتے ہوئے سیلوٹ کیا اور آئی جی صاحب سے ہاتھ ملا کر واپس آ گیا۔

اُسے "گرین سگنل" مل گیا تھا۔

اب وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ قدرت نے اُس کا آدھا کام خود ہی کر دیا تھا۔

○

کرائمز برانچ کا ڈی ایس پی شیخ اس کی ملاقات کے لئے آدھے گھنٹے سے وہاں موجود تھا۔

شیخ کی شہرت باجوہ کے کانوں تک اس کی آمد سے پہلے پہنچ چکی تھی۔

اُس کے علم میں لایا جا چکا تھا کہ شیخ صاحب پر تین کیس حکمانہ بدیانتی اور بے قاعدگی کے پہلے سے چل رہے ہیں۔ اینٹی کرپشن کے دو کیس اس کے علاوہ ہیں۔

یہ تو وہ کچھ ہے جو ریکارڈ پر آ چکا ہے۔

"آف دی ریکارڈ" اُن کے کارناموں کا ڈنکا سارے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بجتا رہتا تھا۔ شیخ صاحب کو اپنی کسی بھی سیٹ پر چھ ماہ سے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ عموماً اُن کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا کہ اس ڈیپارٹمنٹ میں کسی بھی کرپٹ آفیسر کا تبادلہ کرنے کے بعد شاید یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اب وہ ایماندار ہو جائے گا۔ یا کم از کم اب وہ بے ایمانی کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔

شیخ صاحب کے خلاف انکوائریاں تو اکثر ہوتی رہتی تھیں۔

لیکن ——

آج تک وہ "قصوروار" ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اس کی وجہ اُن کے "سالا صاحب" تھے جو مرکزی حکومت کے بڑے عہدیدار اور اس سیٹ پر براجمان تھے جو اُن کے محکماتی معاملات سے بحث کرتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ عین آخری لمحات میں بچ جاتے تھے اور بہت سے ثبوتوں کے باوجود اُن کے خلاف کیس عموماً خارج ہو جایا کرتا تھا۔

باجوہ کو یہ ثبوت اور گواہیاں سنبھال کر رکھنی تھیں۔

یہی ایک صورت تھی جس سے وہ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکتا تھا اُسے علم تھا کہ شیخ صاحب کی جگہ اگر کوئی ایماندار پولیس آفیسر بھی موجود ہوتا تب بھی وہ ان موذیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ان سے تو باجوہ جیسا سرپھرا ہی نمٹ سکتا تھا۔

"آئیے شیخ صاحب! کیسے زحمت کی ——"

اس نے اپنے دفتر میں گھستے ہی شیخ کو طلب کیا تھا۔

"سر! وہ انکوائری حاجی صاحب کی مجھے مارک ہوئی ہے۔ آپ چونکہ پہلے تفتیش کر رہے تھے تو میں نے سوچا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ مدد حاصل کر لوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اس کیس کا چالان جلد از جلد مکمل کرنے کے لئے بہت دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔"

شیخ صاحب نے روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے بظاہر عاجزی کا مظاہرہ کیا۔

"شیخ صاحب آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں —— بندے خدا اگر میرے ہاتھ کوئی ثبوت لگ جاتا تو کیس آپ کو ریفر ہی کیوں ہوتا —— یہی تو سارا بکھیڑا ہے کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔"

باجوہ نے شیخ کو چکرا کر رکھ دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مم۔ میں سمجھا نہیں جناب ___"

شیخ صاحب واقعی گڑبڑا گئے تھے۔

"یار اس میں سمجھنے والی کون سی ایسی مشکل بات ہے۔ بھئی سیدھی سی بات ہے اگر میرے ہاتھ ثبوت لگ جاتے تو میں خود اس کیس کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پہ باندھتا۔ آپ کے نمبر ضرور بناتا۔"

سلیم باجوہ نے شیخ صاحب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن سر آپ نے تو میری محفل میں حاجی صاحب کو... میرا مطلب ہے۔"

شیخ کو ڈھنگ کی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔

"بس یار ___ شیخ صاحب آپ سے کیا پردہ۔ ہم بھی حکم کے غلام ہیں ___ حکم ملا اسے پکڑ لو ___ پکڑ لیا ___ حکم ملا چھوڑ دو تو چھوڑ دیا۔"

سلیم باجوہ کا ذہن کوئی نئی چال چل رہا تھا۔

"سر کچھ ہمیں بھی بتا دیں۔ میں تو پہلے ہی بڑا نیک نام ہوں کہیں کوئی اور بلا نہ گلے پڑ جائے۔ بڑی مشکل سے اس سیٹ پر چھ ماہ گزارے ہیں میں نے۔"

شیخ نے مطلب کی بات بڑھائی۔

"کیا کریں گے شیخ صاحب پوچھ کر۔ ڈی آئی جی صاحب سے آج کل ایم این اے میاں صاحب کی بہت یاری چل رہی ہے ناں ___ سمجھا کرو بادشاہو ___ یہ سارا کیا دھرا اسی کا ہے ___ یہ لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ایسے داؤ پیچ کھیلتے رہتے ہیں ناں ___"

سلیم باجوہ نے بے تکلفی سے آنکھ دباتے ہوئے شیخ صاحب کی طرف جھک کر کہا۔

"اوہ ___ تو یہ بات تھی۔"

شیخ نے گدھے کی طرح گردن ہلائی۔

"بالکل یہی بات تھی لیکن میری درخواست ہے شیخ صاحب اسے خود تک ہی محدود رکھیں۔ آپ کو تو علم ہی ہے کہ میں پہلے ہی بڑی مصیبت سے تبادلہ کروا کر یہاں آیا ہوں۔ ایک مرتبہ یہاں سے نکالا جا چکا ہوں اور ویسے بھی اپنی ذرا الگ قسم کی شہرت ہے۔ کہیں پھر نئے سرے سے گھر بار نہ چھوڑنا پڑے۔"

سلیم باجوہ نے شیخ کو مزید پچکارتے ہوئے کہا۔

"لیکن سر! یہ لوگ تو ایک دوسرے کے پارٹنرز ہیں۔ میں نے تو یہی سنا تھا۔"

شیخ نے تو مزید کرید ڈالا۔

"شیخ صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں بھولے بادشاہو۔ یہاں کوئی کسی کا پارٹنر نہیں ہے۔ میاں صاحب وزیر کی کرسی پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں اور حاجی صاحب بھی اس کی پارٹی میں شمولیت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ میاں کیا اندھا ہے۔ اُسے دکھائی نہیں دیتا کہ مستقبل میں اس کے لیے حاجی ہی سب سے بڑا خطرہ ثابت ہوگا ___ وہ حاجی کے بزنس کے خلاف نہیں ___ البتہ اس کے سیاست میں منہ مارنے کو بُرا سمجھتا ہے۔ اس نے یہ جھٹکا دلایا ہے حاجی صاحب کو۔"

ایس پی صاحب نے بات کھول دی۔

"اچھا سر! آپ کا شکریہ۔ جہنم میں جائیں دونوں ___ ہمیں تو اپنی ڈیوٹی سے غرض ہے ___"

شیخ صاحب نے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے اُسے سیلوٹ کیا تو ایس پی باجوہ نے اپنا ہاتھ بھی گرم جوش مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تھینک یو شیخ صاحب کوئی کام کی بات مل جائے تو ہمیں ضرور آگاہ کیجیے۔"

دمِ رخصت اس نے شیخ صاحب سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈی ایس پی شیخ صاحب کے ہاتھ ایسی بات آ گئی تھی جس سے وہ حاجی صاحب کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ سکتا تھا یوں تو انہوں نے شیخ صاحب کی خدمت میں ویسے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

لیکن ــــــ

اتنی اہم بات ــــــ حاجی صاحب تو پھڑک اٹھے گا اس اطلاع پر۔ یہی سوچتے ہوئے شیخ صاحب جیل کی طرف جا رہے تھے۔ بظاہر تو انہوں نے تفتیش کا بہانا بنایا تھا لیکن اصل میں اُن کی آمد کا مقصد کچھ اور ہی تھا ــــ!

عام قیدیوں کی ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا لیکن جس سپرنٹنڈنٹ کی اس وقت ڈیوٹی تھی وہ محکمہ جیل خانہ جات کا کم اور حاجی صاحب کا ذاتی طور پر زیادہ نوکر تھا۔

شیخ صاحب کو اُس نے اپنے دفتر میں بڑی عزت سے بٹھایا تھا۔ اس وقت وہی ساری جیل کا انچارج تھا۔ اس نے حاجی صاحب کو بھی تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں بلا لیا تھا اور اب خود نوکروں کی طرح ہاتھ باندھے اُن کے سامنے بیٹھا تھا۔

شیخ صاحب نے حاجی کو آنکھ کے اشارے سے سمجھا دیا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنے آیا ہے۔ یوں بھی وہ لمبے عرصے سے حاجی اور اس کے گروہ کی خدمات انجام دے رہا تھا۔ حاجی جانتا تھا کہ اس وقت جیل میں اچانک اس کی آمد ضرور ہنگامہ خیز ہی رہی ہو گی۔ اس نے ڈپٹی کو باہر جانے کے لیے کہا تھا اور اس گدھے نے اس حکم پر عمل کیا۔

"خیریت شیخ صاحب۔ ایسی کیا مصیبت آ گئی تھی۔ آپ فون پر بات کر لیتے۔ میرا مطلب ہے اس طرح آپ کا خود چلے آنا کہیں حالات کو مشکوک ہی نہ بنا دے۔"

حاجی نے چھٹتے ہی کہا۔

"حاجی صاحب ــــــ مجھے کسی نے آتے نہیں دیکھا اور ڈپٹی آپ کا بچہ ہے اس نے میری آمد کا کوئی ریکارڈ تو رکھا نہیں نہ ہی میں نے یہاں اپنی آمد درج کی ہے۔ میں ڈی ایس پی ہوں حاجی صاحب۔ میں نے بائیس سال پولیس سروس میں گزارے ہیں۔ کوئی جھک نہیں ماری۔ میں ایسی ملاقاتیں ریکارڈ پر نہیں لایا کرتا اور آپ جانتے ہیں کہ عدالت زبانی جمع خرچ کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس لیے مطمئن ہو جائیں کہ کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹنے والا۔ اگر ایسی بات ہوتی بھی تو آپ سے زیادہ میرے لیے پریشان کن ہوگی اور میں ایسی صورتِ حال سے نمٹنا خوب جانتا ہوں۔ اپنے سالا صاحب کوئی معمولی افسر نہیں ہیں۔"

شیخ صاحب نے گوہر افشانی فرمائی۔

"اچھا کہو کیا بات ہے۔ کیا اہم خبر لائے ہو۔"

اس نے شیخ کو کریدتے ہوئے مطلب کی بات پر آنے کے لیے کہا۔

آپ جانتے ہیں اس سارے ڈرامے کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ کس نے پولیس کو اتنی ہمت دلائی کہ وہ آپ پر ہاتھ ڈالے۔

شیخ نے حاجی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کون شیخ صاحب ــــــ کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

حاجی نے بے چینی سے پوچھا۔

"اپنے میاں صاحب ــــــ"

"کیا ــــــ؟"

جیسے ہی شیخ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے حاجی اپنی جگہ سے اچانک یوں اُٹھ کر کھڑا ہوا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں ـــــ ایم این اے میاں صاحب ۔ جو کل تک تمہارے اور بلے شاہ کے ٹکڑوں پر پلتا تھا ـــــ"

شیخ صاحب نے کہا ۔

"شیخ صاحب کہیں یہ کوئی چال تو نہیں ـــــ اس کی یہ ہمت ۔"

حاجی کو اس خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا ۔

"ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں تمہارے دشمنوں اور آستین کے سانپوں سے باخبر رکھنا میرا فرض ہے حاجی ـــــ آگے تمہاری مرضی ۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ کوئی پولیس آفیسر تم پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت بھی کرے ـــــ لیکن اب میں نے تصدیق کر لی ہے کہ اس ڈرامے کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا ۔"

شیخ صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا ۔

"لیکن تم کیسے کہہ سکتے ہو ـــــ شیخ صاحب یہ معمولی الزام نہیں ہے ۔"

حاجی نے پھر بے یقینی سے کہا ۔

"دیکھو حاجی ـــــ پولیس رولز کے مطابق پہلا تفتیشی افسر نئے آفیسر کے ساتھ تعاون کرنے کا پابند ہے ۔ میں تمہاری آستین کے سانپوں کا پتہ جاننے کے لیے ہی باجوہ سے ملنے گیا تھا ۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو تمہارا کھا کر تمہاری ہی تھالی میں چھید کرتے ہیں ـــــ کیونکہ سلیم باجوہ کوئی ثبوت لیے بغیر تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا ۔ لیکن اس نے جب مجھے بتایا کہ اس کے پاس کوئی ثبوت وغیرہ نہیں ہے تو میں حیران رہ گیا میرے کریدنے پر اس نے مجھے اعتماد میں لے کر اس وعدے کے بعد کہ میں اسے تمہارے خلاف ثبوت اکٹھے کر کے دوں گا یہ بات بتائی ہے کہ یہ ساری کارروائی میاں کے کہنے پر ہوئی ہے ۔

شیخ صاحب نے وضاحت پیش کی ۔

"اگر یہ سچ ہے شیخ صاحب تو پھر ان کے دن بھی گنے چنے ہی سمجھو ۔ تم ابھی ذرا معاملہ لمبا کرتے جانا ۔ میری بات سمجھ گئے ناں ـــــ"

حاجی نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی ۔

"حاجی صاحب ہم تو یاروں کے یار ہیں ـــــ جس سے دوستی کی آخر تک نبھاتے ہیں ۔"

شیخ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ۔

اور ہم بھی ـــــ"

حاجی نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اُن کے لیے چائے لے آیا تھا ۔ دونوں چائے پینے لگے جس کے بعد حاجی نے وہاں میز پر رکھی کاغذ کی ایک سلپ اُٹھائی اور اُس پر اپنے دستخط کر کے کچھ لکھ کر شیخ صاحب کو تھما دیا ۔

"راجی سے مل لینا ـــــ آج کی تمہاری محنت کا انعام مل جائے گا ـــــ شکریہ ـــــ"

یہ کہتے ہوئے حاجی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا ۔

ڈپٹی جو دروازے کے باہر کھڑا تھا ، چپراسیوں کی طرح ہاتھ باندھتا اندر آ گیا ۔

"شیخ صاحب کو چھوڑ آؤ ـــــ"

حاجی نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا ۔

"جو حکم حاجی صاحب ـــــ"

ڈپٹی نے دانت نکالے اور شیخ صاحب کے ساتھ ڈیوڑھی تک آ گیا ۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے شیخ صاحب کو ڈیوڑھی کے باہر سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے رخصت کیا تھا۔

شیخ کے جاتے ہی حاجی نے ڈپٹی کے کمرے سے ایک فون نمبر ملایا۔ دوسری طرف تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد ایک نسوانی آواز نے "ہیلو" کہا۔

"شاہ صاحب سے کہو مجھے فوراً فون کریں میں حاجی بول رہا ہوں۔"

اُس نے مختصر پیغام دیا۔

"او۔ کے سر ____"

دوسری طرف سے جواب ملا اور سلسلہ کٹ گیا۔

ابھی فون رکھے اُسے دو تین منٹ ہی گزرے تھے جب دوبارہ فون کی گھنٹی بجی۔ حاجی کے اشارے پر ڈپٹی نے خود فون اُٹھایا تھا۔

"السلام علیکم شاہ صاحب ____"

اس نے ہیلو کا جواب ملتے ہی مؤدب لہجے میں کہا اور فون حاجی کی طرف بڑھا دیا۔

"شاہ صاحب ہیں ____"

"ٹھیک ہے تم جاؤ ____"

حاجی نے فون پکڑ کر کہا۔

"جو حکم حاجی صاحب ____"

کہتا ہوا ڈپٹی دوبارہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

"اقبال شاہ ____ تم نے میاں کو کچھ زیادہ ہی منہ لگا لیا ہے۔"

حاجی نے چھوٹتے ہی اپنے ماضی کے شاگرد اور آج کے بین الاقوامی سمگلر سے کہا۔ اس ملک میں بالے شاہ کے ساتھ اس لہجے میں اس کے علاوہ اور کوئی

بات نہیں کر سکتا تھا۔

"میں سمجھا نہیں حاجی صاحب۔"

اقبال شاہ نے دوسری طرف سے حاجی کو کُریدا۔

جواب میں حاجی نے اُسے شیخ کی طرف سے فراہم کردہ ساری اطلاعات من و عن منتقل کر دیں اور ایم این اے میاں صاحب کے کرتوت سے بھی آگاہ کر دیا۔

بالے شاہ نے دنیا ہی نہیں، سلیم باجوہ کے ہاتھ بھی بخوبی دیکھ رکھے تھے اس نے اتنا سمارٹ پولیس آفیسر یورپ میں بھی شاید ہی کوئی دیکھا ہو گا۔

جو بات حاجی کے گاؤدی دماغ میں اُلجھن بن کر پھنسی ہوئی تھی اُس کو اقبال شاہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ باجوہ کی چال ہے۔

اُس نے جان لیا تھا کہ باجوہ کو اندازہ ہے کہ شیخ صاحب اُن کا "ہتھ ٹوکا" ہے۔ اس لیے اس نے اپنی دانست میں بڑی معصومیت سے حاجی کو میاں سے ٹکرا دیا تھا حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی ____!!

کچھ بھی ہو۔ اُس نے سوچا اب وقت آگیا ہے کہ وہ بھی اپنے پتے شو کرے۔

اُسے بھی اب کوئی مضبوط چال چلنی تھی۔

اُسے سلیم باجوہ کے نہلے پر دہلا مارنا تھا۔

تب ہی تو وہ اپنے زخموں پر کچھ مرہم رکھنے کے لائق ہوتا اور خود میاں بھی تو "سولو فلائٹ" پر چڑھا ہوا تھا۔

سالا! دو ٹکے کا غنڈہ۔ منسٹری کے خواب دیکھ رہا ہے۔

"چلو یوں ہی سہی۔ حاجی کے ہاتھوں ہی یہ کارِ خیر انجام پا جائے۔"

اُس نے سوچا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک لمحے میں اس کے شیطانی ذہن نے خطرناک منصوبہ تیار کر لیا۔ وہ بظاہر سلیم باجوہ کے بچھائے ہی کھیل کو اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا تھا۔

"حاجی صاحب۔ میں بھی نوٹ کر رہا ہوں۔ یہ سالا کچھ زیادہ ہی اونچا اڑنے لگا ہے۔ اس کے پر کاٹنے ہوں گے اسے زمین پر لانا ہو گا۔"

اقبال شاہ نے بھی اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

"کر دا دوں آج رات ہی صاف ــــ"

حاجی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"حاجی صاحب! میں نے اس کے پر کاٹنے کو کہا ہے گردن کاٹنے کو نہیں۔ آخر وہ ہمارا یار ہے۔ یوں بھی میں اپنے شکار کو آسانی سے نہیں مارا کرتا۔ حاجی صاحب الیکشن نزدیک آ رہے ہیں۔ ہماری وجہ سے اس کی پارٹی کو مفت ہی ایک "شہید جمہوریت" کیوں ملے ــــ کمال ہے آپ تو انہیں بغیر خرچے کے اگلی حکومت دلوا دیں گے۔"

اقبال شاہ نے حاجی کو الجھا دیا۔

"میں سمجھا نہیں بالے شاہ۔ کھل کر بات کرو۔ تمہاری طرح مجھے سیاست نہیں آتی۔ میں تو سیدھا سادا کاروباری بندہ ہوں۔"

حاجی نے وضاحت چاہی۔

"حاجی صاحب۔ آپ جانتے ہیں ناں اس جہان خان کے بچے کو ــــ"

"وہ تمہارا پانڈی ــــ"

حاجی نے پوچھا۔

"ہاں وہی ــــ آج کل اس کے کندھوں پر بیٹھ کر میاں صاحب غبارے اڑا رہے ہیں۔ پرسوں وہ آئے گا مجھے ملنے۔ پرسوں علی الصباح جیسے ہی وہ

ہوٹل سے باہر نکلے سالے کو کار سمیت اڑا دو۔ اس کی موت سے میاں جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ میں بھی اس کی بے بسی کا تماشہ دیکھ لوں۔ سمجھ گئے ناں۔ تمہارا قرضہ بھی اتر جائے گا۔ اگر میاں مر گیا تو اسے کون بتلائے گا کہ اس کو کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔"

بالے شاہ نے بڑی مکاری سے اپنی چال چلی اور حاجی مچھلی کی طرح اس کے کانٹے میں پھنس گیا۔

"واہ بھئی بالے شاہ ــــ تو میرا صحیح شاگرد نکلے گا ــــ یار کمال کی بات ہے واقعی اسے اپنی غلطی کا تو احساس ہونا چاہیے ناں ــــ زندہ باد بالے شاہ۔ زندہ باد۔"

حاجی کے منہ سے بالے شاہ کو بے اختیار داد ملنے لگی ــــ دوسری طرف بالے شاہ اس کے گدھے پن سے محظوظ ہو رہا تھا۔

اس نے حاجی صاحب کو سلام کہہ کر رابطہ کاٹ دیا۔

اب حاجی اپنے کمرے کی طرف واپس جا رہا تھا۔ ڈپٹی کو اس کا "حق خدمت" اس کے گھر پر وصول ہو جاتا تھا۔ وہ قریباً جھکتے ہوئے حاجی صاحب کے سامنے کورنش بجا لایا تھا۔

دوسری طرف شیخ صاحب کی جیل سے واپسی کے قریباً دس منٹ بعد ہی ایس پی سلیم باجوہ کے فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف انسپکٹر رفیق اس سے مخاطب تھا۔

"سر آپ کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہی اس کا خاص آدمی ہے۔ شیخ کی ملاقات اس نے حاجی سے اپنے کمرے میں کروائی ہے۔ شیخ ابھی ابھی واپس گیا ہے۔"

"ویل ڈن ــــ شاباش ــــ اب تم دوسرے کام کا آغاز کر دو۔"

دوسری طرف سے ایس پی سلیم باجوہ نے انسپکٹر رفیق کو شاباش دیتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کہا۔

انسپکٹر رفیق کو اس نے بطورِ خاص اپنے سکواڈ میں شامل کیا تھا۔ وہ اس کی کارگزاری پر بڑا خوش تھا اور سمجھتا تھا کہ رفیق ضرور بلبل شاہ کی کمی پوری کرے گا جسے اس نے بڑی تگ و دو کے بعد اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ذریعے بیرون ملک علاج کے لیے بھیجنے کا بندوبست کر لیا تھا۔!

ایک پُراسراری مسکراہٹ باجوہ کے ہونٹوں پر رقصاں تھی جس میں فتح کا تاثر نمایاں تھا۔

اس نے اپنی دانست میں "بلائنڈ" ہی کھیلا تھا۔

لیکن

بڑے کام کے پتے اس کے ہاتھ لگے تھے۔

○

ایم این اے میاں صاحب اپنی نئی معشوقہ نیلم کے ساتھ خوابِ استراحت کے مزے لوٹ رہے تھے جب اس کے سرہانے رکھے اس ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی جو میاں صاحب کا خاص نمبر تھا اور جس کی گھنٹی بھی خاص حالات ہی میں بجا کرتی تھی۔

"ہوں ں ں ــــ"

اس نے نیند سے ڈوبی آواز میں کہا۔

لیکن ـــــ

دوسری طرف سے ایک غیر مانوس آواز نے اس کی نیند حرام کر دی۔ خدا جانے اس شخص کو یہ نمبر کس نے دیا تھا اور وہ کون تھا کیونکہ اس فون پر کبھی کوئی غیر مانوس آواز نہیں آ سکتی تھی۔

"کون ہو تم ــــ؟"

میاں صاحب نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحب میں آپ کا وفادار اور انتہائی مخلص ہوں۔ مجھے علم ہے آپ کو نیند سے بیدار ہونے پر بہت غصہ آ رہا ہو گا لیکن ایک بات یاد رکھیے کہ اگر آپ نے غصہ کھا کر فون بند کر دیا تو پھر زندگی بھر شاید آپ کو پچھتانے کا موقع بھی نہ مل سکے۔"

دوسری طرف سے بڑے پُرسکون لہجے میں کہا گیا۔

"دیکھو تم نے کوئی رانگ نمبر ملا دیا ہے۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔ میرا دماغ نہ چاٹو۔ ایک بات یاد رکھنا کہ میں نے اپنے اس فون پر "آبزرویشن" لگوا رکھی ہے۔ اگر تم نے دوبارہ مجھے تنگ کیا تو میں تمہیں زمین کی ساتویں تہہ سے نکال کر کتے کی موت مروا دوں گا۔"

میاں صاحب نے یہ بات اتنے غصے سے کہی تھی کہ ان کے پہلو میں سوئی نیلم بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"میاں صاحب اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھیں۔ میں تو اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹ کر آپ کو طشتری میں رکھ کر پیش کر دوں گا ـــ لیکن آپ نے میری بات پر دھیان نہ دیا تو یہ تحفہ لینے کے لیے شاید آپ کا وجودِ مسعود اس دنیا میں باقی ہی نہ رہے۔ کمال ہے میں آپ سے انعام لینے کی توقع پر آپ کو اہم ترین اطلاع دینے جا رہا ہوں اور آپ مجھ ہی کو ڈانٹ رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے اتنے پُراعتماد لہجے میں بات کی گئی کہ ایک مرتبہ تو میاں صاحب بھی چکرا کر رہ گئے۔

"اچھا اچھا کہو ـــ کیا بات ہے ـــ لیکن یاد رکھنا تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میاں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحب، آپ بے وقوف بن چکے ہیں۔ کل پرسوں تک آپ پر یا آپ کے کسی انتہائی قریبی ساتھی پر حملہ ہوگا ——— حاجی نے آپ کو مارنے کے لیے راجی بدمعاش کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ مجھے اس کی وجہ تو معلوم نہیں لیکن اگر آپ اگلے ۴۸ گھنٹے تک زندہ رہے تو اس خاکسار کو انعام دینا نہ بھولیے۔ میں اپنی جان پر کھیل کر آپ تک یہ اطلاع پہنچا رہا ہوں ——— اس دوران آپ کو میری بات کی صداقت کا یقین بھی آجائے گا۔"

دوسری طرف سے جواب ملا۔

"تم کیا مجھے گدھا سمجھتے ہو ——— اُلو کے پٹھے میں کسی حاجی کو نہیں جانتا۔ خبردار جو دوبارہ فون کرنے کی جرأت کی۔ میں تمہاری زبان کٹوا دوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے گو کہ میاں صاحب نے فون کو سختی سے کریڈل پر پٹخا تھا۔

لیکن ———

انہیں اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ دوسری طرف اُن کی پوری بات سننے سے پہلے ہی فون کرنے والے نے فون رکھ دیا تھا۔ شاید اس کا کام ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا ڈارلنگ ——— کیا بات ہے ——— کون تھا یہ؟"

نیلم جس کے ہاتھوں کے طوطے ابھی سے اُڑ گئے تھے گھبرائے ہوئے میاں صاحب سے پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں کوئی بے وقوف گدھا تھا ——— مجھے اُلو بنانے جا رہا تھا۔"

میاں نے اپنے سرہانے رکھی چھوٹی میز کی دراز سے گولیوں کی شیشی نکال کر ایک گولی پانی کے ساتھ حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ اُسے شدت سے خود کو

نارمل رکھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

"میاں صاحب خدارا کچھ تو بتائیے ———"

نیلم واقعی گھبرا گئی تھی۔

"کچھ نہیں جان ——— کوئی بات نہیں۔ کوئی گمراہ کرنا چاہتا ہے مجھے ——— کہہ رہا تھا حاجی مجھے یا میرے کسی قریبی ساتھی کو مروانا چاہتا ہے۔ بھلا حاجی کو کیا ضرورت آن پڑی ہے۔"

اس نے نیلم کو مطمئن کرنا چاہا

"لیکن میاں صاحب یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ آخر فون کرنے والے کو آپ کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔"

نیلم نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

اس کے لیے ایسے حالات کا پیدا ہونا عطیہ خداوندی کے مترادف تھا۔ اسی نوعیت کے کرائسس سے فائدہ اُٹھا کر ہی وہ میاں صاحب کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کر سکتی تھی۔

"دیکھا جائے گا ——— میں نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں!"

گولی نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور میاں صاحب بہادر نظر آنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

"اور کیا....."

نیلم نے میاں صاحب پر وزن ڈالتے ہوئے کہا۔

اگلے ہی لمحے وہ چاروں شانے چت اپنے بستر پہ ڈھیر ہو چکے تھے۔

میاں صاحب کو اُس رات ایک پل کے لیے بھی دوبارہ نیند نہ آئی۔

اُن کے پاس فون کرنے والے کی "ہمدردی" کا جواز موجود تھا۔ وہ جانتے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ ایسے لوگ انعام اور دولت کے لالچ میں کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ عین ممکن ہے وہ حاجی کے گروپ کا کوئی ایسا ممبر رہا ہو جس کے ساتھ زیادتی ہوگئی ہو لیکن وہ سامنے آکر بدلہ لینے سے قاصر ہو۔

وجہ کچھ بھی تھی ــــ اگر یہ اطلاع صحیح ثابت ہو جاتی تو میاں صاحب کے لیے تو وہ محسن ہی کہلاتا۔

ایم این اے میاں صاحب نے صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلے اپنی نئی سیاسی جماعت کے مرکزی دفتر سے رابطہ کر کے اپنے سیکورٹی انتظامات سخت کروانے کی درخواست کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کے سابقہ حلیف اور موجودہ حریف اُن کے پارٹی چھوڑنے کے فیصلے کو ہضم نہیں کر سکے اور وہ اُن کے خلاف انتقامی کارروائیوں پر اُتر آئے ہیں۔

پارٹی کی طرف سے ہنگامی بنیادوں پر اُن کے حفاظتی اقدامات مزید سخت کر دیے گئے۔ اُن کی درخواست پر ان کے گھر پر پہرے داروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

پارٹی کے ساتھ ساتھ میاں صاحب نے اپنی ذاتی فورس کی تعداد میں بھی اضافہ کر لیا تھا۔ یہ اُن کے جرائم کی دنیا کے ساتھی تھے۔

○

جہاں خان نے ساری زندگی بالے شاہ کے باندی کی حیثیت سے گزاری تھی۔

لیکن ــــ

اس درمیان اس کے تعلقات ڈرگ کے قریباً تمام بڑے بڑے بیوپاریوں سے قائم ہو چکے تھے اور اُس نے اپنی اس طرح کی حیثیت بنالی تھی کہ وہ لوگ

جہان خان پر اعتماد کر سکتے تھے۔ ایم این اے میاں صاحب سے اُس کا تعارف بالے شاہ کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ جب وہ میاں صاحب کے لیے مال لے کر گیا تھا۔ وہ بڑا ماہر ڈرائیور تھا۔ کئی دفعہ پولیس کی فائرنگ کے درمیان سے مال نکال کر لے جا چکا تھا۔

اب بھی اُسے اپنے فن پر کمال حاصل تھا۔

میاں صاحب کے ساتھ اس نے دو تین چکر ہی لگائے تھے کہ اُس کا شمار "بڑے لوگوں" میں ہونے لگا تھا اور ماضی کا باندی جہان خان اب خود ڈرگ کا بڑا اسمگلر بن چکا تھا۔ بالے شاہ نے کبھی اُس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ جس سے جہان خان نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ شاید اُسے جہان خان کے کاروبار پر کوئی اعتراض نہیں رہا۔ یوں بھی اُس کے اور بالے شاہ کے درمیان کبھی اس نوعیت کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ساری زندگی کے لیے اس کی غلامی کا پٹہ ہی اپنے گلے میں ڈال لے گا اور اس کے اشاروں پر ہی بندروں کی طرح ناچتا رہے گا۔

جہان خان نے ایک عقلمندی ضرور کی تھی کہ اپنی ہی مثال سے سبق سیکھتے ہوئے میاں صاحب کا تعارف کبھی کسی بیوپاری سے براہِ راست نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اگلے پانچ دس سال میں بھی کبھی میاں میاں اس کی مدد کے بغیر یہ دھندہ جاری رکھ سکیں۔

دوسری عقلمندی اس نے یہ کی تھی کہ میاں صاحب کا اتنا زیادہ روپیہ اس دھندے میں لگوا دیا تھا کہ اب اُن کے لیے اس کا تسلسل توڑنا ناممکن ہو چکا تھا۔

الیکشن یوں بھی سر پر تھے اور میاں صاحب کو ہر پل پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے بھی اپنی طرف سے جہان خان کو "فری ہینڈ" دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا تھا کیونکہ اب وہ اس پوزیشن میں آ چکے تھے کہ ان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے کسی بھی ایجنسی کو بہت کچھ سوچنا پڑتا۔

طالب کمہار کا منہ بادلِ نخواستہ نوٹوں کے بنڈلوں سے بند کر کے انہوں نے اپنے حق میں ایسی انتخابی اخباری مہم شروع کروا رکھی تھی کہ لوگ ابھی سے یہ باور کرنے لگے تھے کہ میاں صاحب مستقبل میں کسی اہم وزارت پر فائز ہوں گے۔

یہی وجہ تھی کہ شہر کے بڑے بڑے مگرمچھ اُن کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ ان "مگرمچھوں" کی کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی۔ ان کا تعلق کراس کے دنوں میں "متوقع جیتنے والی" سیاسی جماعت سے ہوا کرتا تھا اور عام حالات میں برسرِاقتدار سیاسی جماعت سے۔

لیکن ——

اپنے بزنس کے اصولوں کی طرح وہ منافقت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ ہمیشہ برسرِاقتدار سیاسی جماعت کی مدد بھی کرتے رہتے اور ان کے مخالفین کی "حوصلہ افزائی" بھی۔ وہ حکومت کے مخالفین کو یہ باور کروا دیا کرتے تھے کہ اگر انہوں نے کھل کر اُن کی حمایت کر دی تو حکومت ان کے خلاف ایسے اقدامات کرے گی کہ پھر وہ ان کی خفیہ مدد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

اور ——

حکومت کے مخالفین اُن کی اس "کمزوری" کا احترام کیا کرتے تھے۔ اُن کی طرف سے وقتاً فوقتاً فراہم ہونے والے فنڈز کے عوض انہیں یہ رعایت مل جاتی کہ جب کبھی اپوزیشن جلسے جلوس یا ہنگامہ آرائی کرتی تو ان لوگوں کے کاروبار توڑ پھوڑ سے محفوظ رہتے تھے۔

طالب کمہار پہ اگر ایم این اے میاں صاحب نے ایک لاکھ لگایا تھا تو اس کے عوض اس کی کاوشوں کے سبب دس لاکھ کمایا بھی تھا اور یہ کوئی مہنگا سودا نہیں تھا۔

طالب کمہار بھی ان سے کچھ کم بدفطرت نہیں تھا۔ منافقت اور حرام کاری میں وہ میاں صاحب کا بھی والد صاحب بنا ہوا تھا۔ جہاں ایک طرف اُس نے میاں صاحب سے نوٹ وصول کیے تھے وہاں دوسری طرف وہ اُن کے مخالفین کو بھی دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں ہی اس کی طرف سے اپنے اپنے حق میں چلائی جانے والی انتخابی مہم سے بڑے مطمئن تھے! دونوں ہی یہ سمجھ رہے تھے کہ طالب کمہار ان کے ساتھ بہت مخلص ہے۔ اور دوسری طرف طالب کمہار ایک ہی وقت میں اُن دونوں جیسے درجنوں اور گدھوں کو اسی طرح بیوقوف بنا کر دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔

اپنے اخبار کے ایڈیٹر کو اُس نے کبھی پرکاہ جتنی حیثیت نہیں دی تھی۔ اُسے تو کبھی کبھی اس بات پر حیرانی ہوا کرتی تھی کہ یہ شخص جو اس اخبار میں چپراسی لگنے کے لائق نہیں تھا۔ اس کا ایڈیٹر کیسے بن گیا۔ وہ جب چاہتا اور جس طرح چاہتا اس موم کے مادھو کی گردن گھما دیا کرتا تھا۔

اپنے اخبار میں موجود اپنے جیسے جرائم پیشہ بیمار ذہنیت کے چھوٹے ایڈیٹروں کو اس نے اپنے شکنجے میں اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ وہ بے چارے اپنی کسی بھی حرام کاری میں اُسے برابر کا حصہ دینے کے باوجود اس کی ڈانٹ اور ناز نخرے برداشت کرنے پہ مجبور تھے۔

جب بھی ان جرائم پیشہ نالائقوں میں سے کوئی اپنے طور پر کچھ کرنے کی کوشش کرتا تو طالب کمہار اخبار کے ایڈیٹر موم کے مادھو کی گردن اُس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف گھما کر اُسے زبردست جھٹکا دلا دیا کرتا جس سے اُس سبلے چارے کو نصیحت ہو جاتی اور وہ مستقبل میں اپنے گھر میں رات کو سوتے ہوئے بھی طالب کمہار سے ڈرنے لگتا تھا۔

اپنے اس "اخباری مافیا" کے سرپر وہ اتنا خود سر ہو چکا تھا کہ اس نے اخبار کو حلوائی کی دُکان جان کر نانا جی کی فاتحہ شروع کر رکھی تھی اور کوئی اُس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

میاں نے اپنی دانست میں طالب کمہار اور اُس جیسے اور ضمیر فروش صحافیوں کی مدد سے ایسا مافیا قائم کر لیا تھا جس کی مدد سے اُسے مستقبل میں خود کو وزارت کی کرسی پر بیٹھنے کی قوی اُمید ہو چلی تھی۔

لیکن ——

اس سارے سیٹ اپ کو چلانے کے لیے بنیادی اہمیت پیسے کی تھی۔ جب تک وہ ان صحافتی بندروں کو نوٹوں کا راتب ڈالتا رہتا اُس کا دھندہ چلتا رہتا جب اُس کی طرف سے سپلائی بند ہو جاتی دوسری طرف سے بھی منہ پھیر لیا جاتا۔

میاں الیکشن کی آمد سے پہلے دل کھول کر جوا کھیل رہا تھا۔ وہ اس اُمید پر سرمایہ کاری کر رہا تھا کہ کل ایک کے دس بنالے گا۔

اس سارے گورکھ دھندے میں بنیادی رول بہرحال جہان خان ہی ادا کرتا تھا جو اس کے لیے دھڑا دھڑ مال لا رہا تھا اور میاں صاحب کے مقامی غنڈے اس کی سپلائی کے لیے شہر میں باقاعدہ چینل بنائے ہوئے تھے۔

جہان خان نے بالے شاہ کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔

لیکن ——

بالے شاہ نے اپنی آنکھیں کبھی بند نہیں کی تھیں۔ اگر جہان خان نے ایسی مثال قائم کر دی تو کل کو اس کے دوسرے پانڈی بھی اُس کی تقلید کر سکتے تھے۔ وہ اپنے مقابل کوئی مثال پیدا ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اُسے باجوہ کے ہاتھوں جو جھٹکا لگا تھا اُس کا نقصان اس نے اپنے کارندوں پر تقسیم کر دیا تھا اور اس میں سب سے بڑا حصہ میاں کے ذمے آیا تھا۔ بالے شاہ نے اُس وقت تک ہی جہان خان کی طرف سے آنکھیں بند رکھنی تھیں جب تک میاں اپنے حصے کی مکمل ادائیگی نہ کر دیتا۔

لیکن ——

اب بالے شاہ کو جو اطلاعات ملی تھیں ان کے مطابق میاں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا تھا اور اُس کے سامنے ہر روز نئے بہانے تراش رہا تھا۔ ان حالات میں بالے شاہ کے لیے مزید صبر کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ خود کوئی قدم اُٹھاتا اُسے حاجی کی طرف سے سگنل مل گیا تھا گو کہ حاجی بھی ایس پی سلیم باجوہ کا مہرہ بن چکا تھا اور اُس کی بچھائی شطرنج پر چل رہا تھا لیکن اندریں حالات اُس کے لیے اس سے بہتر کوئی موقعہ نہیں تھا کہ مستقبل میں وزارت کے خواب دیکھنے والے میاں صاحب کو ٹھیک ٹھاک قسم کا جھٹکا دے سکے۔

اُس روز جہان خان مال لے کر شہر کی طرف جا رہا تھا تو بالے شاہ کو اس بیوپاری کی طرف سے مال اور راستے کی تفصیلات کا علم ہو گیا تھا جس نے جہان خان کو مال دیا تھا۔ جہان خان نے اپنی دانست میں سارے کام بڑے سلیقے اور احتیاط سے کیے تھے۔ اس نے میاں صاحب کے شہر پہنچ کر ٹرک سٹینڈ سے بڑے شاندار طریقے سے مال اُٹھا کر ایک محفوظ ٹھکانے پر منتقل کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نھا اور خود "پرنس ہوٹل" میں قیام پذیر ہُوا تھا۔

شام کو اس نے کمرہ بُک کروایا اور ہوٹل ہی سے میاں صاحب کو فون کرکے اپنی آمد سے مطلع کیا جنہوں نے اُسے اگلے روز دوپہر کے بعد گھر آنے کے لیے کہا تھا۔

اس مرتبہ میاں صاحب کی فرمائش پر جہان خان بڑی کھیپ لے کر آیا تھا۔

لیکن ——

اُس عقل کے اندھے کو اُس بات کا علم نہیں تھا کہ اُس کے دونوں ساتھی بالے شاہ کے خاص آدمی تھے جو اس کے ساتھ بالے شاہ کے حکم پر ہی چپکے تھے۔ انہوں نے رات ہی کو سارا مال اُس محفوظ ٹھکانے سے اُٹھا کر جو انہوں نے ہی جہان خان کو فراہم کیا تھا، بالے شاہ کے ٹھکانے پر پہنچا دیا تھا۔

لاکھوں روپے کی اُس کھیپ میں انہیں توقع سے بڑھ کر انعام اور مستقبل کے لیے بالے شاہ کا اعتماد حاصل ہو گیا تھا۔

جہان خان ساری رات ہوٹل میں رنگ رلیاں مناتا رہا جس کا بندوبست ہوٹل کے مالک نے میاں صاحب کے حکم پر کر دیا تھا۔ ایسے اہتمام کرنا اس کی خدمات کا حصّہ تھا۔

صبح دیر گئے تک وہ گہری نیند سوتا رہا جس کے بعد میاں صاحب کا ڈرائیور اُسے لینے کے لیے آ گیا۔ ائرپورٹ کے نزدیک واقع اس ہوٹل سے میاں صاحب کی کوٹھی کا فاصلہ قریباً ایک گھنٹے کا تھا۔ جہان خان آنے والے حالات سے بے خبر کار کی پچھلی سیٹ پر بڑے معزز رئیسوں کی طرح ٹانگیں

پسارے بیٹھا تھا۔

کار ایک ٹریفک سگنل پر رُکی تھی۔ جب ایک موٹر سائیکل سوار نے اس کے نزدیک پہنچ کر اُس انداز سے اشارہ کیا جیسے وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتا ہو۔ اس نے بڑا نفسیاتی حربہ آزمایا تھا۔ جہان خان نے اپنی دانست میں اُس کی بات سُننے کے لیے اپنی کھڑکی کا شیشہ کھول کر گردن باہر نکالی تھی جب موٹر سائیکل سوار کے ساتھی نے اچانک ہی اُس کی طرف ریوالور سیدھا کر لیا۔

جہان خان نے اپنی دانست میں بڑی تیزی دکھائی تھی اور فوراً ہی پیچھے ہٹا تھا۔

لیکن ——

اس کے پیچھے ہٹنے کی رفتار ریوالور سے نکلنی والی گولی سے زیادہ تیز نہیں تھی۔ فائرنگ کرنے والا بلا کا ہوشیار تھا۔ اُس نے بمشکل دس سیکنڈ میں تین گولیاں یکے بعد دیگرے جہان خان کی کھوپڑی میں اُتار دیں۔

ٹریفک سگنل کو شاید اُس کی موت کا ہی انتظار تھا۔

جیسے ہی ٹریفک لائٹ گرین ہوئی —— جہان خان کی زندگی کی سُرخ بتی جل گئی۔ وہ پچھلی سیٹ پر اس طرح سلیقے سے ڈھیر ہُوا تھا جیسے کسی نے اُسے اُٹھا کر سیٹ میں فِٹ کر دیا ہو۔

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی۔

موٹر سائیکل سوار نے بجلی کی سی پھرتی سے واپسی کا موڑ مُڑا۔ شاید کسی نے فائرنگ کی آواز سن لی ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن ———

گولی کس نے چلائی ؟

کس کو لگی ؟

اس کا اندازہ کسی کو نہ ہو سکا۔ موٹر سائیکل سوار تو جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ کسی نے ان کا تعاقب نہ کیا۔ کسی کو ان کی شناخت نہ ہو سکی۔ ہوتی بھی کیسے۔ اس نے اپنے سر پر ہیلمٹ چڑھا رکھا تھا اور دوسرے نے ٹوپی اور مفلر سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ موٹر سائیکل پر جعلی نمبر پلیٹ لگی تھی اور جس طرح کی موٹر سائیکل انھوں نے استعمال کی تھی ویسی ہزاروں موٹر سائیکلیں اس شہر بے مثال کے گلی بازاروں میں دن رات دوڑتی دکھائی دیتی تھیں۔

ڈرائیور کو یہ احساس ضرور ہوا تھا کہ گولی چلی ہے۔ کیونکہ وہ بھی کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ پٹاخے اور گولی کا فرق سمجھ سکتا تھا۔

لیکن ———

کس پر اور کس نے چلائی ہے۔ اس کا علم اُسے بھی اس لیے نہ ہو سکا کہ بے چارے جہان خان کو تو حلق سے آواز نکالنے کی مہلت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے سر میں تین گولیاں اتنی تیزی سے اُتری تھیں کہ وہ بمشکل اپنی گردن ہی گاڑی کے اندر سرکا پایا تھا۔

ڈرائیور کو اس حادثے کا علم اس وقت ہوا جب اُس نے لاشعوری طور پر اپنی چھٹی حس کے تابع سگنل کراس کرنے کے بعد پچھلی سیٹ کی طرف گردن گھمائی جہاں ایک وحشت ناک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

وہ بے چارہ پہلے تو لرز کر رہ گیا۔

ڈھنگ سے اُسے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ گو کہ یہ اس کے لیے کوئی

انوکھا منظر نہیں تھا۔ وہ بھی اس میدان کا کھلاڑی تھا۔

لیکن ———

فی الوقت اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ اس لاش کے ساتھ میاں صاحب کے گھر میں داخل ہونا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اگر پولیس اسے پکڑ لیتی تو نیا عذاب بن جاتا کیونکہ جہان خان کو بالآخر شناخت کر لیا جاتا اور میاں صاحب کے لیے نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا کہ وہ اُن کی گاڑی میں کیسے بیٹھا۔

اور ان حالات میں جب کہ انتخابات سر پر آ رہے تھے ان کے لیے ایسے سکینڈل کو "افورڈ" کرنا کارِ دارد ہوتا۔

کسی اضطراری عمل کے تابع اُس نے ایکسیلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ جلد از جلد گاڑی کو کسی ویران سڑک کی طرف موڑنا چاہتا تھا جہاں سے وہ میاں صاحب کی ہدایت لینے کے بعد ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکالتا۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ یہاں سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا۔

ڈرائیور نے اپنے حواس قائم رکھے اور گاڑی کو سنسان ماڈرن آبادی کی گلیوں میں گھماتا بالآخر شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف بھگا لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے شہر کے باہر پہنچ کر گاڑی کو کچے میں اُتار دیا تھا۔ اور اُسے دریا کے کنارے تک لے آیا تھا۔

یہاں پہنچ کر اس نے جہان خان کے پہلو میں رکھے اس ٹیلی فون کے ذریعے جو اس نے مرنے سے پہلے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا میاں صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ اور بڑے حوصلے سے انہیں یہ انتہائی تشویشناک خبر سنا دی۔

میاں صاحب کے تو ہاتھوں کے طوطے ہی اُڑ گئے تھے۔

اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور کپکپاتی آواز میں دریافت کیا۔

"کسی نے دیکھا تو نہیں۔"

"میاں صاحب ابھی تک تو نہیں دیکھا ورنہ میں یہ فن نہ دکھانے سے کررہا ہوتا۔ لیکن گولی چلنے کی آواز ضرور کسی نے سُنی ہو گی۔"

ڈرائیور نے قدرے چڑ کر جواب دیا۔

"اچھا! اچھا! شاباش نم لاش کو کسی بھی طرح ٹھکانے لگا دو ۔۔۔ لیکن ٹھہرو ۔۔۔ ٹھہرو ایک منٹ ۔۔۔ مجھے سوچنے دو۔ اچھا ٹھیک ہے تم اسے یہیں پھینک دو ۔۔۔ اور ہاں ساری جیبیں خالی کر دینا۔ کوئی شناخت باقی نہیں رہنی چاہیے۔ گاڑی کا کیا کرو گے ۔۔۔؟"

اُس نے اپنی بات مکمل کر کے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

"جناب آپ بے فکر ہو جائیں۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں یہاں سے گاڑی سیدھے اپنے ایک دوست کے سروس اسٹیشن پر لے جاتا ہوں اور اسے دھو کر سارے نشانات مٹا کر ہی واپس لوٹوں گا۔"

اُس نے اپنے نمبر بنانے ہوئے کسی بڑے انعام کی اُمید پر کہا۔

"شاباش ۔۔۔ خیال رکھنا کوئی ننک نشان کچھ باقی نہ رہے کسی کو علم نہ ہو کہ تم نے گاڑی کی سروس کیوں کروائی ہے۔"

میاں صاحب نے کہا۔

"میاں صاحب ہم آپ کے غلام ہیں آج تک شکایت کا موقعہ ملا ہے کیا جناب کو ۔۔۔ میں اُن لوگوں کو قابو کر لوں گا اگر کسی نے پوچھا بھی تو..."

ڈرائیور نے ہوشیاری دکھائی۔

"شاباش ۔۔۔ شاباش ۔۔۔ تم پیسوں کی پرواہ نہ کرنا اور ہاں گاڑی کو گھر لانے کے بجائے فیکٹری لے جانا۔"

یہ کہہ کر میاں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ڈرائیور اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ اُس نے اپنا کام بظاہر بڑی ہوشیاری سے اور کوئی نشان چھوڑے بغیر کیا تھا اور رحمان خان کی لاش گھسیٹ کر وہیں پھینک کر گاڑی کی سروس اپنے ایک "بھائی بند" کے سروس سٹیشن سے کروا کر سہ پہر کو میاں صاحب کی فیکٹری پہنچ گیا تھا جہاں سے اُس نے میاں صاحب کو "سب اچھا" کی رپورٹ بھی کر دی تھی۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھینک یو سر!

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سے انسپکٹر رفیق کی ملاقات سرکاری نوعیت کی تھی۔

لیکن ——

جب رفیق نے اُسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"باجوہ صاحب تو بڑے آدمی ہیں۔ مجھے انہوں نے کیسے یاد کر لیا"

اس نے حیرانگی سے پوچھا جب رفیق نے جیلر آصف کو بتایا کہ باجوہ صاحب ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کی خواہش ہے کہ اس ملاقات کی خبر اُن دونوں کے علاوہ اور کسی کو نہ ہو۔

"ٹھیک ہے کہاں جانا ہوگا"

بالآخر اُس نے پوچھا۔

"یہاں سے قریب ہی ایک ریستوران تک"

انسپکٹر رفیق نے بتایا۔

"چلیے ——"

جیلر آصف نے کہا۔

وہ بچپن ہی سے ایڈونچر پسند تھا اور جیل ڈیپارٹمنٹ میں اس لیے آیا تھا کہ اُس کے والد اور بڑے بھائی بھی اسی محکمے میں کام کرتے آئے تھے۔ ایک طرح کا یہ ان کا خاندانی کام بن گیا تھا۔ فی الوقت پولیس میں بھرتی بھی بند تھی۔

سلیم باجوہ کی شہرت اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ یہ وہی باجوہ تھا جس نے بھیس بدل کر بابے شاہ کا مال پکڑوایا اور اب حاجی ایسے بین الاقوامی شہرت یافتہ سمگلر کو گرفتار کیا تھا جو اب اس کی جیل میں گلچھرے اڑا رہا تھا۔

آصف کا جی چاہتا تھا کہ حاجی کی بوٹیاں نوچ لے۔

لیکن ——

وہ بے بس تھا۔

اُسے نوکری جوائن کیے ابھی آٹھ دس ماہ ہی گزرے تھے لیکن اس کی جہاں دیدہ نظروں نے بہت کچھ دیکھا اور سونگھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ ڈپٹی جیلر کی حیثیت حاجی کے ایک ملازم سے زیادہ نہیں اور جیلر صاحب کی ریٹائرمنٹ میں بمشکل چار ماہ باقی رہ گئے تھے۔ شاید وہ اپنی سروس کے آخری ایام میں کوئی ہنگامہ اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے۔ کیونکہ باقی ساری سروس میں بھی انہوں نے کوئی خاص نیک نامی نہیں کمائی تھی۔

یوں بھی وہ اب جیل کے معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتے تھے اُن کی زیادہ توجہ اپنی نوکری کے آخری ایام آرام اور سکون سے گزارنے پر لگی رہتی تھی۔

اس جیل میں حاجی کی حیثیت جیلر کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ "بی کلاس" کا حوالاتی ضرور تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے ساری جیل نے اپنے گلے میں اس کی غلامی کا طوق ڈال لیا ہو۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آصف کو اس صورتِ حال سے بہت اُلجھن ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ جب اُس نے جیل میں قیدیوں کے بند ہونے کے اوقات میں اُسے ڈپٹی جیلر کے کمرے میں فون پر کسی سے کرتے دیکھا تھا۔ تب سے اُسے ڈپٹی جیلر پر بھی شک ہونے لگا تھا۔

لیکن ——

وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

یہ بڑے پرانے پاپی تھے۔ ان لوگوں کی جڑیں محکمے میں بہت گہری تھیں اور جیل کا تقریباً سارا عملہ اُن کے اشارہ ابرو پر ناچتا تھا۔

اگر انہیں آصف کے عزائم کی ذرا سی بھی خبر ہو جاتی تو اس کے لیے نوکری جاری رکھنا ہی مشکل ہو جاتا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ ان غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف کچھ کر گزرے۔ اِس جیل میں ہیروئن کھلے بندوں فروخت ہوتی تھی جیل کے اندر ڈپٹی جیلر کا قانون چلتا تھا۔ وہ جس قیدی کو چاہتا بغیر الزام کے وحشیوں کی طرح پیٹ ڈالتا اور کوئی اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکتا کیونکہ اُس نے محکمے کے اعلیٰ افسران کو مٹھی میں لے رکھا تھا۔

اب اچانک اُسے جب سلیم باجوہ کی طرف سے ملاقات کا پیغام ملا تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

انسپکٹر رفیق کے ساتھ ایک ٹیکسی کار میں وہ عام شہریوں کی طرح اس ہوٹل تک گیا تھا جہاں اُس جیسے سرکاری ملازم کم ہی جانے کا تصور کیا کرتے تھے۔

اس نے بڑے مؤدب ہو کر سلیم باجوہ سے ہاتھ ملایا تھا۔

"یار چھوڑو اس افسری ماتحتی کو ——— نعیم کا کیا حال ہے اور شگفتہ کا ——"

اُس نے بڑی بے تکلفی سے اس کے بڑے بھائی اور بھابی کا نام لے کر پوچھا جو میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکہ گیا ہوا تھا۔

"سر ـــ آپ انہیں ..."

"ہاں بھئی میرا لنگوٹیا یار ہے۔ بس قسمت کی بات ہے۔ وہ ڈاکٹر بن گیا اور ہم چور سپاہی کے چکر میں پھنس گئے ہیں اور شگفتہ میری کلاس فیلو تھی ـــــ تمہیں تو یاد بھی نہیں ہو گا کہ اُس گدھے کا رشتہ تمہاری بھابی کے ساتھ میں نے طے کروایا تھا۔"

اس نے بے تکلفی سے آصف کے کندھے کو تھپتھپایا۔

آصف کے تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے ہو گئے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ خود کو خاصا دبا دبا محسوس کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بالآخر باجوہ مطلب کی بات پر آ گیا۔

"تم میری نوکری کی نوعیت جانتے ہو آصف ـــــ میں نے تمہیں یہاں اسسٹنٹ جیلر کی نہیں اپنے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے بلایا ہے۔ یوں تو میں تمہیں سرکاری طور پر بھی مدد کی درخواست کر سکتا تھا لیکن میں اس رشتے کو زیادہ قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا۔ تم نوجوان ہو لیکن جس باپ کے بیٹے اور جن کے بھائی ہو اُن لوگوں کی ایمانداری اور نیک نامی پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ مجھے اُمید ہے تم بھی انہی کی تقلید کرو گے۔ مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ تم نے ابھی تک جیل میں ہونے والے غیر قانونی اقدامات پر کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا۔"

باجوہ نے گفتگو کی تمہید باندھنے کے بعد گیند اس کے کورٹ میں پھینک دی۔

"کہاں اٹھاتا سر! سب چور ہیں۔ آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ میں تو استعفیٰ

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دینے سے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں تو یہاں بڑے عزائم لے کر آیا تھا لیکن اب میں سنجیدگی سے سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہوں۔ میں اس گندگی میں نہیں رہ سکتا۔"

آصف پھٹ پڑا۔

"شاباش ــــ تاکہ تمہارے جانے کے بعد ان شیطانوں کے لیے میدان بالکل ہی خالی رہ جائے۔"

باجوہ نے اُسے ٹوکا۔

"نہیں سر! یہ بات نہیں لیکن کوئی تو ہو ساتھ دینے والا ــــ یہ بڑا بدمعاش ڈپٹی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ تین ماہ پہلے حوالدار نواب دین کو اس نے گولی مروائی تھی۔ اس شہر کے تمام ڈکیت اور بدمعاش اس کے ذاتی دوست ہیں۔ تمام افسروں کو اس نے بلیک میل کر کے اپنی مٹھی میں لیا ہوا ہے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ جس کسی نے اس کے خلاف محکمانہ کارروائی کی شکایت کی۔ اس موذی نے جیل کے باہر اس پر حملہ کروا کر اس کی ٹانگیں تڑوا دیں ــــ سر! یہ وحشی درندہ ہے۔ جیل خانے کا نہیں وہ تو اس شہر کے غنڈوں بدمعاشوں کا تنخواہ دار ملازم ہے۔ کس کی مجال ہے جو اس کے خلاف زبان بھی کھولے۔ اب یہ جو حاجی وہ ڈرگ سمگلر ہمارے ہاں بند ہے تو کیا افسران کو علم نہیں کہ ڈپٹی کے اس سے...."

"میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے آصف ــــ"

باجوہ نے لوہا گرم دیکھ کر اس کی بات بیچ میں سے کاٹ کر چوٹ لگا دی۔

"حکم کریں سر! آپ میرے بڑے بھائی کی جگہ ہیں۔ اگر میں آپ کے کسی کام آ سکوں تو میرے لیے یہ بہت بڑی سعادت ہو گی۔"

آصف نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

ایس پی سلیم باجوہ نے اُنہیں سے تمام صورتِ حال سُن کر اُسے سمجھا دیا کہ

حاجی کی حیثیت کیا ہے۔ وہ آصف کی توقعات سے کہیں بڑھ کر خطرناک آدمی تھا۔ اس نے آصف کا تعارف انسپکٹر رفیق سے کرواتے ہوئے اُسے بتایا تھا کہ وہ کس طرح ان لوگوں کی مدد کر سکتا ہے۔

"کل سے تمہاری مستقل نائٹ ڈیوٹی ایک ماہ کے لیے شروع ہو گی۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ طریقہ میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے۔"

سلیم باجوہ نے اُسے ایک منصوبہ سمجھاتے ہوئے تلقین کی۔

"یس سر! اب آپ مطمئن ہو جائیں اور مجھ پہ چھوڑ دیں۔ انشاءاللہ آپ توقع سے زیادہ مستعد پائیں گے۔"

اس نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"آصف اس ملک کو تم جیسے پاکباز اور نیک طینت افسروں کی بہت ضرورت ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔ کوئی غیر ضروری خطرہ نہ مول لینا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔"

آصف نے کھڑے ہو کر ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

سلیم باجوہ نے بڑی گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دبایا تھا اور انسپکٹر رفیق ایک مرتبہ پھر اُسے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔

"افسوس ہمیں جہان خان کی آمد کا علم نہ ہو سکا۔ لیکن سمجھ نہیں آتی سر! کہ حاجی نے براہِ راست میاں پر حملے کی بجائے جہان خان کو کیوں نشانہ بنایا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اپنے دفتر میں نامعلوم لاش کی شناخت ہونے پر تبصرہ کر رہے تھے۔

انسپکٹر رفیق کو فوراً سمجھ آ گئی تھی کہ جہان خان کو کس نے قتل کیا ہو گا۔

"اصل میں ہمارا کھیل کوئی اور کھیل گیا۔"

باجوہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ کا اشارہ شاید بالے شاہ کی طرف ہے۔"

انسپکٹر رفیق کی اس بات نے باجوہ کو بہت متاثر کیا واقعی وہ ایک قابل آفیسر تھا جو آج تک محکمانہ بے حسی کا شکار ہوتا چلا آ رہا تھا۔

"ہاں — شیخ نے جیسے ہی حاجی کو کہانی سنائی ہو گی اس نے فوراً بالے شاہ کو فون کیا ہو گا۔ اور اس نے حاجی کے فون کے پس پردہ ساری کہانی سونگھ لی ہو گی۔ وہ بڑا مکار آدمی ہے۔ جہاں خان آج کل ایم این اے میاں کے ساتھ مل کر علیحدہ "بینٹ" چلا رہا تھا اور بالے شاہ میاں کو اس طرح معاشی جھٹکے دے کر اپنی اہمیت جتانا چاہ رہا ہے گا۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے ہیں رفیق صاحب! ایک طرف تو میاں اور حاجی کے درمیان دشمنی کی مستقل بنیاد پڑ گئی جس کا فائدہ وہ اُٹھاتا رہے گا اور دوسری طرف اس نے میاں کو احساس دلا دیا ہے کہ اس سے کٹ کر میاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ابھی میں حتمی بات تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ جہاں خان کی نقل و حمل کا علم بھی اُسے بیوپاریوں کے علاقے سے ہی ہوا ہو گا۔ وہاں کا یہ بے تاج بادشاہ ہے۔ اس نے ہی اپنے آدمی جہاں خان کے ساتھ لگائے ہوں گے جنہوں نے مال اس تک پہنچا دیا ہو گا۔ اور جہاں خان کا جھٹکا اس نے حاجی سے کروا کر جہاں اُسے اُلو بنا لیا ہے وہاں "انڈر ورلڈ" کے لوگوں کو بھی میسج دے دیا ہے کہ اس کا کوئی پانڈی اگر اس کی برابری کا خواب دیکھے تو اس انجام سے دوچار ہو گا۔"

سلیم باجوہ نے اُسے ساری کہانی سمجھا دی۔

"بہت مکار آدمی ہے سر! بڑا خطرناک ہے۔"

رفیق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"رفیق صاحب! اب تو اس کی حالت زخم خوردہ سانپ والی ہے۔ اب تو وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ زہریلا ہو چکا ہے — لیکن میں بھی اس کا سارا زہر نکال کر اسے کیچوے کی طرح زمین چاٹنے پر مجبور کر دوں گا — اس نے خود کو سمجھ کیا رکھا ہے۔"

باجوہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

جہاں خان کو حاجی نے بڑی آسانی سے صاف کروا دیا تھا۔

حاجی کو جیل میں اطلاع مل گئی تھی اور وہ خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ ڈپٹی جیلر کے کمرے میں رات کا کھانا کھا رہا تھا جب ڈپٹی نے اس سے کہا۔

"حاجی صاحب آپ ضمانت کروا ہی لیں۔"

"نہیں ڈپٹی۔ ابھی ایک اور کام باقی ہے۔ مجھے ابھی ایک آستین کے سانپ سے نمٹنا ہے۔ تم تو جانتے ہو میں زیادہ لفڑے میں پڑنے والا بندہ نہیں۔ جب آسانی سے جیل میں آنے جانے کی سہولت حاصل ہے تو میں سلیم باجوہ کو خود پر دوبارہ ہاتھ ڈالنے کا موقع کیوں دوں۔ بس کل پرسوں تک میں اپنے سیکرٹری صاحب کا نمبر لگا لوں — پھر ضمانت کرا لوں گا — میں اپنے ہاتھوں سے اس کی زبان کاٹنا چاہتا ہوں۔ اس کے ہاتھ بھی توڑ دوں گا۔ تاکہ نہ بول سکے نہ ہی لکھ کر بتا سکے کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے۔ سالا کتے کا پلّا۔ میں نے اس نالی کے کیڑے کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر چڑھا دیا تھا۔ سالے کی اوقات کیا بدلی کہ اس کا ضمیر ہی بدل گیا۔ مجھے ہی ڈنگ مارنے لگا۔ میں اس کا زہر نکال دوں گا ڈپٹی — اور ہاں تم کل صبح اپنے گھر میں اپنا انعام وصول کر لینا۔ ذرا محتاط رہا کرو۔ یہ باجوہ بڑا خطرناک آدمی ہے سنبھل کر قدم رکھنا —"

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاجی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"حاجی صاحب وہ خطرناک ہوگا اپنے گھر۔ اس جیل میں میرے حکم کے بغیر چڑیا پر نہیں مار سکتی۔ یہاں سپاہی سے افسر تک سب میرے حکم کے پابند ہیں۔ وہ میرے ملازم ہیں سرکار کے نہیں۔ حاجی صاحب ان لوگوں کو علم ہے کہ میرے حکم کی سرتابی کرنے کی سزا انہیں جیل کے اندر ہی نہیں باہر بھی ملے گی۔ وہ سالا حوالدار نواب دین بڑی اچھی مثال چھوڑ گیا ہے ان کے لیے۔"

ڈپٹی نے حاجی کی فراہم کردہ وہسکی کا گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

حاجی سے اُس نے شراب کے نشے ہی میں اگلی رات کچھ دیر کے لیے جیل سے نکلنے کا پروگرام طے کر لیا تھا۔

اور ——

آج وہی رات تھی جب حاجی کو اپنے سیکرٹری کا حساب چکتا کرنا تھا۔

جیل کے نئے حوالدار نے جو ذہنی حرام کاریوں میں ڈپٹی سے بھی دو ہاتھ آگے تھا اُس کو دبے لفظوں میں جیلر آصف کی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

لیکن ——

جس طرح آصف نے چند روز سے اُن کے ساتھ بے نیازی کا رویہ اپنا رکھا تھا اُس کے بعد سے ڈپٹی اُس کی طرف سے خاصا لاپرواہ ہو گیا تھا۔ آصف نے اُسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ خود کو اس محکمے میں "ان فٹ" سمجھتا ہے۔ اس نے تو لمبی چھٹی پر جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ڈپٹی صاحب سے درخواست کی تھی کہ اس کی چھٹی منظور ہونے تک اُسے آرام ہی کرنے دیں۔

ڈپٹی کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا۔ اُس نے بڑے جوش و خروش سے آصف کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بے فکر رہے کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

اس وقت بھی اسسٹنٹ جیلر آصف ملحقہ دفتر کے ایک کونے میں صوفے پر گہری نیند سو رہا تھا جب حاجی کے کمرے کا تالا کھول کر اُسے باہر لایا گیا۔ اس سے پہلے آصف نے ایک سفید رنگ کی کار جیل کے مین گیٹ کے نزدیک دیکھ لی تھی اور اب اُسے سارا معاملہ سمجھ آ گیا تھا کیونکہ اگلی رات جب وہ دونوں گدھے شراب کے نشے میں بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ اور وہ حسبِ معمول "گہری نیند" سو رہا تھا تو ان کے اگلی رات کے منصوبے کا اُسے علم ہو گیا تھا۔

اچانک ہی وہ انگڑائیاں لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں سر دوسرے کمرے میں سو جاؤں —— آپ کا بہت شکریہ۔"

اس نے ڈپٹی سے آنکھیں موندتے ہوئے پوچھا۔

"یار تم جیلر صاحب کے کمرے میں آرام کرو" —— پیارے کیوں نیند خراب کرتے ہو۔"

ڈپٹی نے اکڑتے ہوئے کہا۔

حاجی کی طرف دیکھے بغیر بظاہر آصف اس طرح نیند کی حالت میں وہاں سے باہر نکلا تھا کہ کسی کو اس پر معمولی شک نہ گزرتا۔

جیلر کا کمرہ ڈپٹی کے کمرے کے سامنے بنا ہوا تھا جو بالکل خالی تھا۔ کمرے میں گھس کر اس نے دروازہ اندر سے لاک کیا اور جیلر صاحب کی میز پر رکھا ڈیجیٹل ٹیلی فون فرش پر رکھ کر پھرتی سے ایک نمبر ملایا۔

"یس ——"

نمبر ملنے پر دوسری طرف سے باجوہ کی آواز سنائی دی۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سر! سعید گاڑی میں نکل رہے ہیں۔"

آصف نے مختصر سا پیغام دیا۔

باجوہ نے تین بائیں کہہ کر فون بند کر دیا۔

ٹیلی فون اپنی جگہ رکھ کر آصف نے دروازے کی کھڑکی کھول دی اور بظاہر گہری نیند سو گیا۔

O

حاجی صاحب کے لیے اس طرح رات کو کچھ دیر تک "آف دی ریکارڈ" جیل سے باہر رہنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بلبل شاہ کو جس روز اُن لوگوں نے قابو کیا تھا اُس روز بھی حاجی نے یہی طریقہ اپنایا تھا۔ اس طرح اس کے خلاف کوئی ثبوت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

آج بھی حسبِ معمول ایک گاڑی اُسے لینے آ گئی تھی جسے اس کا خاص آدمی چلا رہا تھا۔ حاجی کے لیے ڈیوڑھی کا دروازہ یوں کھلا تھا جیسے وہی محکمہ جیل خانہ جات کا آئی جی رہا ہو۔

کار میں بیٹھ کر بظاہر وہ بڑے اطمینان سے باہر سڑک تک آئے تھے جہاں اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

جیل شہر سے باہر بنی ہوئی تھی اور اسے بڑی سڑک تک پہنچانے کے لیے صرف ایک سڑک ہی یہاں سے جاتی تھی۔ متبادل راستہ کوئی نہیں تھا۔ اسی راستے سے لوگ آتے اور جاتے تھے۔ جیل سے کہیں بھی باہر نکلنے کے لیے قریباً دو ڈھائی کلومیٹر تک اس سڑک پر گاڑی چلانے کے بعد ہی بڑی سڑک پر پہنچا جا سکتا تھا۔

ڈرائیور معمول کی رفتار سے کچھ تیز ہی چل رہا تھا جب اُسے اچانک ہی

زور سے بریک لگانے پڑے۔

بات ہی کچھ ایسی تھی۔ سڑک کے کنارے سے ایک مٹی سے بھری ٹرالی اچانک ہی نمودار ہوئی تھی۔ یہ ٹرالیوں والے رات کو یہاں سے شہر میں مٹی وغیرہ لے جانے کے لیے اس سڑک کو استعمال کرتے تھے۔

اس طرح اچانک گاڑی رُکنے پر حاجی نے گالیاں بکتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنا چاہا۔ جب اچانک ہی ٹرالی کی پشت سے تین مسلح نوجوان سامنے آ گئے۔ انہوں نے حاجی اور اس کے ڈرائیور کو اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی مہلت دیے بغیر اُن پر قابو پا لیا تھا۔

پلک جھپکتے میں انہوں نے دونوں کے منہ ٹیپ سے بند کر کے اُن کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے تھے اور ٹرالی کے دوسری طرف کھڑی ویگن میں انہیں اس طرح اُٹھا کر پھینکا تھا جیسے وہ گوشت پوست کے انسانوں کے بجائے ردّی کے بنڈل ہوں۔

انہوں نے آخری منظر یہی دیکھا تھا کہ ٹرالی اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی اور ایک نوجوان نے ان کی کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

ویگن کو ڈرائیور چلا نہیں رہا تھا اُڑا رہا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کا سفر کس طرح کٹا۔ حاجی کو اس کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ وہ اس اچانک حادثے سے اتنا حواس باختہ ہوا تھا کہ اپنے ہوش و حواس ہی گنوا بیٹھا تھا۔

حاجی کے حواس جب قائم ہوئے تو اس کا دل شدت سے چاہا کہ وہ بے ہوش ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔

اس کے سامنے ایس پی سلیم باجوہ موجود تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم نے خود کو کیا سمجھ لیا تھا حاجی ___ بہت اُڑ رہے تھے اُڑنے لگے تھے۔ بس تو چاہتا تھا کہ یہ معاملہ قانونی طریقے سے ہی سلجھے ہو۔ لیکن تم نے اگر دوسرا میدان منتخب کر لیا ہے تو ایسے ہی سہی۔"

باجوہ نے زہریلے لہجے میں دانت پیستے ہوئے اس کی کمر میں ٹھوکر مار کر کہا۔

"دیکھو باجوہ صاحب تم ٹھیک نہیں کر رہے ___ تم بچ نہیں سکو گے۔ میں سارے شہر میں آگ لگوا دوں گا۔ تمہیں ابھی اندازہ نہیں کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں!"

حاجی نے ڈوبتے ہوئے تنکے کا سہارا لینا چاہا۔

"مجھے علم ہے تمہارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اسی لیے تو میں اس دن کا منتظر تھا۔ اب میں تمہارے دونوں ہاتھ توڑ دوں گا لیکن اس طرح نہیں جس طرح تم نے اے ایس آئی بلبل شاہ کے ہاتھ توڑے تھے بلکہ یوں کہ دنیا کا ماہر ترین سرجن بھی انہیں نہ جوڑ سکے۔ تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے حاجی ___ اب تم ساری زندگی پہیوں والی زبرڑھی پر بسر کرو گے ___ میں تمہاری ٹانگیں بھی توڑ دوں گا۔ تمہیں عبرت کا نشان بنا دوں گا ___ ہاں تمہاری زبان سلامت رہے گی تاکہ تم سارے شہر کو چلا چلا کر بتا سکو کہ تمہارا یہ حال میں نے کیا ہے ___ اور اپنے باپ بالے شاہ کو بھی جس کی تمہارے بعد باری آنے والی ہے ___ تم نے کیا سمجھ لیا تھا کہ بلبل شاہ اتنا بے بس ہے ___ میں تمہیں بتاؤں گا حاجی کہ اصل میں تم کتنے بے بس ہو!"

ایس پی باجوہ یوں شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا کہ حاجی کو اپنے بدن سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک ہی اس نے اپنے دائیں ہاتھ رکھی لوہے کی مضبوط سلاخ اُٹھائی اور دیوانہ وار حاجی پر پل پڑا۔

اگلے روز کا اخبار بڑی سنسنی خیز سرخیوں کے ساتھ آیا تھا۔

حاجی صاحب کو بے ہوشی کے عالم میں پولیس نے گمنام ٹیلیفون پر ایک کوڑے کے ڈھیر سے اس طرح برآمد کیا تھا کہ اُن کے دونوں بازو اور ٹانگیں اس بری طرح توڑ دی گئی تھیں کہ ڈاکٹروں نے حاجی صاحب کی جان بچانے کے لیے انہیں کاٹنا ناگزیر قرار دے دیا تھا۔

حاجی کو جیل سے فرار کروانے کے الزام میں پولیس نے ڈپٹی جیلر کو گرفتار کر لیا تھا جس کی مجرمانہ سرگرمیوں کے بہت سے ثبوت جیلر آصف ملہی نے فراہم کیے تھے۔

ڈاکٹر بلبل شاہ کے سامنے اخبار پھیلا ہوا تھا۔ وہ آج اپنے علاج کے لیے لندن جا رہا تھا۔

یہ سب باجوہ کی کوششوں کا نتیجہ تھا ___!

حاجی کے مسخ شدہ جسم کی تصویر اُس کے سامنے عبرت کی صورت چھپی ہوئی تھی۔ بلبل شاہ کی آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔

"تھینک یو سر! تھینک یو ___!"

بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔ جہاز کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لمبا ہاتھ

جہاں خان کی موت نے میاں صاحب کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی ــــــ!

اُس کی موت سے جہاں میاں صاحب کا لاکھوں روپیہ ڈوب گیا تھا وہاں مستقبل میں اس رقم کے دوبارہ حصول کی بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ انہوں نے حال ہی میں پارٹی تبدیل کی تھی اور اگلے الیکشن کے لیے اس پارٹی کے ٹکٹ حاصل کرنے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ میاں صاحب نے ساری زندگی اپنی سیاست کو اچھے بزنس مین کی طرح دکانداری سمجھ کر چمکایا تھا۔

جب کبھی وہ اپنی پوزیشن کمزور محسوس کرتے پارٹی فنڈ میں اضافہ کر کے اُسے مضبوط بنا لیتے۔

لیکن ــــــ

ابھی تک اُن کی وزارت کا خواب ادھورا تھا۔

اب انہیں وزارت کی اُمید دلائی گئی تھی تو اس لیے کہ انہوں نے پارٹی تبدیل کرتے ہی نئی پارٹی کے انتخابی فنڈز کے لیے اتنی بڑی رقم دے دی تھی۔ جس کا اس پارٹی نے کبھی کسی سے انفرادی طور پر تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اب جب الیکشن کے لیے ٹکٹوں کا اعلان ہونے والا تھا تو ملک صاحب کے ساتھ یہ ہاتھ ہو گیا تھا۔

جہاں خان کوئی معمولی سا کارندہ نہیں تھا۔ اسے آسانی سے مارا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ آخر اُسے کس نے مار ڈالا؟

کسی سرکاری ایجنسی نے؟

سب سے پہلے اُس کے دماغ میں یہی خیال سمایا تھا۔

لیکن ــــــ

اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پولیس کے ساتھ جہاں خان کے تعلقات کبھی کشیدہ نہیں رہے تھے۔ وہ تو "جیو اور جینے دو" کے اصول پر سختی سے کاربند تھا اور کبھی بلاوجہ خطرات مول لینے کا قائل نہیں رہا تھا۔ جب کبھی ایسی صورتِ حال پیش آ بھی جاتی تو وہ بہت محتاط ہو جایا کرتا تھا۔

اُسے بڑے پُراسرار طریقے سے ہلاک کیا گیا تھا۔ اگر کسی سرکاری ایجنسی نے ہی اسے مارنا تھا تو اس کی موت کو اتنا پُراسرار بنانے کی ضرورت آخر کیا تھی؟

یہی تھے وہ سوالات جنہیں وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

اُس روز بھی جب میاں صاحب اپنی نئی نویلی سیکرٹری کے ساتھ اپنے مستقبل کے پلان بنا رہے تھے تو انہیں کسی نے زہراں کی آمد سے مطلع کیا۔

میاں صاحب کے لیے عام حالات میں اس کی آمد کوئی خاص بات نہیں تھی۔

لیکن ــــــ

ان حالات میں اچانک ڈیڑھ دو سال بعد وہ اُن سے کیا لینے آئی تھی۔ انہوں نے زہراں کو بھلایا نہیں تھا۔ طالب کمہار کی داشتہ اور اُن کے سابقہ مشترکہ مرحوم دوست کی بیوہ جو آج کل شریفانہ چکلہ چلا کر اپنی زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہی تھی۔ طالب کمہار نے اس سے بھی وہی سلوک کیا تھا جو اُس نے میاں صاحب سے کیا حالانکہ اسی رنڈی کے ذریعے وہ آج اس مقام پر پہنچا تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جہاں بیٹھ کر جیسے جی چاہتا بلیک میل کر کے اپنا اُلو سیدھا کر سکتا تھا۔

"آؤ زہراں کس طرح اس طرف راستہ بھول پڑیں۔"

میاں صاحب نے اس کے سراپے پر غلیظ نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

انہوں نے آج سے دس بارہ سال پہلے جو پیش گوئی اُس عورت سے متعلق کی تھی وہ آج بھی سچ دکھائی دے رہی تھی۔ میاں نے کہا تھا کہ زہراں کی جوانی کبھی نہیں ڈھلے گی۔ واقعی وہ آج بھی ویسی ہی نظر آ رہی تھی جیسی آج سے دس بارہ سال پہلے تھی۔ شاید اُس نے اپنی اسی متاع کو عزیز رکھا تھا کیونکہ اُس نے زندگی میں جو کچھ پایا تھا وہ اپنے اس پاپی بدن کے بل بوتے پر حاصل کیا تھا اور اب بھی اُسے اُمید تھی کہ اپنا گمشدہ مقام بھی وہ اس بدن کو سیڑھیاں بنا کر حاصل کر پائے گی۔

اُسے یہاں اس کی عزیز سہیلی نیلم نے بھیجا تھا۔

نیلم نے ایک روز اُس کے گھر جا کر وعدہ کیا تھا کہ وہ طالب کمہار کے خلاف اس کی ہر ممکنہ مدد کرے گی اور اب بھی وہ جس شیطانی منصوبے کے ساتھ یہاں آئی تھی وہ زہراں کے دماغ میں نیلم نے ہی ڈالا تھا۔

لیکن

اس نے اپنا سود و زیاں سوچے بغیر اپنی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد بنا لیا تھا اور وہ تھا طالب کمہار کی تباہی۔

وہ طالب کو اس کی اوقات یاد دلانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

آج بھی وہ اُمید کی یہی کرن جگا کر یہاں پہنچی تھی۔ نیلم نے اُسے ایسا پلان سمجھا دیا تھا جس پر اگر وہ ذہانت سے عمل کر لیتی تو پھر اپنے اندر جلتی انتقام کی آگ کو سرد کر سکتی تھی۔

بصورتِ دیگر تو جس طرح رہ رہ کر اُسے اپنی محرومیوں کا احساس ستا رہا تھا اور یہ پچھتاوا کہ اُس نے طالب کمہار کے ہاتھوں جان بوجھ کر دھوکہ کھایا اُس کی جان کو آ رہا تھا اس کے بعد اُسے ہر وقت ایک ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی روز اُس کے دماغ کی شریان ہی نہ پھٹ جائے۔ اس کا بلڈ پریشر اب اکثر بے قابو ہو جاتا تھا۔

"میاں صاحب جہان خان کی موت کا بہت افسوس ہوا؟"

اُس نے اچانک ہی ایم این اے میاں صاحب کے اعصاب پر ہتھوڑا برسایا۔

میاں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی اس بات کا کیا جواب دے کیونکہ کم از کم اس نے اپنے اور جہان خان کے درمیان موجود تعلق سے کبھی کسی کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ زہراں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"تم .... آپ سے ——"

انہوں نے حیرانگی سے کہا۔

"ہاں میاں صاحب میں اُسے گزشتہ تین سال سے جانتی ہوں۔"

زہراں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کی حیرانگی کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

"میں سمجھا نہیں ——"

میاں صاحب چکرا کر رہ گئے تھے۔

"سب بتاتی ہوں آپ کو —— جہان خان کا آنا جانا میرے ہاں تب سے ہے جب اس نے آپ کا مال طالب کے ذریعے نکالا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا میاں صاحب جب طالب نے ایس پی باجوہ کا تبادلہ کروایا تھا۔ جہان خان مجھے ایک ایک بات بتایا کرتا تھا۔"

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے ایک لمحے کے لیے رُک کر میاں صاحب کی آنکھوں میں جھانکا جہاں یقینی اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیات نے بسیرا کر رکھا تھا۔ اُس نے نیلم کی طرف سے فراہم کردہ اطلاعات کی بنیاد پر میاں صاحب کو دو تین اور ایسے واقعات سنا دیے جن کے بعد انہیں اس بات کا یقین کرنا پڑا کہ جہان خان اور زہران کے درمیان بہت قریبی تعلقات تھے۔ اتنے قریبی کہ اس نے اپنے کاروبار سے متعلق بھی کوئی راز داری نہیں برتی تھی۔

زہران نے میاں صاحب کو یہ بھی بتا دیا کہ جہان خان نے دو تین مرتبہ اس سے کام بھی لیا تھا اور وہ محض اس کی محبت میں یہ کچھ کرتی آئی ہے۔

"مجھے آپ کے اور مرحوم کے خفیہ تجارتی تعلقات کا علم تھا، میاں صاحب لیکن میں اُس کی زندگی میں کبھی آپ کے پاس اس حوالے سے نہیں آئی ــــ میں آج بھی آپ کے پاس نہ آتی اگر اس کی موت میں مجھے طالب کمہار کا ہاتھ دکھائی نہ دیتا۔"

"کیا؟"

میاں صاحب اس کی آخری بات پر اس طرح اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے جیسے صوفے کے سپرنگوں نے انہیں فضا میں اُچھال دیا ہے۔

"ہاں میاں صاحب۔ اس نے یہی غلطی کی کہ میری طرح اس سانپ سے یاری کر لی۔ جس کی فطرت اپنے ہر دودھ پلانے والے کو ڈنک مارنا ہے۔ دراصل وہ پہلے روز ہی سے طالب کمہار کے جال میں پھنس گیا تھا۔ کیونکہ طالب کمہار نے چکر بازی سے ایس پی باجوہ کا تبادلہ کروا دیا تھا۔ جہان خان اسے بڑا طاقتور آدمی جاننے لگا تھا۔ اُس نے اس شہر میں مستقل ڈیرہ جما لیا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ طالب کمہار کے ذریعے کم از کم وہ پولیس سے ضرور نمٹ سکتا ہے۔ اس مرتبہ جب وہ آیا تو اس نے اپنا مال بھی طالب کمہار ہی کے ذریعے کہیں چھپایا تھا۔ اور اس بے ایمان، مکّار

دغاباز نے اقبال شاہ کے کارندے کے ذریعے جہان خان کو قتل کروا کر اس کا مال آدھا آدھا تقسیم کر لیا۔ میاں صاحب میرے خیال سے آپ کو میری بات پر یقین آ گیا ہو گا۔ اگر آپ چاہیں تو میں اپنی اس بات کے حق میں مکمل شہادتیں پیش کر سکتی ہوں۔"

اس نے کمال مکاری سے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"کتے کا پلا ــــ اس کی یہ مجال ــــ اور یہ باسط شاہ ..."

میاں صاحب کا غصے سے دماغ پھٹ رہا تھا۔

"میاں صاحب ــــ ایسے دغاباز کا مزید زندہ رہنا ظلم ہو گا ــــ اُسے مروا دیجئے۔ اُس نے اپنے اردگرد ایک مصنوعی جال بن رکھا ہے۔ یقین کیجئے اس کی موت سے کسی کے کان پر جوں نہیں رینگے گی۔ اُس کی اپنی برادری کے لوگ دن رات اس کی موت کی دعائیں کرتے ہیں ــــ آپ کو بہت سے ہمدرد مل جائیں گے۔ اُسے کوئی نہیں ملے گا۔ کیونکہ سب کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ سوائے اپنے مطلب کے اور کسی کا دوست نہیں اور اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے وہ کہاں تک گر سکتا ہے یہ بھی سب جانتے ہیں۔"

زہران نے جلتی پر تیل ڈالا۔

"زہران یہ اُس کا آخری وار تھا۔ اب میں اُسے دیکھوں گا۔"

میاں نے جوشِ غضب سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی ہر ممکن مدد کے لیے حاضر ہوں میاں صاحب۔ میری لڑکیاں کوئی بھی خدمت کر سکیں تو ــــ"

اس نے اپنا فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں زہران ــــ ابھی میاں غلام قادر اتنا بے بس نہیں ہوا کہ طالب کمہار

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو مارنے کے لیے عورتوں کی مدد لینا پڑے۔"

میاں کی آواز سے اس کے عزائم نمایاں تھے۔

اس نے زہران کا شکریہ بڑی گرمجوشی سے ادا کیا تھا اور تجدید تعلقات کی بنیاد رکھ دی تھی۔

زہران کے لیے گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ خود کسی ایسے سہارے کی متلاشی تھی جس کی مدد سے معاشرے میں اپنا چھنا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکے۔

○

اخبار والے شاہ کے سامنے کھلے پڑے تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے حاجی کی تصویر دیکھ رہا تھا ——— !!

جہاں اس کے لیے جہان خان کی موت باعثِ تسکین تھی اور اس نے اپنی دانست میں بڑی آسانی سے حاجی کو بطور ترپ بنا کر میاں صاحب سے ٹکرا دیا تھا۔ وہاں حاجی کا یہ حشر بھی باعثِ تشویش تھا۔

اس کے کارندوں نے حادثے کے کچھ ہی دیر بعد حاجی سے رابطہ کر کے حقائق تو اسے بتا دیے تھے۔

لیکن ———

وہ نہ بھی بتاتے تو بھی بابے شاہ جانتا تھا کہ یہ کس کا کارنامہ ہے؟

اس نے اپنی زندگی میں کبھی شکست تسلیم نہیں کی تھی لیکن اسے یوں لگتا تھا جیسے ایس پی باجوہ اسے ہرا دے گا۔ اس شہر میں باجوہ کی موجودگی اس کے لیے نیک شگون نہیں تھی۔ اسے آمدہ الیکشن میں سیاسی بندروں کو اپنی ڈگڈگی پہ نچا کر اپنا مستقبل محفوظ کرنا تھا۔

آنے والی حکومت کون سی ہو گی؟

اسٹیبلشمنٹ میں موجود اس کے "مہربانوں" نے اسے سگنل دے دیا تھا اور اس نے اب ان لوگوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنی تھی جو اگلے تین چار ماہ میں اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنے جا رہے تھے۔

یہ وہ سیاسی گدھے تھے جو ڈرگ منی کے بل بوتے پر اسمبلیوں اور اقتدار کے ایوانوں تک رسائی حاصل کرتے تھے۔ عام حالات میں شاید انہیں اپنے گھر والے بھی اپنے کنبے میں عزت دینا پسند نہ کرتے ہوں۔

لیکن ———

ڈرگ مافیا کے کندھوں پر سوار ہو کر یہ لوگ اپنے ملک کے لاکھوں کروڑوں شہریوں کے سروں پر مسلط ہو کر انہیں مسلسل اعصابی مریض بنائے رکھتے تھے۔ یہ ڈرگ مافیا جو انہیں اسمبلیوں تک پہنچاتا تھا ہی اصل میں ان کا ملجا و ماویٰ ہوتا۔

جن لوگوں کے اثر و رسوخ، غنڈہ گردی اور دولت کے بل بوتے یہ وہ اسمبلیوں میں پہنچتے تھے۔ انہیں برسرِ اقتدار آنے کے بعد کھلی چھٹی دے دیا کرتے تھے تاکہ وہ آئندہ ہونے والے انتخابات میں ان کے لیے پیسہ جمع کرتے رہیں!

اس ملک کی بدقسمتی یہ تھی کہ کرپٹ سیاستدان نے کبھی یہاں کوئی سسٹم پنپنے نہ دیا۔ اپنے قیام سے آج تک یہ ملک کو "ایڈہاک" بنیادوں پر چلا رہے تھے۔ یہاں کے حاکم کو ملک کے کل سے زیادہ اپنی کل کو محفوظ کرنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی انہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کسی بھی لمحے اسٹیبلشمنٹ انہیں کان سے پکڑ کر اقتدار کے ایوانوں سے باہر پھینک دے گی۔

لیکن ———

ایک مرتبہ مسندِ وزارت پر قابض ہونے کے بعد ان کے منہ کو اقتدار کا

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسا نشہ لگتا کہ بھر وہ اس سے آکٹوپس کی طرح چمٹے رہتے اور اپنے اقتدار کی طوالت کے لیے وہ ہر ناجائز سودے بازی کے لیے تیار رہتے۔ اندریں حالات انہیں بے تحاشا پیسے کی ضرورت رہتی تھی اور ان کی یہی ضرورت انہیں ڈرگ مافیا کے بادشاہ گروں کے جوتے چاٹنے پر مجبور کرتی تھی۔

ڈرگ مافیا کو یہاں "بادشاہ گر" کی حیثیت حاصل تھی۔

بادشاہ کا شمار اُن گنتے چنے گرگوں میں ہوتا تھا جو اس "مافیا" میں اپنی اپنی سلطنتیں بنائے بیٹھے تھے۔

ان لوگوں نے گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں معاشرتی اقدار کو بدکردار عکمرانوں کی معاونت سے اتنا کھوکھلا کر دیا تھا کہ اب ملک کی اسمبلیوں میں شاید ہی کوئی خوش قسمت ممبر ایسا تھا جو ان کی بالواسطہ یا بلاواسطہ معاونت کے بغیر پہنچ پاتا ہو۔

یورپی ممالک کی طرف سے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والی رپورٹس میں اسمبلیوں کے اُن اراکین کے نام بھی نظر آنے لگے تھے جو براہِ راست اس دھندے میں ملوث تھے اور جن کے گروہ کے لوگ ان ممالک میں اُن کے مال کے ساتھ گرفتار ہو چکے تھے۔

لیکن ——

یہاں کسی کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی تھی۔

اوّل تو ایسی رپورٹس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیتا تھا۔ اگر کبھی کسی اخبار میں اس سلسلے سے کچھ شائع بھی ہوتا تو ملزم ممبرانِ اسمبلی اسے اپوزیشن کی دشمنی کا شاخسانہ قرار دے کر مطمئن ہو جاتے۔

کبھی کسی ایجنسی نے ان کے خلاف لگے ان الزامات کی تصدیق کے لیے متعلقہ حکومتوں سے رجوع نہیں کیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا کوئی رزلٹ تو سامنے آتا۔

حیرت کی بات تھی کہ جن بیرونی فردشوں کو شہر کا بچہ بچہ جانتا تھا انہیں پولیس اور

متعلقہ ایجنسیاں نہیں جانتی تھیں —— ورنہ وہ انہیں عدالت تک لے جاتیں۔

عجب دستور تھا اس شہر کا کہ جہاں ساری دنیا کے گمراہ معاشروں کے برعکس شہر کے بدترین شخص کو کھوجا جاتا اور مسندِ اقتدار پر بٹھا کر عزت دے دی جاتی تھی۔

اس صورتِ حال نے عام شہری کا ایمان ہی متزلزل کر دیا تھا۔

اور ——

سلسلہ روز و شب میں پھنسے سفید پوش عوام جب کبھی اپنے روزانہ کے مسائل سے چھٹکارہ پا کر کچھ سوچنے کی مہلت چاہتے تو ان پر مسائل کا عذاب لاد دیا جاتا۔ اس مسئلے پر اپوزیشن اور حکومت کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہمیشہ سے موجود رہا تھا۔ جس کی رو سے دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ عوام دشمنی کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔

دونوں اپنا فرضِ منصبی جانتے تھے کہ اپنے ان ووٹرز کے لیے جو انہیں منتخب کر کے اپنے مسائل کے حل کے لیے اسمبلیوں میں بھیجتے تھے کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا کیے رکھیں۔

اول تو انہیں آٹے دال کے چکر ہی سے باہر نہ نکلنے دیا جاتا۔ مرے پر سو دُرّے کے مصداق معاشی بوجھ میں اُلٹی سیدھی معاشی پالیسیاں بنا کر مزید اضافہ کر دیا جاتا۔

اپنی ہوس بہلانے کے لیے حکومت سرکاری خزانہ چٹ کر جاتی لیکن "ھل من مزید" کا سلسلہ جاری رہتا جس کے بعد ملکی مفادات کو رہن رکھ کر بین الاقوامی امدادی اداروں سے بھیک مانگی جاتی۔ اس بھیک کے ساتھ جتنی شرائط عائد ہوتیں اُن کا عتاب غریب اور سفید پوش طبقے پر ڈال کر اپنا اُلو سیدھا کر لیا جاتا۔

ملک کے قیام سے آج تک یہاں کے ہر حکمران نے عوام سے ہی قربانی کا تقاضا کیا تھا شاید ہی کسی سیاست دان نے ذاتی حیثیت میں کوئی قربانی دی ہو۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ مُلک جہاں نانِ جویں کو محتاج عوام اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر حکومتی ٹیکس جو اُن پر بلا جواز ٹھونسے جاتے تھے ادا کرتے تھے اُن کے ٹیکسوں پر پلنے والی سیاسی بندروں کی فوج حلوائی کی دکان اور نانا جی کی فاتحہ کا نعرہ لگا کر اداروں کے قرضے ہڑپ کر جاتی۔

یہاں ایک دوسرے کے قرضے معاف کرنے کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔

بنکوں والے جانتے تھے کہ موٹے پیٹوں والے یہ حرام کار جو انڈسٹری کی ترقی کے نام پر قرضے لے رہے ہیں دراصل اپنے پیٹ کا جہنم مزید بھرنے کے چکر میں اور کبھی یہ قرض واپس نہیں لوٹائیں گے۔

لیکن ——

وہ انہیں تمام معاشی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر قرضے دینے پر مجبور تھے۔

کیونکہ انہیں بھی اس بات کا علم تھا کہ یہ معاشی نہیں سیاسی قرضے ہیں جو انہیں ادا کرنے ہی ہوں گے۔ بصورتِ دیگر اپنی نوکریوں سے چھٹی یا پھر کرپشن کے الزامات میں جیلوں کی ہوا کھانی پڑتی تھی۔

بلالے شاہ کوئی غیر ملکی باشندہ نہیں تھا۔

اسی معاشرے کی پیداوار تھا۔

اس نے ایک اے ایس آئی کی حیثیت سے معاشرے کے اتنے گھناؤنے روپ دیکھ لیے تھے کہ اب اس کے لیے مذہبی اور اخلاقی اقدار بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ جس تیزی سے اُس کا ناجائز کاروبار پھیل رہا تھا۔ اس کے بعد سے اس کے پاس ایس پی باجوہ قسم کے پولیس افسران سے سر کھپائی کا وقت باقی نہیں بچتا تھا۔

اُس نے اس مرتبہ بڑا انقلابی فیصلہ کیا تھا۔ وہ خود سینیٹر بننے جا رہا تھا۔ بالے شاہ جانتا تھا کہ اسمبلیوں میں ان کے پروردہ اتنے ممبران پہنچ جائیں گے جو اس کے سینیٹر بننے کی راہ ہموار کر دیں گے اور ایک مرتبہ اگر اس کے نام کے ساتھ یہ تختی چسپاں ہو گئی تو باجوہ چھوڑ اُس کے محکمے کے اعلیٰ افسران کو بھی اس کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچنا پڑے گا۔

یہاں میاں غلام قادر جیسے درجنوں سیاست دان جو سرکاری ایوانوں میں بیٹھے تھے براہِ راست اپنے دھندے چلا رہے تھے پھر وہ کیوں پیچھے رہتا۔؟

لیکن ——

حاجی کی جو درگت باجوہ نے بنائی تھی اس کے بعد سے بالے شاہ اس کی طرف سے بہت محتاط ہو گیا تھا۔ اب وہ باجوہ کے ساتھ اس طرح نمٹنے کی تیاری کر رہا تھا جس طرح باجوہ نے حاجی سے معاملہ چکایا تھا۔

اس نے باجوہ پر دونوں محاذوں سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اُسے یاد تھا اس شہر سے باجوہ کا تبادلہ انہوں نے طالب کمہار کی مدد سے کروایا تھا۔ اور طالب کمہار اب تک درجنوں کوششیں بلالے شاہ سے ملاقات کے لیے کر چکا تھا۔ یہ الگ بات کہ بلالے شاہ ہی نے اُسے آج تک منہ نہیں لگایا تھا۔

اب وقت آگیا تھا کہ وہ اس مہرے کو بھی آگے بڑھاتا۔

یہی سوچتے ہوئے اُس نے اپنی موجودہ سیکرٹری نیلم کو طالب کمہار سے رابطہ کر کے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔

طالب کا نام بالے شاہ کے منہ سے سنتے ہی نیلم کو اپنا دل ڈوبنے کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایک مرتبہ اگر اس کا رابطہ اس موذی سے ہو گیا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو تسلیم کردہ مکھن سے بال کی نکال کر پھینک دے گا۔

یوں بھی اس سارے کھیل میں اُس کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ طالب کمہار ہی تھا۔

وہ اگر معاشرتی طوائف تھی تو طالب کمہار "منافق طوائف" تھا ___ کہانی کی ہیری ہونے کے ناطے وہ اس کی رگ رگ کو سمجھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ طالب دو منہ والا سانپ ہے۔ اُس سے سوائے ڈنک کے اور کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔

اب اُسے مزید "ایکٹو" ہونا تھا۔

بصورت دیگر کچھ بھی ممکن تھا۔

عین ممکن تھا کہ طالب کمہار اور بابے شاہ کی دوستی کی پہلی بھینٹ ہی اُسے چڑھنا پڑتا۔ اس نے اپنی دانست میں زہراں کو بڑے مناسب موقع پر میاں کی طرف بھیجا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جہان خان کی موت کے بعد میاں کی حالت زخم خوردہ سانپ والی ہو گی اور وہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر طالب کمہار سے ٹکرا جائے گا۔

لیکن ___

اگر طالب کمہار کا رابطہ بابے شاہ سے ہو گیا تو عین ممکن ہے کہ میاں کا مورال ہی ڈاؤن ہو جائے اور وہ کچھ کرنے سے پہلے ہی ہتھیار پھینک کر اُس کے لیے میدان خالی چھوڑ دے۔

اس بات کا اُسے علم تھا کہ جہان خان کی موت بابے شاہ کا کارنامہ ہے۔

اس نے حاجی کو بھی ایک مہرے کی صورت استعمال کیا تھا۔ اس نے زہراں کے ذریعے میاں کو اس بات سے بھی آگاہ کر دیا تھا اور اس بات کی تسلی بھی کر لی تھی کہ میاں نے زہراں کی بات تسلیم کر لی ہے۔

اچانک ہی ایک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

جیسے اچانک گھور اندھیرے میں اُسے اُجالے کی کوئی کرن دکھائی دے گئی ہو۔ اُس نے سوچا اس سے پہلے تو میاں کو گمراہ کرنے کے لیے اُن لوگوں نے طالب کمہار کو خواہ مخواہ اس کھیل میں گھسیٹا تھا۔

لیکن ___

اب تو یہ جھوٹ سچ بننے جا رہا تھا۔

طالب کمہار اور بابے شاہ کی باقاعدہ ملاقات ہو رہی تھی۔ اگر وہ اُس ملاقات کی ایک جھلک بھی میاں کو دکھا دے تو وہ غصے سے پاگل ہو جائے گا۔ کیونکہ طالب کمہار سے وہ پہلے ہی خار کھائے بیٹھا تھا اور بابے شاہ نے اس کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔ وہ اس بات پر یقین کرے گا کہ طالب کمہار ہی دراصل اُس کی تباہی کا ذمہ دار ہے اور وہ اُس کے خلاف کوئی بھی انتہائی اقدام سے نہیں چوکے گا۔

یہی سوچتے ہوئے وہ ایک نیا منصوبہ لے کر زہراں کے کوٹھی خانے کی طرف جا رہی تھی۔ زہراں نے اس کا استقبال گرمجوشی سے معانقہ کرتے ہوئے کیا۔ نیلم اُس کے لیے زندگی کی نئی اُمید بن کر آئی تھی۔

اُس کی طرف سے تیار کردہ نئے منصوبے پر زہراں عش عش کر اُٹھی۔ اُسے یوں لگا جیسے قدرت نے خود بخود اس کے انتقام کی راہ ہموار کر دی ہو اور اب اُسے اپنا خواب حقیقت کا روپ دھارتا دکھائی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بڑی گرمجوشی سے نیلم کو رخصت کر رہی تھی۔

○

طالب کمہار کے لیے بابے شاہ سے ملاقات کا پیغام بلڈ پریشر بڑھا دینے کا باعث بن گیا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی حرام کاریوں سے اب اکتاہٹ سی محسوس کرنے لگا تھا اور بابے شاہ کی طرح راتوں رات کروڑپتی بن جانے کا تمنائی تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یوں بھی اس نے سوچا آخر وہ ان لوگوں کا "آنہ لڑکا" ہی کیوں بنا رہے؟ کیوں نہ وہ ان کے بزنس کا باقاعدہ حصہ دار بنے اب محض کارندہ بن کر کام کرنا اُسے گوارہ نہیں تھا۔

وہ اپنی حرام کاریوں کے بل پر اپنے مالکوں کو بیوقوف بنا کر اس عہدے تک پہنچا تھا اور یہاں پہنچنے کے بعد اُس نے اپنی مجرمانہ ذہنیت کے مطابق جو گورکھ دھندہ پھیلایا تھا۔ اس نے کم از کم طالب کمہار کو اس حقیقت کا قائل کر دیا تھا کہ اس ملک میں ناجائز ہتھکنڈوں کی مدد سے کوئی بھی کام ممکن ہو سکتا ہے۔

اس نے صحافت کے مضبوط قلعے کی پناہ لی ہوئی تھی جس میں بیٹھ کر وہ خود کو قانون اور انصاف کی مار سے بچا سکتا تھا۔ اس نے اپنے سر پر صحافتی ٹوپ پہن کر جو کارنامے انجام دیے تھے وہ اس مقدس پیشے کے ماتھے کا کلنک تو ضرور تھے۔

لیکن ـــــ

طالب کمہار جانتا تھا کہ یہاں تمام غلط کام ایسے ہی مقدس پیشوں کی آڑ میں انجام پا رہے ہیں۔ پولیس جسے عوام کی حفاظت پر لگایا گیا ہے عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہے۔ سیاسی ادارے جو کسی ملک کے استحکام کی بنیاد بنتے ہیں، ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

وہ لوگ جن کے ذمے لٹیروں کا احتساب ہے انہیں خود لوٹ مار سے فرصت نہیں ہے۔

وہ تو خود بڑی دیر سے بالے شاہ سے براہِ راست ملاقات کا خواہش مند تھا۔ اس سے زیادہ "میڈیا" کی طاقت کو کون سمجھ سکتا تھا۔

اور ـــــ

طالب کمہار کم از کم اقبال شاہ کو یہ بات ضرور سمجھا سکتا تھا کہ وہ اس طاقت

کے ذریعے اس کے کسی بھی دشمن کا بُرج اُلٹا سکتا ہے۔

اقبال شاہ نے ملاقات کا اہتمام فائیو سٹار ہوٹل کے ایک کمرے میں کیا تھا۔ اس ہوٹل میں اُس کے کارندے ہمیشہ ایک کمرہ کسی ہنگامی صورت کے لیے بُک رکھتے تھے۔

طالب کمہار کو بالے شاہ کی ملاقات نے اتنا جذباتی کر دیا تھا کہ وہ ملاقات کے وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی ہوٹل کی لابی میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ یہ آدھا گھنٹہ اس کے لیے صدی پر محیط ہو چلا تھا۔ اس دوران طالب کمہار چور دل کی طرح ایک کونے میں داخلے کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ ہوٹل ہال میں داخل ہونے کا یہی ایک دروازہ تھا سیکورٹی والوں نے احتیاطی تدابیر کے پیشِ نظر باقی دروازے بند کیے ہوئے تھے۔

طالب کمہار کے اعصاب تڑخنے لگے تھے کیونکہ گیارہ بج رہے تھے اور ابھی تک وہاں بالے شاہ کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کہیں اُسے کسی چکر میں تو نہیں پھنسایا جا رہا؟

یہی سوچتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بہرحال اُسے دیکھ لینا چاہیے۔ اُس نے سوچا اور لفٹ کی طرف چل دیا۔

تیسری منزل پر لفٹ سے اُتر کر اُس نے مطلوبہ کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جو پہلے ہی سے کھلا تھا۔ طالب اندر داخل ہو گیا۔

اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اس کے سامنے اقبال شاہ کھڑا تھا۔

"آپ پانچ منٹ لیٹ آئے ہیں طالب صاحب ـــــ کیا خیال ہے؟"

بالے شاہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بس شاہ جی نیچے ہال میں ایک جان پہچان والے مل گئے تھے۔"

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق بہانہ تراش کر خود کو نارمل کرنا چاہا۔

"خیر — اگر ہماری آپ کی آئندہ ملاقاتیں بھی ہونی ہیں تو ہمیں ابھی سے وقت کی اہمیت کا احساس کر لینا چاہیے۔ اور ہاں طالب صاحب ایک اور بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ میں کبھی عام راستوں پر سفر نہیں کرتا۔ اگر بالے شاہ نے اس دروازے سے عمارت میں داخل ہونا ہے جس سے اُس کے آنے کی اُمید کی جا رہی ہے تو اس میں اور عام آدمی میں کیا فرق ہوا؟"

بالے شاہ نے اُسے سامنے کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کے سامنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا تو طالب کمہار چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بالے شاہ کو اُس کی آمد سے اب تک کے حالات کا علم ہے

طالب کمہار کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ بالے شاہ ایسے "سرپرائز" دینے کا عادی ہے۔ وہ اپنے ملاقاتی کو پہلی ہی ملاقات میں اپنی خصوصی اہمیت کا احساس ایسی حرکتوں سے دلا دیا کرتا تھا۔ اس کے دھندے میں اُسے ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔

"فرمائیے شاہ جی۔ کس طرح یاد فرمایا؟"

طالب نے صورتِ حال کو نارمل کرنے کے لیے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

"مجھے آپ کے تین چار پیغام ملاقات کے لیے مل چکے تھے۔ دیکھو بھئی۔ میں ہوں سیدھی بات ہے کاروباری آدمی۔ پولیس اور صحافیوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ لوگ قلم کے دھنی ہوتے ہیں۔ جب جی چاہے بات کا بتنگڑ بنا دیں اور خواہ مخواہ بندہ پریشان ہو جائے۔ آپ تو خیر سے یوں بھی بہت بڑے صحافی ہیں۔ ایک اخبار کے اتنے بڑے ایڈیٹر ہیں۔" بالے شاہ نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے ٹیلی فون

اٹھا کر کاؤنٹر پر کمرے میں کافی لانے کا حکم دیا۔

"برا مت منائیے گا۔ میں شراب نہیں پیتا اور میری خواہش ہوتی ہے کہ میرے ملاقاتی بھی نہ پئیں۔ ویسے کوئی مجبوری بھی نہیں اگر آپ....."

"نہیں۔ نہیں شاہ جی — توبہ توبہ —"

طالب کمہار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ یہ شخص اس کے اعصاب پر سوار ہو رہا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس سے ڈھنگ سے بھی بات کر پائے گا یا نہیں۔

"جی — میرے خیال سے ہمیں مطلب کی بات شروع کر دینی چاہیے۔ آپ کا تو یوں بھی وقت بہت قیمتی ہوتا ہے!"

بالے شاہ نے طالب کمہار کے اعصاب پر ایک اور زوردار ہتھوڑا برسایا۔

"شاہ جی دراصل آپ کی شخصیت سے متعلق اتنا کچھ پڑھنے سننے کو ملتا ہے۔ کہ آپ سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا تھا — آپ کو یاد ہوگا کہ میاں صاحب کے حکم پر میں نے آپ کی ایک خدمت بھی انجام دی تھی!"

طالب کمہار نے اپنے انداز سے بات کرنا چاہی۔

"اپنے دشمنوں کی طرح میں اپنے دوستوں کو بھی کبھی فراموش نہیں کرتا۔"

بالے شاہ نے اپنے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ سجائی تھی کہ ایک انجانا سا خوف طالب کمہار کو خواہ مخواہ اپنے بدن میں سرایت کرتے محسوس ہوا۔

بالے شاہ نے جس طرح اُس کے اعصاب کو جکڑ لیا تھا۔ اس نوعیت کا تجربہ طالب کمہار کو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ وہ خود جرائم کی دنیا کا خلیفہ تھا۔ بڑے بڑے مجرموں سے جنہوں نے شرافت کے نقاب اوڑھ رکھے تھے اس کا واسطہ رہتا تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن ___

بالے شاہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔

طالب کمہار نے تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے خود کو قدرے نارمل کیا اور پھر آمدم بر سرِ مطلب پر آ گیا۔

"شاہ جی ___ میں گستاخی تو نہیں کر سکتا لیکن میری خواہش ہے کہ آپ مجھے بھی اپنے کسی پراجیکٹ میں چھوٹا سا حصّہ دار بنا لیجئے۔ میں اس سلسلے میں باقاعدہ شراکت کروں گا صرف اپنے اثر و رسوخ ہی کو بنیاد نہیں بناؤں گا۔"

اس نے بالآخر ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

بالے شاہ نے ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر نظریں جمائیں تو طالب کمہار کو یوں لگا جیسے اُس کی روح ہی قبض ہو رہی ہو۔

"طالب صاحب آپ نے جو بات کہی ہے اس کے مضمرات پر بھی نظر ڈالی ہو گی۔ میرا مطلب ہے بزنس میں ہمیشہ چاروں چھکے ہی نہیں پڑتے کوئی گوٹی الٹی پڑ جائے تو بڑا جھٹکا لگتا ہے۔"

اس نے طالب کمہار کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"مجھے علم ہے شاہ جی ___ بزنس آخر بزنس ہے ___"

طالب کو اُمید کی معمولی سی کرن دکھائی دی تھی۔

لیکن ہم کوئی چھوٹی ڈیل نہیں کرتے۔"

بالے شاہ نے اُسے ٹٹولنے کے انداز میں کہا۔

"شاہ جی میں ۲۴ گھنٹے کے نوٹس پر پچیس تیس لاکھ تک کا بندوبست کر سکتا ہوں ___!"

طالب کمہار نے بے چینی سے کہا۔

بالے شاہ نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا شاید اس کی بات کا وزن کر رہا تھا پھر اس نے طالب پر چھری چلانے کا ارادہ کر ہی لیا۔

"نہیں طالب صاحب ___ آپ دس دن تک پچاس لاکھ کا بندوبست کریں۔ اور ہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ اس شہر میں ایس پی باجوہ کی موجودگی تک ہم کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ ہمارے درمیان ہونے والی ڈیل میں باجوہ کے یہاں سے تبادلے کی شرط کو بھی شامل سمجھئے ___ کچھ بھی ہو اُس کی جتنی بھی قیمت ادا کرنی پڑے اُسے یہاں سے جانا چاہیے۔ فوراً چند دنوں کے اندر اندر!"

بالے شاہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہو گا شاہ جی ___ ایسا ہی ہو گا ___ ابھی اُس نے میری طاقت کا اندازہ ہی نہیں کیا۔ میں اُس کے تبادلے کے آرڈر وہاں سے کرواؤں گا جہاں سے ہونے والے احکامات پر عمل کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔"

طالب نے گردن ہلائی۔

"اور ہاں ___ آپ تک یہ خبر تو پہنچ ہی گئی ہو گی کہ میں سینیٹر کی ٹکٹ کا امیدوار ہوں ___"

بالے شاہ نے کہا۔

"شاہ جی ___ آپ ہو گئے سینیٹر سید اقبال شاہ ___ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے اور دیکھتے جائیے۔ بس ایک گستاخی کروں گا۔"

طالب نے بڑی مکاری سے منت کے انداز میں آخری بات کہی۔

"کیا؟"

بالے شاہ نے کمال لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ میاں صاحب کو زیادہ لفٹ نہ دیا کیجئے میرا مطلب ہے وہ ...."

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں سمجھ گیا۔ دیکھیے طالب صاحب یہ شہر نفسیاتی مریضوں سے بھرا پڑا ہے۔ جو شخص اقبال شاہ کے ساتھ بیٹھ کر چائے کی ایک پیالی شیئر کرلے وہ سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹنے لگتا ہے کہ بابے شاہ کا رشتہ دار ہو گیا ـــ میرے پاس اس مرض کا کوئی علاج نہیں ـــ میاں سے میں نے کبھی باقاعدہ بزنس نہیں کیا۔ اس کی اوقات ہی کیا ہے۔ اگر میرے حوالے سے وہ کسی پر رعب جماتا ہے تو جماتا رہے۔ میرے پاس ایسی فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہوتا۔"

بابے شاہ نے بڑی بے نیازی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مم میرا مطلب ہے...."

طالب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

"آپ اپنا مطلب چھوڑیے اور میری بات سمجھیے" ـــ بابے شاہ نے ہاتھ اُٹھا کر اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ـــ "طالب صاحب میں ہر شخص کو اس کے میرٹ پر ملتا ہوں۔ کوئی میرے متعلق کیا کہتا ہے اور کیا نہیں کہتا آپ کو اس کی فکر نہیں کرنی۔ یہ میرا مسئلہ ہے۔ ذاتی معاملات میں مجھے کسی بھی طرح کی مداخلت پسند نہیں۔ میرے خیال سے اب ہمیں چلنا چاہیے۔ آپ بھی بڑے مصروف آدمی ہیں اور مجھے بھی ضروری کام سے جانا ہے۔"

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے طالب کمہار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

طالب کمہار کی حالت اس شرمندہ ٹاؤٹ کی سی تھی جس کی اطلاع پر اس کے مالک اس کا مذاق اُڑا رہے ہوں۔

"جیسے آپ کا حکم شاہ جی!"

اس نے نوکروں کی طرح ہاتھ باندھے۔

"اور ہاں۔ آپ سے رابطہ میں نے کرنا ہے۔ میرا مطلب آپ سمجھ گئے ہیں ناں۔

ہمارے بزنس میں ایک بڑا اصول 'دیکھو اور انتظار کرو' کا بھی ہے۔ اسے کبھی فراموش نہ کیجیے۔"

بابے شاہ نے کمرے سے باہر آ کر اُسے لفٹ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

"میں آپ کی ہر بات سمجھ گیا ہوں شاہ جی ـــ آپ کی توقعات پر ان شاء اللہ پورا اتروں گا۔"

طالب کمہار نے گدھوں کی طرح دانت نکالتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور لفٹ میں سوار ہو گیا۔

○

بڑی بے چینی سے میاں صاحب فون کے سامنے بیٹھے تھے۔

زہران نے اس دوران اپنے ہاتھ سے انہیں دو پیگ بنا کر دیے تھے۔

آج کل اُسے میاں صاحب کی نمبر ایک داشتہ کا مقام مل چکا تھا۔ اگلے ہی روز وہ یہ دھماکہ خیز اطلاع لے کر آئی تھی کہ طالب کمہار اور بابے شاہ اہم ملاقات کرنے والے ہیں۔

اس ملاقات کے حوالے سے اس نے میاں صاحب کے کان طالب کمہار کے خلاف اتنے زیادہ بھر دیے تھے کہ وہ تو اسے اگلے ہی لمحے قتل کر دینے پر تُلے ہوئے تھے۔

لیکن ـــ

اپنے مجرمانہ تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے فی الوقت "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی اپنائی تھی۔

میاں صاحب "موری ممبری" سے ایم این اے کی سیٹ تک پہنچے تھے۔ کسی جرم پر فوری ردِعمل تو انسانی فطرت کی کمزوری کی طرح اُن کی بھی کمزوری تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن ——

عملی زندگی میں وہ بڑے ٹھنڈے دماغ کے مالک تھے۔ کوئی بھی عملی قدم اٹھانے سے پہلے وہ کئی مرتبہ اس کے مضمرات پر غور کیا کرتے تھے۔

اچانک ہی ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز کمرے کے سناٹے میں اعصاب شکن بم کی طرح گونجی۔ میاں صاحب کے اشارے پر زہراں نے خود فون اُٹھایا اور دوسری طرف سے کچھ سن کر میاں صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو — ہاں بھئی کیا خبر ہے —؟"

میاں صاحب نے بے چینی سے پوچھا۔

دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد انہوں نے فون کو اتنی زور سے کریڈل پر پٹخا تھا کہ اگر وہ ملکی پلاسٹک کا بنا ہوتا تو اب تک ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں بکھر گیا ہوتا۔

اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے مغلظات کا گٹر اُبلنے لگا۔

وہ طالب کمہار کی شان میں اتنی غلیظ زبان استعمال کر رہے تھے کہ ایک پیشہ ور فاحشہ ہونے کے باوجود زہراں کو بھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پسینہ پھوٹنے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے میاں صاحب کو نارمل کیا تھا۔

یہ فون اسی ہوٹل سے آیا تھا۔

میاں صاحب کے ایک خاص کارندے نے طالب کمہار اور اقبال شاہ کی ملاقات کی تصدیق کر دی تھی۔ زہراں بائی کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اُسے یقین تھا کہ طالب کمہار اب میاں صاحب سے نہیں بچ سکے گا۔

میاں کے غصے کو دیکھ کر اس نے جان بوجھ کر طالب سے متعلق مزید گفتگو نہیں کی۔ اُس نے اپنی دانست میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا

وہ میاں صاحب ہی کو کرنا تھا۔

ساری رات وہ میاں صاحب کے پہلو سے چپٹی انہیں نارمل کرتی رہی۔ صبح میاں صاحب کا خاص ڈرائیور حسبِ معمول اُسے کوٹھی خانے پر چھوڑ آیا۔

رات کا خاصا غصہ اتر چکا تھا۔

میاں صاحب کا بلڈ پریشر بھی نارمل ہو گیا تھا اور وہ اب قدرے ٹھنڈے دل سے صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے زندگی کے برے اور اچھے دن طالب کمہار کے ساتھ بتائے تھے۔ میاں صاحب اس کی رگ رگ سے واقف تھے انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اگر اس شیطان نے اقبال شاہ تک رسائی حاصل کر لی تو وہ میاں صاحب کی چھٹی ضرور کروا دے گا۔

انہیں غصے کو ایک طرف رکھ کر ٹھنڈے دماغ سے اس مسئلے پر غور کرنا اور اس کا کوئی حل تلاش کرنا تھا۔ فی الوقت اقبال شاہ کا ان کے ہاتھ سے نکلنا اُن کے لیے تباہی کا باعث بن سکتا تھا۔ اُن کے دھندے میں کوئی ایسے لگے بندھے اصول نہیں تھے جن پر عمل کرنا ضروری ہوتا۔

یہاں صرف ایک اصول چلتا تھا کہ ہر بڑی مچھلی کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ چھوٹی مچھلی کو کھا جائے۔

اور ——

میاں صاحب جانتے تھے کہ اُن کے مقابلے میں اقبال شاہ کو مگرمچھ کی حیثیت حاصل ہے اور جنگل کے قانون کی طرح اقبال شاہ کی ہر زیادتی بھی انہیں دل و جان سے قبول کرنی تھی۔ کیونکہ بھیڑیے کے میمنے کے مقابلے میں بھیڑیا ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔

میاں صاحب نے چند منٹ تک صورتِ حال کی سنگینی پر غور کرنے کے بعد ایک انقلابی فیصلہ کر لیا تھا اور اب اس پر عمل کرنے جا رہے تھے۔ ہارے ہوئے جواری

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرح انہوں نے آخر اس امید پہ داؤ کھیلنا تھا کہ ممکن ہے اس طرح ان کی ہاری ہوئی پہلی رقم بھی مع سود واپس مل جائے۔

انہیں اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے اقبال شاہ کو دوسری قسط نہیں دی اور جہان خان کا قتل دراصل اُن کے اس گناہ کی سزا ہے۔

اُس روز دوپہر کے کھانے پر وہ اقبال شاہ سے ملاقات کرنے جا رہے تھے۔ ۲۰ لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ کا بریف کیس اپنے ساتھ لے کر۔

اقبال شاہ نے اپنے دیرینہ دوست کا خیر مقدم حسبِ روایت کیا۔ اُسے احساس ہو چکا تھا کہ میاں صاحب کا دماغ قدرے ٹھنڈا ہو گیا تھا اور اب وہ مستقبل میں کبھی "سولو فلائیٹ" کا تصور بھی نہیں کریں گے۔

اقبال شاہ کا ٹارگٹ سینیٹر کی سیٹ تھی جس کے لیے میاں صاحب جیسے سیاسی گدھے کو قابو رکھنا اس کے لیے یوں بھی ضروری ہو گیا تھا۔ وہ خود "بادشاہ گر" تھا اور میاں صاحب کا صنم اُس نے اپنے ہاتھوں تراشا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے حلقے میں بہت سے ممبران اسمبلی کی رائے پر میاں صاحب اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

میاں صاحب نے اقبال شاہ کے سامنے آنسو بہاتے ہوئے اپنے ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کیا تھا اور آئندہ سے کبھی اس کے حکم سے سرتابی نہ کرنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ ۲۰ لاکھ کی نقد رقم تجدید تعلقات کے لیے کافی تھی۔ اقبال شاہ نے حسبِ عادت بڑی بے نیازی سے رقم وصول کی تھی۔

"میاں صاحب آپ ہمارے پرانے دوست ہیں۔ اگر آپ کو ہماری کمزوریوں اور اچھائیوں کا علم نہیں ہو گا تو اور کس کو ہو گا۔ آپ جانتے ہیں اقبال شاہ اپنے ہاتھوں سے تراشے بتوں کو کتنا عزیز رکھتا ہے لیکن اپنے پاؤں جلنے لگیں تو بندریا بھی بچوں کو پاؤں تلے رکھ لیتی ہے۔ میں اپنے دوستوں کو ترقی

کرنے سے نہیں روکتا۔ آپ اس ملک کے وزیرِ اعظم بن جائیے۔ مجھے تو خوشی ہو گی، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اتنی بڑی مسند پر براجمان ہو کر آپ ہمیں فراموش کر دیں۔ اپنے دوستوں کو اُن کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے رہنا میرا فرض اور میری اُن کے ساتھ محبت کا تقاضا ہے جسے میں ضرور نبھاتا ہوں۔ میاں صاحب کھیل کا مزہ تب ہی آتا ہے جب اُسے مکمل قواعد و ضوابط کے ساتھ کھیلا جائے۔ ہاکی کے گیند کو بلے سے کھیلنا کہاں کا انصاف ہے۔ باقی کھلاڑیوں کا مزہ بھی کرکرا ہوتا ہے۔ آپ میری باتیں سمجھ رہے ہیں ناں؟"

اقبال شاہ نے بڑے فلسفی انداز میں میاں صاحب کو اُن کی ماضی کی غلطیوں کا احساس دلا کر آئندہ کے لیے تنبیہہ کر دی۔

"سید بادشاہ آپ کا پرانا جانثار ہوں۔ میں آپ کی بات کو نہیں سمجھوں گا تو کون سمجھے گا۔"

اُس نے بے شرموں کی طرح دانت نکالے۔

اچانک ہی نیلم کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اُسے دیکھ کر میاں صاحب چونکے لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے خود کو نارمل کر لیا۔ انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ زندگی میں آدھی بغاوت یا آدھا سرنڈر ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔

اقبال شاہ جرم کی اس دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا جس میں میاں صاحب زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک بادشاہ کی حیثیت سے اقبال شاہ کو اپنی سلطنت کی ہر خوبصورت شے کو حاصل کرنے کا "جبری حق" بھی حاصل تھا۔

نیلم اگر بالے شاہ کو پسند آ گئی تھی تو اس کا میاں صاحب کے ساتھ کہاں کا انصاف تھا؟

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مسز نیلم اور اس کے خاوند کو میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا ہے ـــــ میاں جی آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد سیاست کے میدان میں خود اترنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کھیل کے سارے تقاضے بھی مجھے ہی پورے کرنے ہیں ایک خوبصورت سیکرٹری کے بغیر سیاست کے کارزار میں داخل ہونا سانپ کی بل میں ہاتھ دینے کے برابر ہی تو ہے۔"

بالے شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حق ہے شاہ جی۔ حق ہے۔"

میاں صاحب نے ان کی بات پر آمنا صدقنا کہا۔

"نیلم اُس کے لیے چائے لے آئی تھی۔ میاں صاحب جانتے تھے کہ بالے شاہ نے ساری زندگی کم سے کم کسی کے سامنے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا نہ ہی وہ یہ پسند کرتا تھا کہ کوئی اس کی موجودگی میں شراب نوشی کرے۔ حالانکہ اس وقت انہیں اپنے اعصاب کو تسکین دینے کے لیے کسی اور شے کی ضرورت تھی۔

میاں صاحب کو اس بات کا علم ضرور تھا کہ نیلم کے نزدیک بھی طالب کمہار کا اقبال شاہ سے ملنا کوئی نیک شگون نہیں۔ انہوں نے یہی موقع بات کہہ دینے کے لیے مناسب جانا تھا۔

"میں نے شاہ جی ایک متبادل ڈھونڈ لیا ہے۔ آپ پریس کی طرف سے بے فکر ہو جائیے ـــــ ان کی اوقات ہی کیا ہے؟ یہ سالا کمہار کی اولاد بہت اونچا اڑنے لگا ہے ـــــ"

"میاں صاحب یہ تو آپ نے واقعی بہت اچھا کیا ـــــ یوں بھی میرے خیال سے اس میدان میں کسی ایک پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنا اچھی بات نہیں۔ متبادل تو ہر وقت ہمارے پاس موجود ہونا چاہیے ـــــ خدا جانے کس وقت اس کا دماغ خراب

ہو جائے۔ کیوں شاہ جی ـــــ؟

نیلم نے میاں صاحب کا اشارہ سمجھ لیا تھا اور اُن کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال شاہ کی طرف پُر اُمید نظروں سے دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے ـــــ میاں صاحب میں بھی اس شخص کی رگ رگ سے واقف ہوں لیکن آج کل اس پر راتوں رات کروڑ پتی بننے کا بھوت سوار ہے۔ مجھے اس گدھے سے ایک کام لینا ہے جس کے بعد اس کا بھوت بھی ایسا اتاروں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا بالے شاہ کو ـــــ"

بالے شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دونوں سمجھ گئے کہ اقبال شاہ کے طالب کمہار سے تعلق سے متعلق انہوں نے غلط رائے قائم کی تھی۔ اقبال شاہ کم از کم طالب کمہار سے زیادہ عقلمند اور چالاک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس مہرے کو کب اور کہاں ذبح کروانا ہے۔

میاں صاحب اقبال شاہ کے ہاں سے خاصے مطمئن واپس آئے تھے۔ انہیں امید تھی کہ اب نہ کوئی ان کی ٹکٹ روک سکتا ہے نہ ہی کامیابی اور نہ ہی منسٹری۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انجام

اخبار باجوہ کے سامنے پڑا تھا اور وہ زہریلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اس کے ایک ایک لفظ کا مطالعہ کر رہا تھا۔

لیکن ——

سلیم باجوہ کو علم تھا کہ بے چارہ کرائم رپورٹر تو صرف قربانی کا بکرا بنا ہے۔

اصل میں اس خبر کے پیچھے طالب کہار کا شیطانی ذہن کارفرما تھا۔ تفصیلات کے مطابق کرائم رپورٹر کو انتہائی مصدقہ ذرائع سے اطلاعات ملی تھیں کہ حاجی صاحب کو ایک سازش کے تحت ایک اعلیٰ پولیس آفیسر نے جیل سے نکلوایا اور پھر اُن کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کیا گیا۔

کیونکہ حاجی صاحب کی پوزیشن قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ملی بھگت سے ایسی ہو گئی تھی کہ وہ کسی سرکاری اہلکار کے خلاف اگر کوئی بیان بھی دیتے تو اس کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان حالات میں اوّل تو کوئی اُن کی بات پر یقین ہی نہ کرتا۔ اگر ان کی بات سچ بھی مان لی جاتی تو بھی قانونی طور پر وہ ملزمان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اُن کی حیثیت جیل سے فرار ہونے والے ایک مجرم کی تھی جسے اگر کوئی گولی بھی مار دیتا تو قانون اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکتا۔

اس لیے حاجی صاحب نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

خبر میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اگر اعلیٰ سطح کا کمیشن بٹھایا جائے تو حاجی صاحب سے ان پر حملہ کرنے والوں کے چہروں سے نقاب اُٹھایا جا سکتا ہے۔

اس خبر میں جتنے بھی حوالے اور اشارے کنایے موجود تھے اُن سب سے ایک ہی نام سامنے آتا تھا وہ تھا ایس پی سلیم باجوہ ——!

گو کہ خبر میں کہیں بھی سلیم باجوہ کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن پڑھنے والے عقل کے اندھے کو بھی ان اشاروں کی مدد سے ساری بات سمجھ آ جاتی تھی کہ سلیم باجوہ نے قانونی طور پر ناکامی کے بعد حاجی صاحب کی ذات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور جیل حکام کے تعاون سے پہلے انہیں جیل سے باہر نکلوایا جس کے بعد اُن کی ٹانگیں اور بازو توڑ ڈالے۔

اس خبر کا مطلب یہ تھا کہ ڈرگ مافیا نے اپنے کارندے طالب کہار کو دوبارہ اس کے خلاف میدان میں اُتار دیا تھا۔ خبر کا انداز بتا رہا تھا کہ اس مسئلے پر باقاعدہ بحث ہو گی اور اب یہ مسئلہ تمام اخبارات میں اُچھالا جائے گا۔

اگلے روز سلیم باجوہ کے خدشات کی تصدیق ہو گئی جب شہر کے دو اور بڑے اخبارات نے "پراسرار ظالم پولیس آفیسر کون ہے؟" کی سرخیاں جما کر اسی انداز کے اشارے کنایے دیئے تھے جس طرح کے طالب کہار ایک روز پہلے دے چکا تھا۔ اور قارئین کو نام لیے بغیر باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ یہ سب کچھ سلیم باجوہ ہی کا کیا دھرا ہے۔

اسی روز طالب کہار نے اپنی صحافتی حیثیت کا انتہائی ناجائز فائدہ اٹھا کر اخبار کے مالکان کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ایک اداریہ بھی اسی خبر کے حوالے سے جھاڑ دیا تھا۔ جس میں اس خبر کا حوالہ دے کر حکومت سے پُر زور اپیل کی گئی تھی کہ کسی پولیس آفیسر کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت دینے والوں

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔

طالب کمہار نے لکھا تھا کہ اگر یہ رواج چل پڑا تو پھر شاید حکمرانوں کو عدالتوں کا کاروبار سمیٹنا پڑے اور ایسے پولیس آفیسروں کو لگام نہ دی گئی تو عوام کا جان و مال بالکل غیر محفوظ ہو کر رہ جائے گا۔ اس اداریے میں حکومت کو تنبیہہ کے انداز میں کہا گیا تھا اس سے پہلے کہ عوام انصاف خود اپنے ہاتھوں میں لے لیں حکومت اس واقعہ کے ذمہ دار پولیس آفیسر کو گرفتار کر کے اس کے خلاف خصوصی عدالت میں کیس چلا کر اسے قرار واقعی سزا دے ــــ تاکہ باقی پولیس والوں کو بھی نصیحت آ جائے۔

اس اداریے نے سلیم باجوہ کا دماغ خاصا گرم کر دیا تھا۔

لیکن ــــ

وہ اپنے دشمنوں کی چالوں کو خوب سمجھتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اصل میں طالب کمہار اُسے طیش دلا کر اس سے کوئی ایسی غلطی کروانا چاہتا ہے جو سلیم باجوہ کو کھل کر میدان میں آنے پر مجبور کر دے ــــ!

اس روز پہلی مرتبہ جب ڈی آئی جی نے اُسے اپنے آفس بلایا تو سلیم باجوہ ذہنی طور پر پہلے سے تیار ہو کر گیا تھا۔

اس نے ڈی آئی جی کے خدشات کو قطعی بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا تھا۔ کہ وہ طالب کمہار کو اس سے زیادہ بہتر جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ سلیم باجوہ سے کتنی محبت کرتا ہے؟

"لیکن یہ بات تو اپنی جگہ اہم ہے کہ آخر حاجی پر کس نے حملہ کیا ــــ؟"

ڈی آئی جی نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"جنابِ والا! حاجی صاحب کسی عالمِ دین یا مشائخ کا نام نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس مقدس و متبرک لفظ کی آڑ میں وہ خبیث کیا دھندہ کر رہا ہے ــ وہ انڈر ورلڈ کا آدمی ہے جناب۔ اس کا ایک پانڈی امریکہ میں گرفتار ہے۔ اس کے اس شہر میں درجنوں دشمن موجود ہوں گے۔ کسی نے بھی اس کے خلاف کچھ کر دیا ہو گا۔ آپ جانتے ہیں کہ ڈرگ مافیا کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ یہ لوگ ہر ڈیپارٹمنٹ سے اپنی مرضی سے نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ عین ممکن ہے اقبال شاہ نے اس کو سبق سکھایا ہو۔ کیونکہ اس شہر میں وہی ایک ایسا شخص ہے جس کا مال یورپی ممالک میں جاتا ہے۔ ممکن ہے اس نے کاروباری چپقلش میں حاجی کو سبق سکھانے کے لیے کچھ کیا ہو۔ اس طرح یہ لوگ اپنی دنیا کے دوسرے لوگوں کو "میسج" دیا کرتے ہیں کہ اگر کوئی اور اقبال شاہ کے مقابلے میں آنے کے لیے پر تول رہا ہو تو وہ کان کرے۔ ان لوگوں کا لینا دینا آپس میں لگا رہتا ہے ــــ بڑے آڑھتی ان بیوپاریوں کو اپنی رقم حاصل کرنے کے لیے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ جان سے مار دیتے ہیں سر! ایسے درجنوں مفروضے قائم کیے جاتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نے اپنے اخبار میں ایک ہی مفروضہ قائم کر کے باقی اخبارات کے منہ میں بھی یہی نوالہ کیوں دیا ہے؟ اور پھر یہ بھی سوچئے جناب کہ اس حادثے کے قریباً ایک ہفتے بعد اچانک اس کی "صحافیانہ غیرت" کیوں بیدار ہو گئی؟ کیا اس سے پہلے وہ سو رہا تھا؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو ــــ؟"

ڈی آئی جی نے باجوہ کی مزید گفتگو سے بچنے کے لیے اُس کی بات ٹوک دی۔

"میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں سر! کہ یہ کوئی گہری چال ہے جو میرے خلاف چلی گئی ہے۔ ایجنسیوں کے پاس اس طالب کمہار کے جرائم کے ثبوت موجود ہیں۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کوئی نیک نام شخص نہیں ہے۔ آپ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے کہ میں نے بلے شاہ کی بہت بڑی کھیپ پکڑی ہے اُس کو زبردست جھٹکا لگا ہے ـــــ وہ میرے خلاف کچھ بھی کروا سکتا ہے۔

ممکن ہے اس نے قاتلانہ حملے سے یہ کام زیادہ آسان سمجھا ہو۔ بادی النظر میں تو یہی دکھائی دیتا ہے۔"

باجوہ نے اپنی بات مکمل کی۔

"ہوں ں ں ـــــ"

ڈی آئی جی صاحب نے مناسب یہی سمجھا کہ فی الوقت باجوہ سے جان چھڑائی جائے۔

"بہرحال ایس پی کی حیثیت سے تمہیں اس جرم کا سُراغ لگانا چاہیے۔"

انہوں نے اپنی دانست میں بات مکمل کی۔

"مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے جناب ـــــ لیکن جس علاقے میں واردات ہوئی وہ میری حدود میں شامل نہیں ـــــ اگر جناب کو مجھ پر اعتماد ہے تو میں بڑی خوشی سے تفتیش کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہوں۔ میں اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق ایمانداری کے ساتھ اس سارے واقعے کا سُراغ لگانے کی کوشش کروں گا۔"

باجوہ نے گیند دوبارہ اُن کے کورٹ میں پھینک دی۔

ڈی آئی جی صاحب کو اس بات کا علم تو تھا کہ باجوہ بڑا ذہین پولیس آفیسر ہے ـــــ لیکن اتنا ذہین ہے۔ اس کا اندازہ انہیں آج ہو گیا تھا۔

ان کا دل کہتا تھا کہ یہ شاندار کارنامہ یقیناً اسی شخص کے ہاتھوں انجام پایا ہے۔ کیونکہ ایسی واردات کرنے کے لیے کسی بھی شخص کا سلیم باجوہ جتنا عقلمند اور بہادر ہونا ضروری تھا۔

○

بلے شاہ کبھی میں چنگاری پھینک کر بڑے آرام سے سیاستدانوں سے ملاقاتیں کر رہا تھا ـــــ!!

کھیل اُس کی مرضی کے عین مطابق کھیلا جا رہا تھا۔

اخبارات نے باقاعدہ مہم کا آغاز کر دیا تھا اور اب عوامی سطح پر خاصی بحث شروع ہو چکی تھی۔ کچھ لوگ اسے صحیح اور کچھ غلط قرار دے رہے تھے۔ یکایک حالات نے نیا موڑ بدلا اور اچانک مختلف طبقہ ہائے زندگی کے لیڈروں کی طرف سے یہ مطالبہ بڑے زور سے کیا جانے لگا کہ ملک کے اس سب سے بڑے اور حساس شہر میں اہم عہدوں پر تعینات تمام پولیس افسروں کے تبادلے کر دیئے جائیں کیونکہ گزشتہ تین چار ماہ سے جرائم کی رفتار میں حیران کن اضافہ ہو چکا تھا۔ اور پولیس صرف آئیں بائیں شائیں ہی کر رہی تھی عملاً اُس کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر تھی۔

بمشکل سات آٹھ روز کے بعد ہی اسمبلی کا جو آخری سیشن ہوا۔ اس میں اس حوالے سے حکومت اور اپوزیشن کے درمیان بڑی تُو تُو، مَیں مَیں ہوئی اور اپوزیشن کی طرف سے حکومت کی نیت پر حملے کیے گئے۔

اگلے روز جب اسمبلیاں ٹوٹیں اور غیر جانبدار الیکشن کا اعلان ہوا تو صوبے کے نئے گورنر نے پہلا حکم یہی جاری کیا کہ فوری طور پر شہر کے ڈی آئی جی، ایس ایس پی اور ایس پی حضرات کو تبدیل کر دیا جائے۔

سلیم باجوہ ایک مرتبہ پھر ستم ظریفی حالات کا شکار ہو کر افسر بکارِ خاص کی حیثیت سے مرکز کو اپنی آمد کی رپورٹ کر رہا تھا۔

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈرگ مافیا اپنے صحافتی ٹاؤٹوں کی مدد سے ایک مرتبہ پھر ایک ایماندار پولیس آفیسر کو میدان سے بھگانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اب میدان دوبارہ ایک مدت کے بعد بالے شاہ کے ہاتھ میں تھا۔

نئے آنے والے پولیس آفیسران کو اس بات کا احساس پہلے سے ہو گیا تھا کہ وہ میڈیا کو ناراض کرنے کا خطرہ، ہرگز مول نہیں لے سکتے۔ یوں بھی اس اہم شہر میں ایک مرتبہ آنے کے بعد یہاں سے واپس جانے کو کس کا دل چاہتا تھا۔

یار لوگ یہاں تبادلہ کروانے کے لیے ایوانِ اقتدار کی چولیں ہلا دیا کرتے تھے ـــــ اس طرح منہ میں آئے لڈو کو کون پھینکنا چاہتا ہے۔ انہوں نے بجائے ڈرگ مافیا کو ناراض کرنے کے فی الوقت اپنی کرسی مضبوط کرنا ضروری سمجھا جس کے لیے "میڈیا" سے خوشگوار تعلقات کا آغاز کر دیا گیا۔

○

طالب کمہار کی توقعات کے مطابق جس روز پولیس آفیسران کے تبادلوں کی خبریں شائع ہوئیں اُسی رات اُسے اقبال شاہ کی طرف سے ملاقات کا پیغام مل گیا۔

اس مرتبہ بھی ملاقات کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا ـــــ!

لیکن ـــــ

مقام تبدیل ہو چکا تھا۔

یہ ملاقات کسی ہوٹل کے بجائے شہر کی ایک متمول اور مخیر ہستی کے گھر پر ہو رہی تھی۔ عام حالات میں شاید زندگی بھر کبھی طالب کمہار جیسا موذی بھی نہ سوچ سکتا کہ یہ متمول اور مخیر ہستی اصل میں کیا ہے؟

وہ وقتِ مقررہ پر جب اس عالی شان بنگلے پر پہنچا تو بنگلے کے گیٹ پر موجود پہریدار کو اپنا منتظر پایا۔

اُس نے طالب کمہار کا نام سنتے ہی اُس کی گاڑی کے لیے دروازہ کھول دیا۔ سامنے برآمدے میں اقبال شاہ اس کے استقبال کے لیے خود موجود تھا۔

"واہ طالب صاحب آپ نے تو واقعی کمال کر دیا!"

اُس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"شاہ جی ایسے کئی ایس پی میں نے چٹکیوں میں اُڑا دیے۔ کیا مجال ہے اس شہر میں یا اس ملک میں بھی کوئی پولیس آفیسر ہماری مرضی کے خلاف ایک دن بھی نوکری کر سکے۔"

طالب کمہار نے گردن پھلائی۔

"ہمیں بھی ایسے ساتھیوں کی تلاش رہتی ہے ـــــ"

بالے شاہ نے اس کی انا کے غبارے میں مزید ہوا بھری۔

وہ اب طالب کمہار پر چھری چلانے کا مصمم ارادہ باندھ چکا تھا۔ واقعی جس شخص نے دو مرتبہ ایس پی باجوہ جیسے پولیس آفیسر کی اس شہر سے چھٹی کروا دی تھی وہ مستقبل میں ان کے لیے کوئی بھی مشکل کھڑی کر سکتا تھا ـــــ!!

اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ طالب کمہار ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہے ـــــ

بالے شاہ سے وہ رابطہ کر چکا تھا۔

عین ممکن تھا کہ وہ مستقبل میں بالے شاہ ہی کی چھٹی کروا دیتا۔ ایسے شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ بالے شاہ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے اس سانپ کا زہر نکال کر اسے کینچوا بنا دے تاکہ اس کے پاس ڈنگ مارنے کی طاقت ہی باقی نہ رہے۔

بالے شاہ نے معمول کے مطابق اس کمرے میں مشروبات منگوا لیے تھے۔ طالب کمہار کو پہلی مرتبہ اس سے کھل کر بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور وہ بڑھ چڑھ کر بالے شاہ کو اپنے کارنامے سنا رہا تھا کہ کس کس طرح اس نے کس کس سمگلر اور بدمعاش

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی مدد کی اور پولیس کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ جیسے جیسے وہ اپنے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ بالے شاہ کے دل میں اس کے لیے پہلے سے موجود نفرت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

طالب کمہار نے اپنی دانست میں اس ملاقات کے بعد بالے شاہ کو مکمل رام کر لیا تھا۔

لیکن ــــــ

حقیقت یہ تھی کہ اس نے اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی تھی۔

"طالب صاحب اب وقت آ گیا ہے کہ آپ ہمارے کاروبار میں سانجھ ڈال سکیں۔ تین روز بعد ہم ایک کھیپ بھیج رہے ہیں۔ آپ کے پچاس لاکھ آپ کو دو کروڑ روپے کی صورت اس کھیپ کی روانگی کے تین روز بعد دنیا کی کسی بھی کرنسی میں، کسی بھی ملک میں مل جائیں گے۔"

اُس نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

"تین روز ــــ شاہ جی کچھ وقت..."

"نہیں ــــ"

بالے شاہ نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

"اس بزنس میں وقت ہی دراصل سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے "میٹر" کرتی ہے تو وہ ہے "ٹائم" اور میں ہمیشہ بہترین وقت کا انتخاب کرتا ہوں۔"

طالب کمہار کے پاس ساری زندگی کی حرام کاریوں سے جمع کردہ پچیس تیس لاکھ روپیہ کیش کی صورت موجود تھا۔

لیکن ــــ

وہ اگر چاہتا تو پچاس لاکھ اکٹھا کر سکتا تھا۔ اس کے لیے اُسے اپنا گھر اور زیورات وغیرہ بھی فروخت کرنا پڑتے۔ وہ فوراً تیار ہو گیا۔ ایسا سنہری موقع پھر کب ہاتھ آنے

والا تھا۔ بالے شاہ اُسے رقم کی ادائیگی کے بہتر گھنٹے بعد ہی کروڑ پتی بنانے جا رہا تھا۔

اس نے سوچا کہ وہ اپنا سب کچھ بیچ کر داؤ پر لگا دے گا۔

"ٹھیک ہے شاہ جی ــــ"

بالآخر طالب کمہار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"آپ رقم کا بندوبست کر لیں۔ ملاقات کا وقت میں بتا دوں گا ــــ"

اقبال شاہ نے کہا۔

طالب کمہار تھوڑی دیر بعد مستقبل کے سنہرے سپنے بنتا اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا۔ بالے شاہ کا اس سے ملاقات کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کوئی ایسا سمگلر نہیں تھا جس سے ہر شخص آسانی سے مل سکتا۔

طالب کمہار تو اس کا پارٹنر بننے جا رہا تھا۔

○

طالب کمہار کے پاس وقت کم تھا۔

لیکن ــــ

وہ بالے شاہ کو اپنی کسی کمزوری کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ اس نے ہوس میں اندھے ہو کر نہ صرف اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی بلکہ اپنے گھر میں موجود تمام زیورات اور اپنی کوٹھی بھی گروی رکھ کر کسی نہ کسی طرح پچاس لاکھ روپے اکٹھے کر لیے تھے۔ بالے شاہ نے اُسے بتایا کہ اس بزنس میں رقم کا لین دین صرف کیش کی صورت میں ہوتا ہے۔

آج تیسرا دن تھا اور وہ رقم بڑے بریف کیس میں بند کر کے بالے شاہ کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔ اس مرتبہ اس کی توقعات کے عین مطابق صبح ہی بالے شاہ کا

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فون آگیا۔ اُس نے اس مرتبہ ملاقات کے لیے ایک سیرگاہ کا انتخاب کیا تھا۔

طالب کا جی تو چاہا کہ اُسے جگہ تبدیل کرنے کے لیے کہے۔

لیکن ـــــ

وہ خاموش رہا۔

طالب کمہار نہیں چاہتا تھا کہ اقبال شاہ کو کسی بھی لمحے ناراضی کا موقع ملے۔ اس نے سوچا کیونکہ اس بزنس میں وہ ابھی نو وارد ہے اور شاہ جی کی یہ مہربانی تھی کہ انہوں نے اس کی درخواست قبول کر لی تھی ورنہ تو اس ملک میں نجانے کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو اقبال شاہ کا پارٹنر بننے کے لیے ترستے ہوں۔ اس نے فوراً ہی بالے شاہ کی ہدایت پر عمل کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مقررہ کردہ وقت سے کچھ دیر پہلے ہی وہ سیرگاہ میں پہنچ گیا۔ اس نے جان بوجھ کر اپنی گاڑی پارکنگ میں ایک طرف کھڑی کی تھی اور اب گاڑی کے شیشے بند کیے اپنے بے چین اعصاب کو سکون دینے کے لیے سیٹ لمبی کر کے لیٹا ہوا تھا۔

ٹھیک پانچ بجے وہ اپنی کار سے باہر نکلا اور اس سیرگاہ میں موجود اس جگہ کی طرف چل دیا جہاں بالے شاہ نے اُسے بلایا تھا۔

اقبال شاہ کو اُس نے ایک کونے سے نکل کر اس طرف آتے دیکھا تو خود بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

ایک دوسرے سے سلام دعا اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد اقبال شاہ اُسے قدرے ویران کنج میں لے آیا۔

"طالب صاحب ـــــ چونکہ آپ اس بزنس میں نئے ہیں۔ اس لیے جگہ کے انتخاب پر پریشان نہ ہوں۔ ہمارے نزدیک اپنی حفاظت سے زیادہ آپ ایسے دوستوں کی حفاظت

ضروری ہوتی ہے کیونکہ اب آپ ہمارے سیٹ اپ کا حصہ بن چکے ہیں اور ہمارا فرض بنتا ہے کہ آپ کے لیے بہترین حفاظتی اقدامات بروئے کار لائیں۔"

بالے شاہ نے خود ہی وہ بات کہہ دی جو ابھی تک طالب کمہار کے دماغ میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس کی جہاندیدہ نظروں نے اپنے گرد و گرد کچھ خصوصی حرکات کا نوٹس لے لیا تھا لیکن بالے شاہ بھی بلا کا ماہر نفسیات تھا۔

"اپنے لوگ ہیں ـــــ میں نے کہا ناں کہ حفاظتی اقدامات سے ہم کبھی بے خبر نہیں رہتے۔"

دونوں کچھ دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اس درمیان بالے شاہ نے اُسے مستقبل کے اتنے سہانے خواب دکھا دیے تھے کہ اگلے ۲۴ گھنٹے طالب کمہار ان خوابوں کے سہارے آسانی سے گزار سکتا تھا۔

بالے شاہ نے تھوڑی دیر بعد اُسے رخصت کر دیا۔

وہ خود طالب کی کار کی مخالف سمت سے واپس جا رہا تھا۔ طالب کمہار نے آخری منظر یہی دیکھا تھا کہ ایک نوجوان نے بالے شاہ کے ہاتھ سے بریف کیس پکڑ لیا تھا۔ اور وہ بالے شاہ کی مخالف سمت تیسری طرف گھوم گیا تھا۔

ایک مرتبہ تو بریف کیس بالے شاہ کو تھماتے ہوئے طالب کمہار کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ اسے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر گرنے کے خدشات لاحق ہونے لگے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اُس نے خود کو نارمل کر لیا۔

اگر ایسی صرف ایک اور "ڈیل" ہو گئی تو وہ اپنا اخبار نکال سکتا تھا۔

اپنے دفتر واپس پہنچ کر بھی وہ کافی دیر تک اسی نشے میں سرشار رہا۔

اگلے تین چار روز اُس نے بڑی بے چینی سے خواب آور گولیوں کی مدد سے گزارے۔ اب اس کی رقم کے کئی گناہ بڑھ جانے کا وقت آگیا تھا اور وہ بڑی

ون اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے چینی سے اقبال شاہ کے فون کا منتظر تھا۔ اقبال شاہ نے اُسے اپنا صرف ایک نمبر دیا ہوا تھا جو کسی دفتر کا ٹیلی فون نمبر تھا۔

لیکن ——

طالب کمار کو بہرحال اس شہر میں اس کے دو بنگلوں کا علم تھا۔

ان تین چار دنوں میں اس نے اپنے اخبار کے مختلف ایڈیشنوں میں اقبال شاہ سے متعلق ایسے ایسے حیران کن انکشافات شروع کیے کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ جسے لوگ بین الاقوامی سمگلر سمجھتے ہیں وہ دراصل ایک مخیّر اور انتہائی درد دل رکھنے والا شریف شہری ہے جس نے اصولوں کی بنیاد پر پولیس کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور اس سے متعلق پراپیگنڈہ بے بنیاد اور جھوٹا ہے

طالب کمار نے اقبال کا ایک جعلی انٹرویو شائع کر کے قارئین کو یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ اقبال شاہ نے باقاعدہ سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے وہ شاید اسمبلی کے انتخابات میں تو حصہ نہ لے البتہ سینٹ کی سیٹ پر اس کی نظر ضرور ہے۔

اخبار کے دیرینہ قارئین نے اخبار کے مالک کی توجہ اس صریحاً صحافتی بد دیانتی کی طرف دلانے کے لیے بے شمار خطوط لکھے۔

لیکن ——

طالب کمار کے اخبار میں موجود "مانیا" نے ایسے تمام خطوط مالک کے بجائے اس کی میز پر پہنچا دیے تھے۔ اخبار کے مالک کو دیگر ذرائع سے اس ضمن میں جو کچھ سننے کو ملا اس کی بھی اس نے کوئی پرواہ نہ کی کیونکہ اُس کے پاس ایسی باتیں سُننے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ طالب کمار نے اُسے ایک دوسرے پر چسکا لگا دیا تھا۔

وہ صبح سے رات گئے تک مختلف تقریبات میں اتنا مصروف ہوتا تھا کہ اُسے اخبار کی کوئی فکر ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ یہ سارے معاملات اس نے طالب کمار پہ

چھوڑ رکھے تھے۔ جس نے کئی مرتبہ مالک صاحب سے بڑی مکاری سے کہا تھا کہ اس کے "نازک کندھے" اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔

لیکن ——

مالک صاحب نے اسے بھی طالب کمار کی انکساری سمجھا تھا۔

طالب کمار نے انہیں پہلے ہی دن سے اس چکر میں پھنسا رکھا تھا کہ دنیا میں اس کا سب سے بڑا ہمدرد وہ ہی ہے اس لیے اس کی مخالفت "قدرتی" بات ہو گی۔ اس نے اپنی ملازمت میں کوئی دن ایسا نہیں جانے دیا جب وہ اپنے مالک کے لیے رطب اللسان نہ ہوا ہو اُس نے اپنے کسی ہمکار کی چغلی نہ کھائی ہو۔

اس کی یہ دونوں عادتیں مالک صاحب کے دل کو بہت بھاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے تازہ کارنامے" کا بھی انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

⊙

طالب کمار کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی ——!

آج ساتواں دن ہونے کو آ رہا تھا اور ابھی تک بالے شاہ کا نام ونشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے لاکھوں روپے قرض اٹھا کر اپنا گھر اور مال اسباب گروی رکھ کے بالے شاہ کو پچاس لاکھ روپے ادا کیے تھے۔ اس کا تو دل ہی بیٹھا جا رہا تھا۔

اس صورتِ حال سے تنگ آ کر اُس نے اپنے پاس موجود واحد نمبر گھمایا۔ دوسری طرف سے اُسے بتایا گیا کہ یہ نمبر گزشتہ پندرہ روز سے بند ہو چکا ہے، کیونکہ بل ادا نہیں کیا گیا تھا۔

طالب کمار کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

اردو ڈاٹ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شام تک اُس نے جیسے تیسے خود پر جبر کیا اور شام کے بعد اقبال شاہ کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

لیکن ——

یہاں انتہائی پریشان کن صورتِ حال تھی۔

کوٹھی کے باہر کسی جسٹس صاحب کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ چوکیدار نے بتایا کہ اس کے مالک نے یہ کوٹھی حال ہی میں کرائے پر حاصل کی ہے۔ طالب کمہار کو یوں لگا جیسے اُسے کسی بھی لمحے ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔

دیوانہ وار گاڑی اُس نے اقبال شاہ کے دوسرے ٹھکانے کی طرف دوڑائی جہاں کوئی کرنل صاحب براجمان تھے۔ انہوں نے بھی یہ کوٹھی حال ہی میں کرائے پر لی تھی۔ جب طالب کمہار نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اُن سے اُلٹے سیدھے سوالات کرنے چاہے تو ریٹائرڈ کرنل صاحب کا دماغ گھوم گیا۔ انہوں نے طالب کمہار کو انگریزی لغت میں موجود تمام گالیوں سے نوازنا شروع کیا اور اپنے چوکیدار کو حکم دیا کہ اگر وہ فوراً یہاں سے نہ جائے تو اسے گولی مار دے۔

اس صورتِ حال نے اُسے حواس باختہ کر دیا تھا۔

طالب کمہار کے لیے گاڑی ڈرائیو کرنا اذیت ناک مسئلہ بن چکا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے گھر تک پہنچا اور بے سدھ ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا تھا کہ اگر وہ اپنی حالت پر کنٹرول نہ کرتا تو اس کے دماغ کی شریانیں ہی پھٹ جاتیں۔

ساری رات وہ گولیاں پھانکتا رہا۔

اب اُمید کی ایک ہی کرن باقی تھی اور وہ تھے اس کے دیرینہ دوست ایم این اے میاں صاحب جو اس کی اطلاعات کے مطابق اقبال شاہ کے

بزنس پارٹنر تھے۔

شاید اُسے یہاں سے اُمید کی کوئی کرن دکھائی دے جائے۔ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ گزشتہ تین سال سے اُس نے میاں صاحب کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا اور اصولی طور پر اُسے میاں صاحب کو اپنی مدد کے لیے پکارنے کا کوئی اخلاقی جواز ہی نہیں بنتا تھا۔

لیکن ——

اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

شرم، حیا اور غیرت نام کی اگر کوئی بیماری اُسے لاحق ہوتی تو آج وہ اس مقام تک پہنچ ہی نہ پاتا۔ اس نے زندگی میں جو کچھ بھی حاصل کیا تھا اپنے ضمیر سمیت ان تینوں کو داؤ پر لگا کر حاصل کیا تھا۔

بالے شاہ کا اس طرح پُراسرار طور پر غائب ہو جانا اُسے پاگل کیے دے رہا تھا۔ اُس نے ابھی تک بڑی ہمت سے اپنے اعصاب پر قابو رکھا تھا۔

علی الصباح وہ اُٹھ کر ایک ٹیکسی کے ذریعے میاں صاحب کے گھر جا پہنچا۔

"ہوں ں ں —— تو آخر چڑیا پنجرے میں پھنس ہی گیا ——"

میاں نے اس کی آمد کی اطلاع پر زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا حکم ہے جناب ——"

پیغام لانے والے نے دریافت کیا۔

"اسے کم از کم آدھا گھنٹہ برآمدے میں بٹھا کر میرے پاس لے آؤ ——"

میاں نے زہریلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

"میاں صاحب باتھ روم میں ہیں۔ آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

پیغام بر نے طالب کمہار کو برآمدے میں رکھی لوہے کی بغیر گدی والی کرسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے انہیں میرا نام بتایا ہے ناں۔"

طالب نے تصدیق کرنے کے انداز میں دریافت کیا۔

"سر جی ـــــ میں وہاں کوئی جھک مارنے تو نہیں گیا تھا۔ آپ کا نام ہی بتلانے گیا تھا۔"

نوکروں کو بھی اپنے مالک کے موڈ کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

پیغام بر نے بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کا مالک اس شخص کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تو پھر وہ کیوں پیچھے رہتا۔ عام حالات میں کوئی طالب کمہار سے اس لہجے میں بات کرتا تو وہ اس کی زبان ہی گدی سے الگ کروا دیتا۔

لیکن ـــــ

یہاں وہ مجبور اور بے بس تھا۔

وہ نوکر کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتا کرسی پہ بیٹھ گیا۔

○

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میاں صاحب نے اُسے شرفِ ملاقات بخشا۔

"آ بھئی طالبے ـــــ تو کدھر راستہ بھول گیا ـــــ"

میاں کا لہجہ ہی اس کے جذبات کا غماز تھا۔

لیکن ـــــ

ان حالات میں طالب کمہار گالیاں کھانے کے لیے بھی تیار تھا۔

"میاں صاحب آپ کے سارے گلے شکوے درست لیکن ہم بہرحال پرانے یار ہیں ـــــ اور آپ جانتے ہیں انتخابات کا اعلان ہو چکا ہے۔ ایسے موقع پر میں ہی سب سے زیادہ آپ کے کام آ سکوں گا۔"

طالب نے بڑی چاپلوسی سے کہا۔

"اگر تم مجھے یہاں صرف اپنی اہمیت بتلانے آئے ہو تو جائیے اور اپنا راستہ ناپو ـــــ مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم جیسے کئی صحافی میری جوتیاں چاٹنے کے لیے بے تاب پھرتے ہیں۔ پہلے تعلق کی جہاں تک بات ہے اس سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن تم میں چونکہ شرم نام کی کوئی چیز نہیں ورنہ کبھی اس کا حوالہ نہ دیتے کیونکہ تم ایسے سانپ ہو جس نے اپنے ہر دودھ پلانے والے کو ڈنگ مارا ہے۔"

میاں کے منہ سے یہ بات نکلنے کی دیر تھی کہ طالب کمہار پیشہ ور فقیروں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میاں صاحب میں برباد ہو گیا ہوں۔ میں لٹ گیا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بچا لیجئے۔"

اُس نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"حیرت ہے۔ تم تو آج تک لوگوں کو لوٹتے اور برباد کرتے آ رہے ہو تمہیں کس نے لوٹ لیا۔"

میاں نے بڑے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔

"میاں جی۔ مجھے میرے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ میرا کچھ باقی نہیں بچا۔ خدا کے لیے....."

اس مرتبہ اس نے باقاعدہ میاں کے پاؤں پکڑ لیے۔

ایک آدھ منٹ تو میاں صاحب اس کی ذلت اور بے بسی کا نشہ لیتے رہے۔ جس کے بعد انہوں نے اسے قریباً ڈانٹتے ہوئے اپنے قدموں سے الگ کیا اور طالب کمہار ایک سہمے ہوئے بچے کی طرح اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے جلدی مطلب کی بات کرو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میاں نے اُسے درشت لہجہ میں کہا۔

طالب کمہار نے بچوں کی طرح سسکیاں بھرتے ہوئے اپنی رام کہانی سنائی اور بتایا کہ ہوس نے اُسے اندھا کر دیا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی جمع پونجی بلکہ لاکھوں روپے قرض اُٹھا کر یہ جوا کھیلا تھا اور اب بالے شاہ غائب ہو چکا ہے۔

"میں تمہاری کل شاہ صاحب سے ملاقات کروا دوں گا۔ اس مرحلے پر سوائے اس کے میں تمہاری اور کچھ مدد نہیں کر سکتا۔"

میاں صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میاں صاحب میری مدد کریں۔ میرے بچے مر جائیں گے۔"

طالب کمہار نے فقیروں کی طرح میاں صاحب کی منتیں شروع کر دیں۔

"دیکھو طالبے۔ تم ایک بے شرم اور انتہائی بے غیرت انسان ہو۔ جسے اپنی عزتِ نفس کا بھی احساس نہیں۔ جب کہ میرا معاملہ مختلف ہے۔ اگر تم نے دوبارہ اس قسم کی بات کی تو میں تمہیں جوتے مار کر یہاں سے نکال دوں گا۔ اُلو کے پٹھے تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ کوئی شخص بالے شاہ سے اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ تم نے مجھ سے پوچھ کر یہ حرام کاری کی تھی جو اب میں اسے کہوں۔ میں خدا خوفی کر کے صرف تمہیں اُن سے ملا سکتا ہوں۔ وہ بھی سید بادشاہ کا کرم سمجھنا کہ اگر وہ میرے کہنے پر تم سے مل لے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

میاں نے اُسے دھتکارتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔"

طالب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

میاں نے اُسے اگلے روز صبح کا وقت دیا تھا۔ طالب کمہار ٹیکسی میں بیٹھ کر دوبارہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کی ذہنی حالت اس قابل نہیں تھی کہ اپنے دفتر ہی

جا سکتا۔

وہ دن اور رات بھی اُس نے جنونی کیفیت میں دوائیوں کے سہارے کاٹے۔ اس کی دوسری بیوی نے طالب کو اس حال میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اُسے تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ اس کے گھر کا سیف خالی ہو چکا ہے۔ وہ تو آج صبح اُس نے کچھ پیسے نکالنے کے لیے جب سیف کھولا تو خالی ڈبے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

اس کا تو دماغ ہی گھوم گیا۔

"یہ زیور اور پیسے کہاں گئے ——"

اُس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں طالب کمہار سے دریافت کیا۔ جس کا رویہ گزشتہ پانچ چھ روز ہی سے بڑا مشکوک تھا۔

"آ جائیں گے ——"

طالب نے بے نیازی دکھائی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا —— کہاں لے گئے ہو میرے زیور۔ اور جیولری"۔

اُس نے تنک کر پوچھا۔

"تم کیا اپنے باپ کے گھر سے لائی تھیں —— زیور اور جیولری۔"

طالب نے اُسے غصے سے چڑتے ہوئے کہا۔

"تم بتاؤ گے نہیں۔"

اس نے دوبارہ کھا جانے والے لہجے میں پوچھا۔

"دفع ہو جاؤ ——"

طالب کمہار نے اُسے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔

وہ بھی کوئی شریف زادی نہیں تھی۔ نہ ہی کسی گاؤں سے بیاہ کر لائی گئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اگر اس نے شام تک اس کی جیولری اور زیورات نہ لوٹائے تو وہ نہ صرف اپنے بدمعاش بھائیوں سے کہہ کر اُس کی ہڈی پسلی ایک کروا دے گی بلکہ اُس کے خلاف تھانے میں چوری کا پرچہ بھی درج کروا دے گی۔ کیونکہ یہ جیولری اور زیورات اس نے نکاح نامے میں اپنی دوسری بیوی کے نام لکھے تھے۔"

طالب کمہار اُس کی بک بک سے بچنے کے لیے گھر سے باہر آ گیا۔ دوپہر تک کا وقت اُس نے ایک تفریح گاہ میں گھاس پر لیٹ کر گزارا اور مقررہ وقت پر رکشہ لے کر میاں صاحب کے گھر جا پہنچا۔ اُس کے لیے ایک ایک قدم من من کا بوجھل ہو رہا تھا۔ میاں صاحب نے کمال مہربانی سے اُسے اندر بلا لیا۔

لیکن ——

اندر کا منظر ہی اُسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔

سامنے ایک صوفے پر نیلم کیانی اور اقبال شاہ بیٹھے تھے جبکہ دوسرے صوفے پر زہراں اور میاں صاحب موجود تھے۔

"آؤ —— آؤ بیٹھ جاؤ —— شاہ صاحب نے مہربانی کی ہے میری درخواست پر آ گئے ہیں۔ کر لو بات ——"

میاں صاحب نے اس کو عجیب سے لہجے میں کہا۔

ہاں —— ہاں کر لو بات ——"

یہ زہراں تھی۔

جیسے قدرت نے آج دس سال بعد طالب کمہار کی بات پر ہنسنے اور طنز کرنے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔

"کیا بات ہے طالب یار۔ تم تو بڑی جلدی میں دکھائی دیتے ہو۔ کیا کام ہے"۔

کو زمین آسمان گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔

"شاہ جی وہ میری رقم ——"

اس کے منہ سے بمشکل یہ فقرہ ادا ہوا۔

"اوہ —— وہ تمہارے پچاس لاکھ۔ وہ تو ڈوب گئے۔ مال پکڑا گیا یار تم بڑے منحوس آدمی ہو ——"

اقبال شاہ نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہا تھا شاہ جی یہ بڑا نحس ہے۔"

اس مرتبہ کیانی کی باری آئی۔

طالب کمہار کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔

"اب تم پچاس لاکھ کا بندوبست کرو —— تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے ——"

اقبال شاہ نے اُسے چڑایا۔

"میں تمہیں برباد کر دوں گا اقبال شاہ —— تم مجھے نہیں جانتے۔"

پاگلوں کی طرح طالب کمہار نے بے قابو ہو کر کہا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے پوری قوت سے اس کے دل پر گھونسا مار دیا ہو۔

"میں تمہیں جانتا ہوں —— تم ڈرگ مافیا کے آدمی ہو۔ یہ دیکھو۔"

یہ کہتے ہوئے اقبال شاہ نے ایک تصویر اُس کی طرف بڑھا دی جس میں وہ اقبال شاہ کو بریف کیس تھما رہا تھا۔ یہ تصویر ابھی تفریح گاہ میں اُتاری گئی تھی۔ اور کسی اخبار کے ایڈیٹر کی اقبال شاہ کے ساتھ ایسی تصویر کا مطلب اُس کے کیریئر کی تباہی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"امید ہے تمہارا دماغ قدرے درست ہوگیا ہوگا ——— اس تصویر کو انلارج کر کے اپنے کمرے میں رکھ لینا ——— اور وہاں تم اپنے مالک کو جتنا چاہے بے وقوف بنالو ——— لیکن اس تصویر کو دیکھنے کے بعد وہ تمہیں ہرگز نوکری پر نہیں رکھے گا۔"

بلّے شاہ نے اُسے ناصح کے انداز میں سمجھایا۔

"اور کیا ——— بنا پھرتا تھا صحافی ———"

زہراں نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں مار ڈالوں گا ——— میرے پچاس لاکھ روپے ———"

طالب کمہار پر جنون طاری ہوگیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر بلّے شاہ کی طرف بڑھنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑا۔

"پاگل ہوگیا ہے سالا۔ باہر پھینکواؤ اسے۔"

بلّے شاہ نے میاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جو حکم سیّد بادشاہ ———"

میاں صاحب نے اطاعت گزاری۔

○

طالب کمہار کو پولیس والوں نے پکڑ کر پاگل خانے پہنچایا تھا۔

وہ پولیس کو شہر کی سب سے معروف شاہراہ پر جنونی حالت میں گھومتا ہوا ملا تھا۔ بہت سے لوگوں نے پہچان کر اُسے پکڑنا چاہا لیکن وہ کسی کے قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

اُس نے کہیں سے ایک ڈنڈا اٹھا لیا تھا اور وہاں موجود کئی کاروں کے شیشے توڑنے کے علاوہ تین چار راہگیروں کے سر بھی پھاڑ دیے تھے۔

وہ چیخ چیخ کر "میرے پچاس لاکھ دو" کی تکرار کر رہا تھا اور اپنے سامنے

آنے والے ہر شخص پر حملہ آور ہو رہا تھا۔

ایک جانی پہچانی شخصیت ہونے کے سبب پہلے کچھ نوجوانوں نے اُسے اُٹھا کر ہسپتال پہنچایا۔ جہاں ڈاکٹروں نے اس کی ذہنی حالت نارمل کرنے کے لیے بڑا زور لگایا۔ طرح طرح کے انجکشن دیے۔

لیکن ———

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

وہ ہوش میں آتے ہی اپنے پچاس لاکھ مانگنے شروع کر دیتا۔ اس دوران اُس نے دو تین نرسوں اور وارڈ بوائز پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر تنگ آ کر ہسپتال والوں نے پولیس کی مدد سے اُسے پاگل خانے پہنچا دیا تھا۔

پاگل خانے کا بڑا ڈاکٹر اُسے اس لیے پہچانتا تھا کہ جب وہ "چھوٹا ڈاکٹر" تھا تو اُس نے طالب کمہار کو دو تین مرتبہ اچھی خاصی ادائیگی کے بعد اپنے رنگین انٹرویو شائع کروائے تھے۔ ان انٹرویوز کی مہربانی سے وہ "بڑا ڈاکٹر" بن گیا تھا۔

اس نے کھلی باہوں سے اپنے محسن کا استقبال کیا اور اُسے بے ہوشی کا انجکشن لگا کر پاگلوں کی کوٹھڑی میں بند کر کے اخبار کے مالک صاحب کو جو اس کے بڑے مہربان تھے فون کر کے "بے چارے طالب کمہار" کی خبر دی۔

"ڈاکٹر صاحب کچھ اصلاح کا امکان ہے۔"

"نو سر ——— ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا ——— کوئی زبردست ذہنی دھچکا لگا ہے۔ بڑا سخت دورہ پڑا ہے پاگل پن کا ——— ابھی تو اس مرض کو سمجھنے میں بھی کئی دن لگ جائیں گے۔"

ون اردو ڈاٹ کام

Scanned by iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر نے انکساری سے صحیح صورتِ حال بتا دی۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب"۔ مالک صاحب نے فون بند کر کے آصف رشید کو طلب کر لیا۔

"آصف صاحب معاملات کیسے جا رہے ہیں؟" انہوں نے طالب کے نائب کو ٹٹولا۔

"سر — انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے طالب صاحب۔ معمولی سا دورہ پڑا ہے۔" اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"لیکن مجھ پر ابھی معمولی دورہ نہیں پڑا آصف صاحب۔ میں پاگلوں کو اتنے اہم حساس کام کے لیے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے گھنٹی بجا کر اپنے چیف اکاؤنٹنٹ کو طلب کیا۔

"کریمی صاحب — دو تنخواہیں اُس کی پہلی بیوی کے نام بھیج کر طالب کی چھٹی کروا دیں۔ میں کسی سکینڈل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے مختصر حکم دیا۔

"او کے سر۔"

چیف اکاؤنٹنٹ کریمی نے تعظیم دی اور واپس چلا گیا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ اپنا کام کریں۔ میں دیکھتا ہوں کیا کرنا چاہیے۔"

اُس نے آصف رشید کو بھی اُٹھ جانے کا سگنل دے دیا۔

○

یہ انتخابات بڑے پُرامن تھے۔

اس مرتبہ نتائج میاں صاحب کی توقعات کے عین مطابق برآمد ہوئے تھے۔

نئی حکومت نے ان کی سیاسی خدمات کے اعتراف میں انہیں وزیر سماجی بہبود بنا دیا تھا۔

الیکشن کے بمشکل تین ماہ بعد ہی سینٹ کے انتخابات میں میاں صاحب کی خصوصی سفارش پر سید اقبال شاہ صاحب کو سینٹ کا ٹکٹ جاری ہوا۔

شاہ صاحب بڑی اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔

نئی حکومت نے اپنی ترجیحات میں ملک سے کرپشن اور ڈرگ کے خاتمے کو اولین اہمیت دی تھی کیونکہ اس مسئلے پر بین الاقوامی سطح پر ملک و قوم کی بڑی بدنامی ہو رہی تھی۔

وزیرِاعظم نے ڈرگ کے خاتمے کے لیے ممتاز پارلیمنٹیرین پر مشتمل جو کمیٹی بنائی تھی اس میں صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے علاوہ سینٹ کے ممبران بھی شامل تھے۔ اس بیس رکنی کمیٹی کا سربراہ سینیٹر سید اقبال شاہ کو بنایا گیا تھا۔

آج شاہ صاحب ایک اہم سیمینار کی صدارت کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ تین روزہ سیمینار ڈرگ کے خاتمے کے سلسلے میں حکومتی اقدامات کا بھی شاخسانہ تھا۔

اس تقریب کے مہمان خصوصی اخبار کے "مالک صاحب" تھے جبکہ اُن کے ساتھ دوسری نشست پر وزیر سماجی بہبود جناب میاں صاحب تشریف فرما تھے۔

معزز مہمان تشریف لا چکے تھے۔ اب صدرِ مجلس کا انتظار تھا۔ اُن کی آمد کا اعلان ٹریفک سارجنٹ کی موٹر سائیکل کے ہارن نے کیا اور ہال کے دروازے پر موجود پولیس کے جوان اپنے ایس پی صاحب کی کمان میں مستعد ہو گئے۔

شاہ صاحب نے کار سے قدم باہر نکالا تو دو ننھے بچوں نے انہیں پھولوں کے گلدستے پیش کیے۔ جب شاہ صاحب بچوں کے گالوں کو بوسے دے کر کھڑے ہوئے تو تقریب کی شرکا معزز بیگمات اور ان کی صاحبزادیوں نے ان کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا۔

شاہ صاحب ہار اپنے سیکرٹری کو پکڑاتے جا رہے تھے۔ وہ عوامی لیڈروں کی طرح وہاں موجود ہر شخص سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

بڑے وقار سے قدم بڑھاتے وہ پولیس دستے کے انچارج ایس پی صاحب کی طرف ... ھے اور بے تکلفی سے ان سے ہاتھ ملایا۔

Scanned by iqbalmt
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا حال ہیں باجوہ صاحب ــــ بھئی بہت تعریف سنی تھی آپ کی۔"
انہوں نے ایس پی سلیم باجوہ کی، جس نے پرسوں ہی اپنے عہدے کا چارج لیا خیریت دریافت کی۔

"تھینک یو سر ــــ!"
سلیم باجوہ نے اپنا ہاتھ سلیوٹ کے انداز میں اُٹھا کر اُن کا شکریہ ادا کیا۔
اس سیمینار میں شاہ صاحب نے ملک سے منشیات کے خاتمے کے لیے اس تقریب میں موجود ایس پی سلیم باجوہ کی بطورِ خاص تعریف کی اور کہا تھا کہ وہ باجوہ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُس کو اگلے عہدے پر ترقی کی سفارش کریں گے۔

اور ــــ

ایسا ہی ہوا ــــ
ایک ہفتے بعد ایک اور تقریب میں جس کے مہمانِ خصوصی شاہ صاحب ہی تھے ایس پی سلیم باجوہ کے سینے پر میڈل سجاتے ہوئے آئی جی صاحب نے سینٹر اقبال شاہ اور پریس کی موجودگی میں سلیم باجوہ کو ایس ایس پی کے عہدے پر ترقی دینے کا اعلان تالیوں کی گونج میں کر دیا۔
فوٹو گرافروں کے کیمرے چمکے اور مسکراتے ایس ایس پی باجوہ صاحب کی تصاویر ان کے سولائیڈ کے فیتوں پر منتقل ہونے لگیں۔
اگلے روز اخبارات کے صفحہ اوّل پر باجوہ اور سینٹر اقبال شاہ صاحب کی ایک دوسرے کے ساتھ گرمجوشی سے ہاتھ ملانے کی تصاویر بڑے نمایاں انداز میں شائع ہوئی تھیں۔

طارق اسمٰعیل ساگر
۸۴۔راوی روڈ۔لاہور

ون اردو ڈاٹ کام